



مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

اور
انکی علمی خدمات

از
ڈاکٹر محمد صہیب

ماہنامہ

مولانا رشید احمد الاعظمی

مدیر



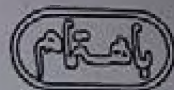
مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مرقاة العلوم، مئو

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

اور
انکی علمی خدمات

از

ڈاکٹر محمد صہیب



مولانا رشید احمد الاعظمی

مدیر



مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مرقاة العلوم، مسو

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اور ان کی علمی خدمات	:	نام کتاب
ڈاکٹر محمد صہیب	:	ترتیب
۵۲۳	:	صفحات
۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء	:	سن اشاعت
گیارہ سو	:	طبع اول
المجمع العلمی - مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ	:	ناشر
	:	قیمت
مولانا رشید احمد الاعظمی	:	باہتمام

ملنے کا پتہ

مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ
مرقاۃ العلوم - پوسٹ بکس نمبر (۱)
مئو ناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱ (یو پی - انڈیا)

طباعت: شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی

فہرست مضامین

۱۱	مولانا رشید احمد الاعظمی	عرض ناشر:
۱۳	ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی	دیباچہ:
۱۷	پروفیسر شمس تبریز خان	مقدمہ:
۲۵	مولانا سعید الرحمن الاعظمی ندوی	پیش لفظ:
۲۹	مولانا ریاست علی بجنوری	تعارف:
۳۸	ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی	حرفے چند:
۴۵	مرتب	تمہید:
		باب اول
۵۱	ہندوستان بیسویں صدی کے اوائل میں	
		باب دوم
۷۱	سوانح حیات	
۷۱	ولادت اور نام و نسب	
۷۲	تعلیم و تربیت	
۷۶	اساتذہ	
۸۲	تعلیمی و تدریسی سرگرمیاں	
۸۵	تلامذہ	

بیعت و سلوک

۸۶

سیاسی و سماجی سرگرمیاں

۸۷

اسفار

۹۱

وفات

۹۱

باب سوم

مختلف علوم و فنون سے متعلق خدمات

۹۴

تفسیر

۹۴

التنقید السیدی علی التفسیر الجدید

۹۵

نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے

۱۰۲

حدیث

۱۰۸

الحاوی لرجال الطحاوی

۱۰۹

مندیہ الامعی فی مافات من تخریج احادیث الہدایۃ للریطعی

۱۱۵

کتاب الثقات

۱۱۸

انتقاء الترغیب والترہیب

۱۲۲

رسالة الاوائل

۱۲۸

مسند حمیدی

۱۳۰

کتاب الزہد والرقائق

۱۴۸

سنن سعید بن منصور

۱۵۵

مجمع بحار الانوار

۱۶۴

مصنف عبد الرزاق

۱۷۲

المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ

۱۸۷

- ۱۹۳ فتح المغیث بشرح الفیہ الحدیث
- ۱۹۶ تلخیص خواتم جامع الاصول
- ۲۰۱ کشف الاستار عن زوائد البزار علی الکتب الستہ
- ۲۰۷ مصنف ابن ابی شیبہ
- ۲۱۶ حیاة الصحابہ
- ۲۱۸ استدراکات
- ۲۱۹ شرح مسند امام احمد بن حنبل
- ۲۲۷ الالبانی شذوذہ وأخطاؤہ
- ۲۳۱ الرفع والتکمیل
- ۲۳۸ تحفۃ الاحوذی
- ۲۴۱ اسماء الرجال
- ۲۴۸ نصرۃ الحدیث
- ۲۵۲ طبقات ابن سعد اور اعتراف حقیقت
- ۲۵۴ مقدمہ معارف الحدیث
- ۲۵۵ مزید خدمت حدیث
- ۲۵۶ اجازت حدیث حاصل کرنے والے مشاہیر عرب
- ۲۵۷ فقہ
- ۲۵۹ الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ
- ۲۶۷ الازہار المربوعہ فی رد الآثار الممتبوعہ
- ۲۷۰ احکام النذر لا ولیاء اللہ وتفسیر ما ابل بہ لغیر اللہ
- ۲۷۴ رکعات تراویح

۲۷۷	رکعات تراویح مکمل	۲۷۷
۲۷۹	رہبر حجاج	۲۷۹
۲۸۰	ہیمہ اور اس کا شرعی حکم	۲۸۰
۲۸۳	دارالاسلام اور دارالحرب	۲۸۳
۲۸۸	فقہی انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کی دعوت	۲۸۸
۲۹۱	انساب و کفایت کی شرعی حیثیت	۲۹۱
۲۹۹	حدرالمشام عن وجہ تحقیق الکلام	۲۹۹
۳۰۲	فتاویٰ	۳۰۲
۳۰۵	فقہی مضامین و مقالات	۳۰۵
۳۰۷	مناظرہ	۳۰۷
۳۰۸	رد شیعیت	۳۰۸
۳۰۹	دفع المجادلہ عن آیۃ المباحلہ	۳۰۹
۳۱۳	تنبیہ الکاذبین بجواب تنبیہ الناصبین	۳۱۳
۳۱۷	ارشاد الثقلین	۳۱۷
۳۲۰	ابطال عزاداری	۳۲۰
۳۲۶	تعدیل رجال بخاری	۳۲۶
۳۳۱	رد اہل حدیث	۳۳۱
۳۳۳	السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث	۳۳۳
۳۳۸	الروض الجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود	۳۳۸
۳۴۰	حنفیہ کرام اور اہل تبارع حدیث	۳۴۰
۳۴۴	تحقیق اہل حدیث	۳۴۴

- ۳۳۷ دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب
- ۳۵۱ مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت
- ۳۵۲ مثالب ابی حنیفہ کی تنقید
- ۳۵۳ احمدیوں کی ذلت و خواری پر محمدیوں کی بیقراری
- ۳۵۴ قادیانی مرتد کی سنگساری مولوی ثناء اللہ کی غمگساری
- ۳۵۵ مضامین و مقالات (غیر مقلدیت کے رد میں)
- ۳۵۷ رد بریلویت
- ۳۵۸ شارع حقیقی
- ۳۶۱ تاریخ و تذکرہ
- ۳۶۲ اہل دل کی دلاویز باتیں
- ۳۶۳ اعیان الحجاج
- ۳۶۷ دستکار اہل شرف
- ۳۷۲ مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟
- ۳۷۴ الذخائر و التحف کس کی تصنیف ہے؟
- ۳۷۷ سید مرتضیٰ زبیدی ہندوستانی تھے
- ۳۸۱ مضامین و مقالات (تاریخ و تذکرہ سے متعلق)
- ۳۸۳ ادب
- ۳۸۳ عربی نثر
- ۴۰۱ عربی نظم
- ۴۰۳ غزلیں
- ۴۱۰ مرثی

۲۲۱	اردو نثر
۲۲۲	اردو نظم
۲۲۵	غزلیں
۲۳۱	مرثیہ و قطعہ تارخ
۲۳۳	نعتیہ کلام
۲۳۱	فارسی نثر
۲۳۶	فارسی نظم
۲۳۶	نعت شریف
۲۳۶	قطعہ تارخ

باب چہارم متفرقات

۲۲۹	حسن ادب اور اس کی اہمیت
۲۵۰	اسرار المحبۃ
۲۵۲	تکمیل الاذہان
۲۵۵	فیض الحق ملقب بہ دمع الباطل
۲۵۷	عظمت صحابہ
۲۵۹	رشحات قلم
۲۶۰	

باب پنجم

۲۶۵	مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں
۲۶۹	شیخ احمد محمد شاہ
۲۷۰	شیخ عبدالفتاح ابو غدہ

- ۴۷۱ شیخ زاہد الکوثری
- ۴۷۲ ڈاکٹر عبد الحلیم محمود، سابق شیخ الازہر
- ۴۷۳ شیخ محمود محمد شاہ
- ۴۷۴ شیخ ناصر الدین الالبانی
- ۴۷۴ شیخ علوی بن عباس مالکی
- ۴۷۵ شیخ عبد اللہ زمزی مکی
- ۴۷۸ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز
- ۴۷۹ شیخ سید یوسف ہاشم الرفاعی
- ۴۸۰ شیخ شعیب الارناؤوط
- ۴۸۱ شیخ عابد الفلکی الشہری
- ۴۸۲ ڈاکٹر محمود طحان
- ۴۸۳ شیخ محمد عوامہ، مدینہ منورہ
- ۴۸۳ خیر رمضان یوسف
- ۴۸۴ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
- ۴۸۵ مولانا عبد الغفار عراقی
- ۴۸۶ علامہ انور شاہ کشمیری
- ۴۸۷ علامہ شبیر احمد عثمانی
- ۴۸۸ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی
- ۴۸۹ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی
- ۴۹۰ مولانا یوسف بنوری
- ۴۹۱ مولانا ابوالوفاء افغانی

- ۴۹۱ مولانا عبدالشکور فاروقی
- ۴۹۲ علامہ سید سلیمان ندوی
- ۴۹۳ مولانا مناظر احسن گیلانی
- ۴۹۴ مولانا عبدالماجد دریابادی
- ۴۹۵ مولانا سعید احمد اکبر آبادی
- ۴۹۷ علامہ اقبال سہیل
- ۴۹۷ مولانا عامر عثمانی
- ۴۹۸ مولانا عتیق الرحمن عثمانی
- ۴۹۸ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
- ۵۰۰ مولانا محمد منظور نعمانی
- ۵۰۱ ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرساوی
- ۵۰۴ قاضی اطہر مبارکپوری
- ۵۰۴ عالی جناب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ
- ۵۰۴ پروفیسر عبدالرحمن مومن، بمبئی یونیورسٹی
- ۵۰۵ پروفیسر محمد اجتباب ندوی
- ۵۰۵ پروفیسر شمس تبریز خان، لکھنؤ یونیورسٹی
- ۵۰۶ شمس الرحمن فاروقی
- ۵۰۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد! میرے لیے نہایت مسرت و انبساط کا وقت ہے کہ حضرت والد مرحوم محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی قدس سرہ کے حالات زندگی اور علمی کارناموں پر مشتمل یہ کتاب معرض اشاعت میں آرہی ہے، میں خداوند قدوس کے انعام و اکرام اور اس کے فضل و احسان پر خلوص قلب کے ساتھ سجدہ شکر بجالاتا ہوں، کہ اس ذات بے نیاز نے ایک مختصر سی مدت میں حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات پر یہ دوسری اہم دستاویزی کتاب شائع کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔

آج سے تقریباً چھ سال قبل میرے خواہر زادہ عزیز ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ اللہ نے ”حیات ابوالمآثر“ کے نام سے حضرت علیہ الرحمۃ کے واقعات زندگی پر سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب مرتب کی تھی، اس کتاب کو علمی اور عوامی دونوں حلقوں میں اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ ایک قلیل مدت میں اس کے نسخے خاصی تعداد میں قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گئے، اور اب اس کا پہلا ایڈیشن ختم کے قریب ہے، اور یہ ناچیز اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے متعلق غور کر رہا تھا، کہ حضرت والد صاحب کی حیات پر یہ دوسری کتاب تیار ہوگئی، اس لیے مجھے خیال اور فکر ہوا کہ یہ کتاب بھی مطبوعہ صورت میں اہل علم و نظر کے ہاتھوں تک پہنچ جائے، تاکہ اہل ذوق

حضرات کو اس دور کے ایک عظیم اور بلند رتبہ انسان کی سوانح حیات کو ایک نئے انداز اور نئے اسلوب کے ساتھ دیکھنے اور پڑھنے کا موقع میسر ہو سکے۔

”حیات ابوالمآثر“ میں اس کے مرتب و مصنف نے حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو ان کی تمام جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی تھی، جو مرتب کتاب کو دستیاب ہو سکی تھیں، لیکن انھوں نے علمی کارناموں پر تفصیلی گفتگو کو نظر انداز کر کے ان کی طرف صرف اشارے پر اکتفا کیا تھا، پیش نظر کتاب میں اس کے مصنف نے زندگی کے عام حالات پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈال کر حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں اور ان کی تصنیفی و تحقیقی خدمات پر زیادہ توجہ صرف کی ہے، اور ان کی تصنیفات و تحقیقات اور دیگر علمی خدمات کا بہت سلیقے سے تعارف کرا کے حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں کو موثر انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

یہ کتاب برادر عزیز ڈاکٹر محمد صہیب سلمہ، کاپی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس کو انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے مقتدر اور صاحب علم و بصیرت استاذ جناب مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خان صاحب کی زیر نگرانی تیار کر کے، ادب عربی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے، میں اپنی اور ادارے کی طرف سے عزیزم ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد پیش کر کے، ان کے لیے روشن مستقبل اور علمی و دینی ترقی کے لیے دعا اور تمنا کرتا ہوں۔ اور جس محنت، لگن اور دلچسپی کے ساتھ انھوں نے اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس کو دیکھ کر میں امید کرتا ہوں کہ وہ علم و تحقیق کی دنیا میں ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ ترقی کریں گے، آمین!

رشید احمد الاعظمی

خادم مرقاة العلوم، مئو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

الحمد لأهله والصلوة على أئمه.

کبھی کسی کتاب میں عربی زبان کا ایک جملہ پڑھا تھا کہ من صار بالعلم
حیاً لم یمت أبداً۔ جو شخص علم کی وجہ سے زندہ ہو جائے وہ کبھی مرتا نہیں ہے، علم کی
دولت حاصل ہونے کے بعد آدمی زندہ جاوید ہو جاتا ہے، آغوش قبر میں پہنچ کر بھی اس
کے اوپر موت نہیں طاری ہوتی، عالم ناسوت سے اس کا رشتہ اگرچہ منقطع ہو جاتا ہے،
لیکن دنیا اس کو اور اس کی خدمات اور کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کرتی، عالم کے اس
عالم فانی سے چلے جانے کے بعد بھی لوگوں کے قلب و دماغ پر اس کے علم و فضل کا سکہ
جمار ہوتا ہے، تاریخ و تراجم سے دلچسپی رکھنے والے اور تذکرہ نویسی کا شوق اور مشغلہ
رکھنے والے اہل علم و تصنیف اس کی زندگی کے گوشوں اور پہلوؤں اور حیات مبارک
کے مقدس اور پاکیزہ لمحات کو قید تحریر میں لا کر بعد میں آنے والوں کے لئے منارۂ نور
تعمیر کرتے ہیں، تاکہ اس کی روشنی میں بعد کی نسلیں اپنی زندگی کا سفر طے کریں۔ اگر
نگاہ حقیقت شناس سے دیکھا جائے تو اس بساط ارضی پر اشرف المخلوقات کی کتنی بڑی
تعداد معرض وجود میں آتی ہے، اور اپنی مدت کار پوری کر کے سفر آخرت پر روانہ
ہو جاتی ہے، لیکن تاریخ کا قلم ان ہی افراد کی زندگیوں کو محفوظ رکھتا ہے، جنہوں نے علم

فن کی کوئی خدمت کی ہوتی ہے، یا انسانیت کی فلاح و اصلاح کے لئے کوئی یادگار کارنامہ انجام دیا ہوتا ہے۔

علم حدیث کے سرخیل، تاریخ و تذکرہ کے امام، فقہ و تفسیر کے یکتا، ادب و لغت کے نابغہ، میدان تحقیق کے شہسوار، بحر معرفت کے غواص اور شناور، عبقری زمانہ ابوالہماثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ ان ہی یکتائے روزگار افراد میں ہیں، جو اپنی کوہ پیکر علمی شخصیت اور علم و فن کی عظیم الشان اور ناقابل فراموش خدمات کی وجہ سے رہتی دنیا تک یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔ علوم اسلامیہ کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے، جس پر ان کی نگاہ نہ رہی ہو، یا وہ ان کی جولان گاہ نہ رہا ہو، اور اس میں ان کے کمال و مہارت کا جو ہر نہ کھلا ہو۔

علامہ اعظمیؒ کی ذات گرامی اس دور کے مسلمانوں کے لئے قدرت کا بیش قیمت عطیہ تھی، جن کے لئے علوم اسلامیہ و دینیہ کے دروازے وا کر دیئے گئے تھے، ان کے اوپر ان کے خالق نے اسلامی احکام و تعلیمات کی شرح و تفسیر کے خزانے کھول دیئے تھے، اس دور میں ان کے ذریعہ نہ صرف عامۃ المسلمین بلکہ اہل علم کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دلایا گیا ہے، مشکل سے مشکل بحشیں اور دقیق سے دقیق مسائل کی اپنے ناخن گرہ کشا سے عقدہ کشائی کرنا ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی، جن مسائل و مشکلات میں بڑے بڑے شناوروں اور ماہرین فن کا دل و دماغ الجھ کر رہ جاتا تھا، علامہ اعظمیؒ اپنی خداداد صلاحیت، نور علم، اور فراست ایمانی سے بیک جنبش قلم ان کو سلجھانے کی قدرت رکھتے تھے، ان کی تصنیفات و تالیفات کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ کیسے کیسے معرکہ الآراء مسائل کو کس خوبی اور عمدگی کے ساتھ انھوں نے حوالہ قلم کر کے امت کے سامنے راہِ عمل کو آسان اور واضح کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی پرورش خالص دینی ماحول میں ہوئی تھی، اور پاکیزہ علمی فضا

میں وہ پروان چڑھے تھے، لیکن علم کی جس رفعت و بلندی تک وہ پہنچے تھے، اس میں زیادہ حصہ ان کی ذاتی کوششوں، شبانہ روز محنتوں اور طلب علم کے لئے آبلہ پانیوں اور صحرا نوردیوں کا تھا، دنیا اور متاع دنیا نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن وہ اس سے اعراض کرتے رہے، جاہ و منصب نے ان کے قدموں کو روکنا چاہا لیکن وہ اس سے گریزاں رہے اور اس کی طرف نظر التفات کرنا بھی اپنی شان استغناء کے منافی سمجھا۔

دنیا نے سبز باغ دکھائے بہت مگر

وہ اپنی راہ پر ہی سدا گامزن رہا

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ جیسی باکمال ہستی اس صفحہ ہستی پر کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے، ایسی شخصیت جس نے یکہ و تنہا وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں، جن کو ایک اکیڈمی بھی اپنے وسائل و ذرائع کے باوجود بمشکل انجام دے سکتی ہو، جس نے اپنی خطابت سے عوام و خواص کے دلوں پر سحر طاری کیا ہو، اپنی تصنیفات و تالیفات سے بڑے بڑے اہل علم کے قلوب کو متاثر کیا ہو، اور اپنے تحقیقی جواہر پاروں سے میدان بحث و تحقیق کے شہسواروں کی نگاہوں کو خیرہ کیا ہو۔

ایسی شخصیت کی حیات و خدمات کو بحث و تحقیق یا تصنیف و تالیف کا موضوع بنانا کوئی معمولی اور سہل کام نہیں ہے۔ ان کے علمی کارناموں کے تفصیلی تعارف کے لئے ایک ضخیم جلد اور خاصا وقت درکار ہے، سردست برادر گرامی جناب محمد صہیب صاحب نے حضرت علامہ اعظمیؒ کے علمی کارناموں کو اپنے ریسرچ کا عنوان بنا کر اس پر جو مقالہ تیار کیا ہے، وہ بہت قابل قدر اور لائق ستائش ہے، انھوں نے اپنے اس مقالے میں علامہ اعظمیؒ کی علمی خدمات کا جو تعارف پیش کیا ہے، وہ اختصار کے باوجود ہمہ جہت حیثیت کا حامل ہے، صہیب صاحب مقالہ لکھنے سے پہلے ہی سے

راقم الحروف کے مسلسل رابطے میں رہے ہیں۔ وہ دھن کے پکے اور لگن کے سچے ہیں، علامہ اعظمی کی زندگی کے بیشتر گوشوں اور بہت سے علمی و تحقیقی کارناموں پر راقم سے تبادلہ خیال اور گفتگو کرتے رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑی ہی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ انھوں نے اس مقالے کو تیار کیا ہے۔ تین سال کے قیمتی لمحات اس کی ترتیب میں صرف کئے ہیں، بلکہ ان کی محنت اور کد و کاوش پر بارہا میں نے رشک کیا ہے، خدا سے دعا ہے کہ ان کی محنت کو شرف قبول عطا فرمائے اور اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نافع بنائے۔ آمین!

مسعود احمد الاعظمی

۲۴ رذی الحجہ ۱۴۲۷ھ

۱۶ جنوری ۲۰۰۷ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

پروفیسر شمس تبریز خان

شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم
النبيين وعلى آله وصحبه وعلى من اتبعهم الى يوم الدين.

بلاد عربیہ کے بعد اسلام، علوم اسلامیہ اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے
ہندوستان کا جو دیرینہ، گہرا اور ہمہ گیر تعلق رہا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے، جس کی
شروعات حضرت آدمؑ کے ورود ہند سے ہوتی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث
شریف سے اس تعلق کی تجدید ہوتی ہے کہ مجھے مشرق کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آتی
محسوس ہوتی ہے، اور وہ متعدد احادیث اور آثار بھی اس تعلق کو مضبوط بناتے ہیں جنہیں
مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ) نے سبحة المرجان کے شروع میں درج کیا
ہے۔

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد گویا وطنِ ثانی میں اقامت کی طرح
تھی جہاں کی مہمان نوازیوں اور دل داریوں نے وطنِ اول کو بھی بڑی حد تک فراموش
کرادیا، اسلام کے شجر طیب نے اس زرخیز زمین میں بہت جلد اپنی جڑیں جمالیں اور
برگ و بار لانے لگا اور یہ ملک اسلامی تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت اور علوم و فنون کا

دکاش گہوارہ بن گیا اور یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کی کوئی ایسی شاخ باقی نہیں رہی کہ
نودمیدہ و نورسیدہ غنچہ و گل سے محروم رہ گئی ہو۔

بہار آئے اور اس طرح سے بہار آئے کہ گل تو گل ہی ہیں خاروں پر بھی نکھار آئے
ویسے تو علوم اسلامیہ کی ہر شاخ میں ہندوستانی علماء نے اپنی ذہانت
و قنات، دانائی و طباعی اور جدت و عبقریت کے نمونے پیش کیے ہیں خصوصاً حدیث
وفقہ اور تفسیر و کلام کے میدانوں میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں لیکن حدیث نبوی
سے ان کا تعلق عشق کی حد تک پہنچ گیا ہے اور انھوں نے شروع سے آج تک حدیث
نبوی سے اپنے قلبی و ذہنی، طبعی و جذباتی تعلق کے جس طرح مظاہرے کیے ہیں ان کی
مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے حدیث شریف کی خدمت کے انھیں ایسے مواقع
ملے جو عالم اسلام میں کسی اور کو نہیں ملے اور انھیں اس سلسلے میں اولیت و افضلیت کی
سعادت حاصل ہوئی، مثلاً حضرت ربیع بن صبیح تبع تابعی اور سندھی الاصل تھے، بصرہ
میں قیام تھا، انھوں نے حسن بصری، ابن سیرین اور ثابت بنانی وغیرہ جیسے اکابر سے
روایت کی اور ان سے دیکھ، اور ابوداؤد و طیالسی وغیرہ نے روایت کی نیز ان کے اساتذہ
میں مجاہد، یزید قاشی، حمید الطویل اور ان کے تلامذہ میں ابن المبارک اور سفیان ثوری
کے نام بھی آتے ہیں ان کا شمار حدیث کے اولین مصنفین میں بھی ہے، انھوں نے
۱۶ھ میں بھاڑ بھوت (گجرات) خلیفہ مہدی کی فرستادہ فوج کے ساتھ شرکت کی اور
وہیں ایک بیماری میں انتقال کیا۔

ایسی ہی اولیت دوسرے ہندوستانی الاصل محدث ابو معشر نجیح بن عبد الرحمن
السندی (م ۷۰ھ) کو حاصل ہے جو تابعی بھی ہیں اور سیر و مغازی کے اولین مصنفین
میں بھی ہیں ان کے اساتذہ میں سعید بن المسیب، محمد بن کعب القرظی، حضرت باقر،
ابن المنکدر، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ جیسے شیوخ تھے، اور تلامذہ میں سفیان

ثوری، عبدالرزاق صاحب المصنف، وکیع بن الجراح، لیث بن سعد، اور واقدی جیسے مشاہیر تھے۔

عہد سلطنت میں حدیث شریف کی نمایاں خدمت کی سعادت علامہ رضی الدین حسن بن محمد الصغائی (م ۶۵۰ھ) کو بھی حاصل ہوئی جو لاہور سے جا کر بغداد میں مقیم ہو گئے تھے، ان کی لغت العباب الزاخر اور ابن سیدہ کی الحکم کو جمع کر کے مجد الدین فیروز آبادی نے مشہور عربی لغت القاموس تیار کی تھی۔

انھیں صحیح بخاری کے موجودہ متن کی تحقیق و تدوین کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور اپنے رسالہ الموضوعات میں تحقیق روایت اور درایت کے عملی نمونے بھی پیش کیے اور صحیح احادیث کی ترویج و اشاعت کے لیے ”مشارق الانوار“ کے نام سے صحیحین کا انتخاب عوامل نحو یہ کی ترتیب کے مطابق کیا اور یہ مجموعہ اجادیث ایسا مقبول و مروج ہوا جس کی بہت کم مثال ملتی ہے، ان کے شاگردوں میں عرب کے ساتھ افریقہ اور اندلس کے لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں اور اس کے سیکڑوں حاشیے اور شرحیں لکھی گئیں اور ہندوستان میں تو وہ صدیوں تک حدیث کے نصاب درس میں شامل رہی ہے۔

علامہ سیوطی نے جمع الجوامع میں صحاح ستہ اور چند اور حدیثی مجموعوں کو جمع کر کے احادیث صحیحہ کا ایک دائرۃ المعارف مرتب کر دیا تھا، شیخ علی متقی برہان پوری (م ۹۷۵ھ) نے اسے نئی ترتیب دے کر اس سے استفادہ کو آسان بنا دیا جو کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے حدیث کے حلقوں میں مقبول ہوا، اس کی اہمیت کے اعتراف میں علامہ شوکانی نے بجا طور پر یہ کہا تھا کہ:

للسیوطی منۃ علی العالمین وللمتقی منۃ علیہ، (سیوطی کا احسان دنیا پر ہے اور علی متقی کا احسان خود ان پر ہے)

اسی طرح ان کے شاگرد شیخ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) اپنی کتابوں المغنی

فی ضبط الرجال، اور تذکرۃ الموضوعات کے لیے مشہور ہیں لیکن ان کا بڑا کارنامہ حدیث و قرآن مجید کی مشہور و مقبول لغت مجمع بحار الانوار ہے جو ابن الاثیر کی النہایۃ سے زیادہ جامع ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) حدیث کی عظیم درسی و تحریری خدمات کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، ہندوستان میں صحیحین اور مشکوٰۃ کے درس کے رواج میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، الاکمال کے علاوہ شرح سفر السعاده اور لمعات و اشعة اللمعات حدیث کی بہترین شرحیں ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) نے حجة الله البالغة کے ذریعے حدیث کے اسرار و حکم کے بیان اور اس کے فہم و درایت کا ایک نیا باب کھولا جس نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا ہے اسی کے ساتھ مسوی و مصفی کے ذریعے فقہی مذاہب میں تطبیق کا اچھا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے نامور تلمیذ علامہ سید محمد مرتضی زبیدی بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) نے قاہرہ میں اپنا حلقہ درس قائم کر کے علامہ صفائی و شیخ علی متقی کی طرح ایک بار پھر ہندوستانی علماء و محدثین کے امتیاز و اعزاز کو دوبالا کر دیا ان کی عقود الجواهر المنیفة، اتحاف السادة المتقین اور تاج العروس کی افادیت کا سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۵ھ) اور شیخ الہند مولانا محمود حسن (م ۱۳۳۹ھ) نے تصنیف سے زیادہ تدریس اور تعلیم و تربیت اور مردم سازی پر توجہ کی اور دارالعلوم دیوبند کی شکل میں فقہ و حدیث کا ایک عالمی مرکز قائم کر دیا، جس نے علوم اسلامیہ کے ایسے ماہرین پیدا کیے، جن کی وجہ سے عالم اسلام میں ہندوستان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے ممتاز محدثین میں علامہ انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) کی فیض

الہادی شرح صحیح بخاری اور العرف الشذی شرح سنن الترمذی، مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح المسلمین شرح صحیح مسلم، مولانا فخر احمد تھانوی کی اعلیٰ السنن، مولانا یوسف بنوری کی معارف السنن، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصحیح، مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی بذل المجہود، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی لامع الدراری اور أوجز المسالك شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے درسی افادات، معارف مدنیہ مرتبہ مولانا سید طاہر حسن صاحب امروہی اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کے درسی افادات، ایضاً البخاری مرتبہ مولانا ریاست علی بجنوری اور علامہ انور شاہ کشمیری کے درسی افادات، انوار الہادی مرتبہ مولانا احمد رضا بجنوری حدیث کے حلقوں میں بڑی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔

فقہ وقت و محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (م ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) علماء و محدثین ہند کے اسی چودہ سو برسوں کے سلسلۃ الذہب کی مضبوط و قیمتی کڑی تھے، جنہوں نے علمائے راسخین و فضلاء محققین کے علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کی شاندار دیرینہ روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے آگے بڑھایا اور حدیث و سنت کے مدفون و مجہول ذخائر کو حیات نو بخشی اور اس کے فیض سے خود بھی بقائے دوام کے مستحق ہو گئے۔

مولانا اعظمی کی تحقیقات و دراسات کی افادیت کے گونا گوں پہلو ہیں ان کا سب سے بڑا فائدہ توفیق و شریعت کے لیے سنت و سیرت کی تائید حاصل کرنا ہے، اور مختلف نزاعی مسائل میں سیرت و سنت نبویہ کی تحقیق و دریافت ہے، اس کے علاوہ حدیث کے ان اولیں صحیفوں سے مسلک حنفی کی تائید و توثیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی اشاعت مستشرقین کے اس اعتراف کا جواب بھی ہے کہ حدیث کے مجموعے بہت بعد میں مرتب ہوئے، ان کا طرز تحقیق و تدوین مشرق و مغرب کے محققین کے لیے

تلاش حقیقت و حق پسندی، خلوص و بے غرضی، اور انتہائی محنت و محویت اور مقصد سے
 عشق کا بے مثال اور قابل تقلید اسوہ و نمونہ ہے۔
 خار ہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
 منتے بر قدمِ راہ روان است مرا

مولانا الاعظمیؒ کی علمی فتوحات میں ”رکعات تراویح“ کو بہت اہمیت حاصل
 ہے، جو اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ان
 استدراکات و تصحیحات کی بہت اہمیت تسلیم کی گئی اور عالم عربی کے اعلیٰ درجے کے
 محققین نے اپنی غلطیاں تسلیم کیں اور حضرت مولاناؒ کے اعتراضات و تنبیہات کو صحیح
 قرار دیا ایسے استدراکات میں مولانا عبد الرحمن مبارکپوری کی تحفة الاحوذی، قاج
 العروس للزبیدی، مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی الرفع والتکمیل اور الأجوبة
 الفاضلة بتحقیق الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ، احمد محمد شاہ (م ۱۳۷۷ھ) کی
 تحقیق مسند احمد، اور الألبانی شذوذہ و أخطاؤہ، سے متعلق ان کے استدراکات
 علمی تنقید و تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

الاعلام المرفوعہ اور حدر المثلث عن وجہ تحقیق الکلام کے ذریعہ طلاق ثلاثہ اور
 قرأت خلف الامام کے حنفی مسلک کو احادیث نبویہ سے بخوبی مدلل کیا ہے۔ مولانا
 الاعظمیؒ کی رجال و تاریخ، فقہ و حدیث، لغت و ادب عربی میں مہارت و بصیرت اور
 دقت نظر کا ثبوت ان کی تحقیق و تدوین اور تحشیہ و تعلیق کے ذریعہ شائع شدہ گراں قدر
 کتابیں ہیں جن کو انھوں نے ایک طرح سے نئی زندگی بخشی اور علمی دنیا میں ان کا کما
 حقہ تعارف کرایا ایسی کتابوں میں ان کا نام لیا جاتا ہے، الحواوی، الشفقات لابن
 شاہین (م ۳۸۵ھ) مسند الحمیدی (م ۲۱۹ھ) السنن لسعید بن
 منصور الخراسانی (م ۲۲۷ھ) مجمع بحار الانوار للفتنی (م ۹۸۶ھ)

المصنف لعبد الرزاق (م ۲۱۱ھ) المطالب العالیہ بزوائد المسانید،
 الثمانية لابن حجر (م ۸۵۲ھ) کشف الاستار عن زوائد البزار
 للہیثمی (م ۸۰۷ھ) مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ)
 ان کتابوں کے علاوہ مولانا عظیمی نے شیعہ، اہل بدعت اور اہل حدیث کے
 مسلک و موقف پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے جو حقیقت پسندی، غیر جانبداری، اور
 علمی طرز تنقید و تحقیق کا مثالی نمونہ ہیں اور رسالہ ”الماثر“ مکو کے ذریعے برابر شائع ہو
 رہے ہیں۔

حضرت مولانا عظیمی کے علمی و تحقیقی مقام و مرتبہ کا عرب و عجم میں جس طرح
 اعتراف کیا گیا وہ ان کے لیے بھی باعث شرف و سعادت ہے اور جماعت دیوبند کے
 لیے بھی، حضرت مولانا کی علمی خدمات و فتوحات اب ان کے لیے ذخیرہ آخرت ہیں
 اور ہم سب کے لیے درس عبرت و بصیرت اور لائق تقلید اسوہ و نمونہ ہیں۔
 حضرت مولانا عظیمی کی ناقابل فراموش و گراں قدر علمی و تحقیقی خدمات کا یہ
 تقاضا تھا کہ ان کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ لیا جائے ان کے موضوعات کی اہمیت اجاگر کی
 جائے اور ان کے غیر جانبدارانہ اور معروضی اسلوب نقد و تحقیق کے محاسن کی نشاندہی کی
 جائے اور ان کی تمام کتابوں اور مضامین کے تذکرے کے ساتھ ان پر حقیقت پسندانہ
 اور بصیرت افروز تبصرہ بھی کیا جائے۔

اس سلسلے میں عزیزی ڈاکٹر محمد حبیب الہ آبادی سلمہ ہم سب کے شکریے
 اور قدردانی کے پوری طرح مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی حد تک حضرت مولانا حبیب
 الرحمن عظیمی کی حیات و خدمات پر علمی و تحقیقی تبصرے کا حق ادا کر دیا، اور مولانا کی علمی
 فتوحات و تحقیقات کا اس طرح تحلیل و تجزیہ کیا جس سے ان کی قدر و قیمت اور افادیت
 اجاگر ہو گئی، مولانا کی ہر کتاب و مضمون پر تبصرہ ان کے مقالے کی خصوصیت ہے جس

میں انھوں نے بڑے اعتدال و توازن، حقیقت پسندی اور علمی طرز استدلال سے کام لیا ہے۔ اپنے موضوع سے انھوں نے بڑی محنت اور سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ انصاف کیا ہے، ان کے طرز بیان میں بھی ایجاز و اختصار، بے تکلفی و بر جستگی اور سادگی کے ساتھ شگفتگی موجود ہے۔

اپنی کتاب کی تیاری کے سلسلے میں وہ بار بار حضرت مولانا کے ادارہ ”مرقاۃ العلوم“ منو گئے اور صاحبزادہ محترم جناب مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ اور جناب ڈاکٹر مسعود احمد صاحب مدیر مجلہ ”الماثر“ کے تعاون و سرپرستی میں اپنی تحقیق مکمل کی، اس طرح کتاب کو مولانا کے جانشینوں کا استناد و اعتماد بھی حاصل ہے چنانچہ وہ اس کی اشاعت کا ہتمام بھی کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ عزیز محترم مولانا ڈاکٹر محمد صہیب سلمہ کو دین و علم کی خدمت کی مزید توفیق عطا کرے اور ترقیات سے نوازے اور کتاب کو مقبولیت بخشے۔

شمس تبریز خاں

۵ جمادی الآخرہ ۱۴۲۷ھ

۲ جولائی ۲۰۰۶ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب الاعظمی ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بیسویں صدی عیسوی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کے ایک گمنام گوشے میں علم حدیث اور علوم اسلامیہ کے بحرِ خار کی شناساوری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک تاریخی شخصیت کو پیدا کیا، اس گمنام گوشے کو جو علم کے ساتھ صنعت و تجارت میں بھی اپنا مقام رکھتا تھا، اس ملک کی مشرقی سمت میں قصبہ منو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، اسی تاریخی قصبہ میں علم حدیث کا ایک روشن چراغ نمودار ہوا، اور جلد ہی وہ ایک آفتابِ عالم تاب کی شکل اختیار کر گیا۔

یہ علامۃ العصر محدث دوراں اور علوم اسلامیہ میں یکتائے روزگار حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (نور اللہ مرقدہ) کی شخصیت ہے، محدثِ جلیل نہ صرف حدیث و تفسیر میں ایک بلند مقام رکھتے تھے، بلکہ فقہ اسلامی اور علم الرجال میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے، اگرچہ انھوں نے اپنے وطن میں رہ کر ایک طرح سے گمنامی کی زندگی کو پسند کیا لیکن اس آفتاب کی روشنی سے نہ صرف ہندوستان کے علمی حلقے اور حدیث و فقہ کے مراکز فیض یاب ہوئے، بلکہ بیرون ملک میں آپ کی علمی بصیرت و تبحر اور عظمت شان کی روشنی بھی پہونچی، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کی تحقیقی

نظر اور محدثانہ منزلت اور تفقہ فی الدین سے سارا عالم واقف ہوا، صرف عالم اسلامی کی تقریباً ۳۰ شخصیات نے آپ سے اجازت فی الحدیث کی سند حاصل کی، ان میں شیخ عبدالفتاح ابو غندہ بلاد شام کے محدث کبیر، اور جامع ازہر کے شیخ ڈاکٹر عبدالخلیم محمود شامل ہیں، اسی کے ساتھ ہندوستان کی علمی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی کہ دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم علمی مرکز کے ذمہ دار حضرات نے حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے دیوبند کے شعبہ افتاء کی صدارت اور پھر منصب شیخ الحدیث قبول کرنے پر اصرار فرمایا، ان بزرگوں میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم پیش پیش تھے، اسی مقصد کے ماتحت انہوں نے منو کا سفر کیا اور محدث اعظمی سے ملاقات کی، لیکن علامہ اعظمی نے اپنے علمی اور تحقیقی انہماک کی وجہ سے اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر فرمائی۔

علامہ اعظمی کی علمی اور تحقیقی خدمات اہل علم و نظر سے مخفی نہیں ہیں اور تاریخ کے صفحات پر نقش دوام بن کر ثبت ہیں، یہی وجہ تھی ہندو بیرون ہند کے بے شمار علمی حلقوں اور متعدد تحقیقی اداروں سے ان کے نہایت مربیانہ اور سرپرستانہ تعلقات تھے، وہ علمی مسائل اور نقطہ ہائے نظر میں اہل حدیث علماء سے شدید اختلاف کے باوجود ان کے علمی مقام کا اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے تھے، انہوں نے شیخ الحدیث علامہ عبدالرحمن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی، جلیل القدر عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری اور اپنے معاصر عالم و محقق شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی صاحب مرعۃ المفاتیح اور دیگر علماء و محدثین کی علمی اور دینی خدمات کو سراہنے اور ان کا اعتراف کرنے میں کبھی کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور قائدین سے ان کے گہرے تعلقات تھے،

ان میں سرفہرست مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات عالی صفات ہے، علامہ اعظمی کا ان سے مستر شدانہ تعلق تھا، لیکن حضرت تھانویؒ مختلف دینی و شرعی معاملات میں ان سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے، اسی طرح بہت سے علمی مراکز اور اداروں کی سرپرستی فرماتے تھے، اور یہ ادارے اس پر بجا طور پر فخر کرتے تھے، امت مسلمہ کی اصلاح کے ساتھ تبلیغ و دعوت کو ساتھ لے کر چلنے کی راہ میں ہر سطح پر کوشش کرتے تھے، ملک کے علماء کرام ان سے جملہ معاملات میں مشورے کرتے تھے، اور جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہوتا تو لوگ آپ سے رجوع کرتے اور اس کا صحیح جواب حاصل کرتے تھے۔

علامہ اعظمی ایک عظیم محدث ہونے کے ساتھ ایک بے مثال علمی بصیرت اور تفقہ فی الدین کی دولت سے مالا مال تھے، اور کسی لمحہ بھی وہ اتباع سنت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی فکر سے جدا نہیں ہوئے، اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شیخ ازہر نے ان سے علمی استفادہ کی غرض سے اپنی خواہش کا ظہار کیا اور جامع ازہر میں کچھ وقت گزارنے کی درخواست کی، لیکن علامہ اعظمی نے بعد شکر یہ معذرت کر دی، اور آخر کار انھوں نے آپ سے حدیث کی سند حاصل کر کے آپ کو اپنا ایک جلیل القدر استاذ تسلیم کیا۔

علامہ اعظمی کے علمی اور محدثانہ کارناموں کی تفصیل راقم الحروف نے بزبان عربی ایک رسالہ کی شکل میں ترتیب دیا ہے اس پر ایک عرصہ گزر گیا ہے، مگر ابھی تک وہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا، ممکن ہے مستقبل قریب میں وہ شام کے کسی دارالنشر سے طبع ہو جائے اس رسالہ میں علامہ اعظمی کے علمی اور محدثانہ مقام کو بیان کرنے کے ساتھ ان کی ادبی بلندی اور عربی شاعری میں ایک طبع زاد شاعر کی حیثیت سے ان کے شعری نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

پیش نظر کتاب لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے

لیے جناب محمد صہیب صاحب ریسرچ اسکالرنے ڈاکٹر شمس تبریز صاحب پروفیسر شعبہ عربی کی نگرانی میں لکھی ہے اور علامہ اعظمی کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ اس سے قبل علامہ کے نواسے جناب ڈاکٹر مسعود صاحب نے علامہ کی سوانح حیات پر ایک گرانقدر کتاب ”حیات ابوالہماثر“ کے نام سے تالیف کر کے شائع کیا ہے اور وہ مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں اس کتاب کے مؤلف کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ اس موضوع پر مزید تحقیقی انداز میں کچھ لکھنے کی کوشش کریں گے تاکہ ہندوستان کے سوانحی کتب خانہ میں اس کے ذریعہ کوئی اچھا اور وقیع اضافہ ہو سکے۔ واللہ الموفق للصواب۔

راقم الحروف

سعید الرحمن الاعظمی، مدیر مجلہ البعث الاسلامی

ندوة العلماء لکھنؤ

۱۰ شعبان ۱۴۲۷ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تعارف

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری
استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند

عصر حاضر میں علمی تحقیق کی اختصاصی ڈگری (پی۔ ایچ۔ ڈی) کے لئے کسی خاص موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا نہایت مفید طریقہ رائج ہے، اس کے لیے بعض اوقات اہم علمی شخصیات کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اگر مقالہ نگار علمی دیانت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عرق ریزی سے کام لے تو متعلقہ شخصیت پر نہایت مفصل، جامع اور مواد سے بھرپور ایسی کتاب وجود میں آ جاتی ہے جو اس شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے اور دوسروں کے لیے ایک مفید دستاویز کا کام دیتی ہے۔

اس وقت ایک ایسی ہی کتاب پیش نظر ہے جو محترم مولانا محمد صہیب صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ کی حیات و خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ حضرت محدث کبیر کا نام، اقلیم علم و فن کے تاجداروں میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے وہ درحقیقت علماء کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جن کا امتیاز علوم و فنون کی جامعیت ہوتی ہے، لیکن ان کا اختصاصی میدان علم حدیث اور اسماء الرجال تھا، اور وہ ہندوستان میں خدمت حدیث کی تابناک روایت کی ایک روشن کڑی تھے۔

ہندوستان میں صہبائے مدینہ کے میخواروں اور خدمت گزاروں کی پاکیزہ روایت شیخ علی متقی، شیخ محمد بن طاہر بیہقی، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ہوتی ہوئی مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ذریعہ نہایت جامعیت کے ساتھ آگے بڑھی اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے اولاد و احفاد اور سلسلہ تلامذہ کے واسطے سے علماء دیوبند اس کے حامل و امین قرار پائے، جنہوں نے اس امانت کو قریہ قریہ پہنچا کر گھر گھر کو اس کے نور سے منور کر دیا، خاص طور پر حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا ظلیل احمد محدث سہارنپوری، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری وغیرہ حضرات کے ذریعہ حدیث نبوی کی وہ خدمت ہوئی کہ قرون ماضیہ کی یاد تازہ ہو گئی اور شاعر کو کہنا پڑا۔

ساقی دہلی کے مستوں نے باض دیوبند جب رکھی بنیاد میخانہ بطور یادگار دور دورہ ساغر صہبائے طیبہ کا ہوا جرحہ نشان ازل آئے قطار اندر قطار قاسم و محمود و انور نے لٹدھائے خم کے خم اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار اور انہی خدمات کے آثار و مظاہر کو دیکھ کر مصر کے صاحب نظر عالم اور باخبر مبصر علامہ سید رشید رضا مرحوم علماء ہند کی بلند پایہ خدمت حدیث کے اعتراف پر مجبور ہوئے اور ان کا قلم اس اعتراف حقیقت پر مجبور ہوا کہ اگر ان قرون اخیرہ میں علماء ہند نے فنون حدیث کی خدمت کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو یہ علوم زوال کا شکار ہو جاتے۔

اس وقت عمومی طور پر علماء دیوبند کی خدمت حدیث کا جائزہ لینا مقصود نہیں بلکہ مختصر طور پر یہ دکھانا تھا کہ حضرت محدث اعظمی اس روشن تاریخ کے تسلسل کا ایک زریں کردار تھے، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں علم و فن کے آسمان پر جو نامور علماء آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کے غروب کے بعد بھی اہل علم ان کے زندہ جاوید

آثار سے استفادہ کرتے ہیں ان شخصیات میں حضرت مولانا کا نام نہایت ممتاز ہے، بیسویں صدی میں عالم اسلام بشمول ہندوستان میں علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ زاہد کوثریٰ اور شیخ احمد محمد شاہ وغیرہ کے بعد علوم حدیث کے تابناک افق پر جو ستارے نہایت آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوئے ان میں شیخ عبدالفتاح ابو غدہ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی وغیرہ کے ساتھ ایک نہایت نمایاں نام محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے نامور خدام حدیث کی کوئی فہرست بھی مولانا کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا کا علم حدیث سے لگاؤ فطری تھا، ان کا ذوق خالص محدثانہ و محققانہ تھا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری سے استفادہ کیا تھا، پھر جب آب و ہوا کی نا موافقت کے سبب دیوبند سے جانا پڑا تو اپنے وطن میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئویٰ اور مشہور محدث حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی تکمیل کی تھی، فراغت کے بعد تالیف و تدریس کے ذریعہ مسلسل خدمت حدیث میں مصروف رہے۔

علمی دنیا خصوصاً عالم عرب میں ان کی شہرت کا نقطہ عروج ان کے وہ استدراکات تھے جو انہوں نے مصر کے مشہور و معروف محقق شیخ احمد محمد شاہ کی تعلیقات علی مسند احمد پر کئے تھے، اور ان کو شیخ کے پاس بھیج دیا تھا، شیخ نے ان کو اپنی کتاب میں شامل کرتے ہوئے مولانا اعظمی کے تبحر علمی اور دقت نظر کی دل کھول کر داد دی اور ان کا شکریہ ادا کیا، یہ چیز بجائے خود شیخ کی علمی دیانت اور وسعت قلبی کے ساتھ ساتھ مولانا اعظمی کے استدراکات کی صحت اور علمی وقعت کی بین دلیل تھی۔

اس کے بعد حضرت محدث اعظمی نے اس فن کی خدمت کے لیے کئی سنگٹاخ وادیوں کو منتخب کیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوئے، ان میں سے

بعض نمایاں کام حسب ذیل ہیں:

(۱) مسند حمیدی - تحقیق و تعلیق: مسند حدیث کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن

میں صحابہؓ کی ترتیب سے روایات کو جمع کیا جاتا ہے، ہر صحابی کی تمام مرویات خواہ وہ کسی

بھی موضوع سے متعلق ہوں ایک جگہ جمع کر دی جاتی ہیں، مسند کے نام سے بہت سے

محدثین نے کتابیں لکھی ہیں جن میں امام حمیدیؒ کا نام بھی نہایت ممتاز ہے امام حمیدیؒ

امام بخاریؒ کے کبار اساتذہ میں سے ہیں، ان کی مسند غیر مطبوعہ شکل میں چلی آرہی

تھی، حضرت محدث اعظمیؒ نے اس کے مختلف نسخوں سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اس پر

تعلیقات کے علاوہ ایک جامع مقدمہ لکھا، یہ کتاب مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

(۲) کتاب الزہد والرقائق: یہ دوسری صدی ہجری کے نامور عالم محدث

مجاہد حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جس میں تذکیر و موعظت کی

احادیث جمع کی گئی ہیں، یہ بھی غیر مطبوعہ شکل میں خال خال ہی کتب خانوں میں موجود

تھی، محدث کبیر نے اس کے چند مخطوطہ نسخوں کی مدد سے صحیح نسخہ تیار کیا، اس کی

احادیث کی تخریج کی، مشکل الفاظ کی توضیح کی، اور فہرست سازی کے علاوہ ایک

مقدمہ تحریر فرمایا، یہ کتاب مجلس احیاء المعارف مالنگاؤں سے شائع ہوئی۔

(۳) مصنف عبدالرزاق: یہ عظیم کتاب دوسری صدی ہجری کے مشہور امام

حدیث، عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی تصنیف ہے جس کی اکثر روایات ثلاثی ہیں،

اکیس ہزار احادیث کا یہ عظیم مجموعہ بھی تحفہ طباعت چلا آرہا تھا، مولانا اعظمیؒ نے اس پر

دس سال محنت کی، نسخہ کی تصحیح کی، احادیث کی تخریج اور تحقیق و تعلیق سے اس کو مزین کیا،

یہ کتاب گیارہ جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ: یہ کتاب بھی حدیث کی امہات کتب میں سے

ہے، اس کے مصنف، امام بخاری کے استاذ اور مشہور محدث ہیں، اس بے مثال کتاب

میں احناف کے مستدلات بھی بکثرت ملتے ہیں، یہ کتاب اگرچہ پہلے بھی چھپ چکی تھی، لیکن اس کے شایان شان تحقیقی کام اس پر نہیں ہو سکا تھا، حضرت مولانا نے بعض اہل علم کے اصرار پر اس عظیم کتاب کی بھی تصحیح اور تحقیق و تعلیق کا کارنامہ انجام دیا۔

یہ مولانا کے بے شمار علمی کاموں سے چند اہم خدمات کا اجمالی تذکرہ تھا اور ان کی علمی فتوحات کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے، جن کی تفصیلات آپ زیر نظر کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے، ان عظیم علمی کارناموں کی بدولت ان کا نام حدیث نبوی کے عالی مرتبت خدام میں جلی حروف سے لکھا جا چکا ہے۔

پھر یہ کہ ان کی خدمات صرف علم حدیث تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ دیگر بہت سے علوم و فنون بھی ان کی خدمت کے دائرے میں آتے ہیں، تفسیر، فقہ، تاریخ و تذکرہ، مناظرہ وغیرہ میں ان کی باقاعدہ تصانیف کی ایک وسیع تعداد ہے، اسی کے ساتھ وہ زبان و ادب کے بھی شہسوار ہیں اور اردو فارسی عربی پر ان کو یکساں قدرت ہے، اور ان تینوں زبانوں میں نظم و نثر میں ان کے نقوش زندہ و تابندہ ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت کس قدر علوم و فنون کی جامع ہے۔

اس علمی جامعیت خصوصاً حدیث میں اس درجہ وسعت نظر کے ساتھ ان کی جو خصوصیت نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ حنفیت اور اکابر و اسلاف کے مسلک پر ان کا ثبات و استحکام ہے، حدیث پاک سے اشتغال رکھنے والے علماء میں بعض اوقات جو غیر ضروری توسع پیدا ہو جاتا ہے اس سے حضرت مولانا کی ذات بری ہے، وہ اکابر دیوبند کی طرح تھے کہ انھیں کسی مسئلے میں اشکال پیدا نہیں ہوا یہ ان کی بالغ نظری کی علامت ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ نے ان کو دین میں تفقہ اور گہری بصیرت کے بلند پایہ وصف سے حظ وافر عطا کیا تھا۔

ان علمی خصوصیات کے علاوہ ان کی عظیم شخصیت اور بھی بے شمار اوصاف

کمال سے متصف تھی، تصوف و سلوک میں ان کا مقام بہت بلند تھا، اصابت رائے ان کا خاص جوہر تھا، جس کی بنیاد پر وہ معاملات میں صحیح فیصلہ تک باسانی پہنچ جاتے تھے، علمی تحقیق اور اس میں دیانت پر کاربند رہنے کے عادی تھے، نہایت درجہ مردم شناس تھے، مزاج میں اہل کمال کی طرح نزاکت تھی، لیکن تمام اوصاف کمال کے باوجود تواضع اور اکابر کا احترام حد درجہ پایا جاتا تھا، ان کی ذات علم و عمل کی جامع تھی، اور بلاشبہ ان کا شمار ان اہل کمال میں تھا جن کی مثالیں کم پیدا ہوتی ہیں۔ جو ”در کئے جام شریعت در کئے سندان عشق“ کی صفت سے متصف ہوتے ہیں، جن کی شخصیت نہ تو علم و فن کے کسی ایک شعبہ تک محدود ہوتی ہے اور نہ صرف علم یا صرف عبارت کو ان کی پہچان قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ ان کی ذات علوم و فنون اور اخلاق و کردار دونوں میں مقام بلند پر فائز ہوتی ہیں۔

ایسی جامع شخصیات کے احوال و سوانح کا سامنے آنا ان کے حق کی ادائیگی بھی ہے اور بعد والوں کے لیے رہنمائی بھی، اس لیے حضرت مولانا قدس سرہ پر مختلف اہل قلم نے خامہ فرسائی کی ہے، جن میں اب تک سب سے نمایاں مقام ان کے نواسے مولانا ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی کی کتاب ”حیات ابوالماثر“ کا ہے، اور اب یہ دوسرا مفصل تحقیقی کام جناب مولانا محمد صہیب صاحب الدہ آبادی کے قلم سے سامنے آرہا ہے۔

اس کتاب کو انہوں نے پانچ ابواب پر مرتب کیا ہے۔

باب اول میں بیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی و ثقافتی احوال کا جائزہ لیا گیا ہے، جس کے تحت مختلف سیاسی تحریکات کے علاوہ علمی تحریکات، دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ جیسے اداروں کا پس منظر، اور مختلف فکری رجحانات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس باب کا مقصد دراصل اس دور کو قارئین کے سامنے واضح کرنا ہے جس میں حضرت محدث الاعظمی نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔

دوسرے باب کا عنوان ہے سوانح حیات، اس میں ولادت سے وفات تک کے حالات کا مختصر بیان ہے، اس میں ولادت، نام و نسب، تعلیم و تربیت، تدریسی سرگرمیاں، بیعت و سلوک، سیاسی و سماجی سرگرمیاں اور وفات سب کا بیان آگیا ہے۔ تیسرا باب مختلف علوم و فنون سے متعلق خدمات کے موضوع پر ہے، یہ باب اس کتاب کا خلاصہ اور سب سے مفصل باب ہے جو محدث اعظمیٰ کی اصل شخصیت کا تعارف کراتا ہے۔

سب سے پہلے تفسیر قرآن سے متعلق ان کی بعض وقیع تحریروں کا تذکرہ اور مفصل جائزہ ہے۔

اس کے بعد حدیث کے عنوان کے تحت مولانا کی خدمات کی تفصیل ہے، اس عنوان کے تحت جن عظیم کتابوں کی تالیف، تحقیق، تعلیق اور تصحیح وغیرہ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

- (۱) الحاوی لرجال الطحاوی (۲) منیة الألمعی فی مافات من تخریج
- أحادیث الهدایة للزیلعی (۳) کتاب الثقات لابن شاہین (۴) انتقاء
- الترغیب والترہیب (۵) رسالة الاوائل (۶) مسند حمیدی (۷) کتاب
- الزهد والرقائق (۸) سنن سعید بن منصور (۹) مجمع بحار الأنوار
- (۱۰) مصنف عبدالرزاق (۱۱) المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانية
- (۱۲) فتح المغیث بشرح ألفیة الحدیث (۱۳) تلخیص خواتم جامع
- الأصول (۱۴) کشف الأستار عن زوائد البزار علی الكتب الستة
- (۱۵) مصنف ابن أبي شیبة (۱۶) حیاة الصحابة.

اس کے بعد استدراکات کا عنوان ہے جس میں سب سے پہلے شیخ احمد محمد شاہ کی تعلیقات مسند احمد پر مولانا کے استدراکات کی تفصیل ہے، اس کے بعد شیخ

ناصر الدین البانی پر مولانا کے استدراکات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو الالبانی شذوذہ
و اخطاؤہ کے نام سے طبع ہو چکے ہیں، پھر الرفع و التکمیل جو مولانا عبدالحی لکھنوی کی
تصنیف ہے اور اس پر شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی تعلیقات ہیں اس پر مولانا کے
استدراکات کی تفصیل بیان کی گئی ہے پھر مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمن
مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی پر مولانا کے استدراکات کا تذکرہ ہے۔

ان تحقیقات و تعلیقات کے بعد اسماء رجال میں مولانا کے مقام بلند کا تذکرہ
اور اس کے شواہد پیش کیے گئے ہیں پھر حدیث کی حجیت و صداقت پر مولانا کی محققانہ
تالیف نصرۃ الحدیث کا تذکرہ ہے، اس کے علاوہ پانچ چھ مزید کتب کا ذکر ہے جن پر
مولانا کی تعلیق ہے، آخر میں محدث اعظمیؒ سے حدیث کی اجازت حاصل کرنے والے
مشہور علماء کی فہرست ہے جس میں اس دور کے تقریباً سبھی بڑے بڑے عرب علماء نظر
آتے ہیں۔ اور اسی پر حدیث کا عنوان مکمل ہوتا ہے۔

اس کے بعد فقہ کا عنوان ہے جس میں مولانا اعظمیؒ کی فقہی تالیفات کا جائزہ
ہے اس میں الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ، الازہار المربوعہ فی رد الآثار
المستوعبہ، رکعات تراویح، رہبر حجاج، وغیرہ تقریباً سات آٹھ تالیفات کا مفصل تذکرہ
اور بیس پچیس فقہی مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

فقہ کے بعد مناظرہ کے عنوان کے تحت رد شیعیت، رد غیر مقلدیت، رد
بریلویت وغیرہ کے تحت دس بارہ تالیفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اس کے بعد تاریخ و تذکرہ کا عنوان ہے جس میں پانچ چھ تالیفات کا تعارف
اور چندہ سولہ مضامین کی فہرست دی گئی ہے، اس باب کا آخری عنوان ادب ہے جس
کے تحت عربی اور اردو نظم و نثر پر محدث اعظمیؒ کی قدرت اور اس میدان میں ان کی
مہارت کا تذکرہ، ان کی اردو عربی نثر کے نمونے، اسی طرح عربی نظم اور اردو میں

غزل، نعت اور تاریخ گوئی وغیرہ کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور اس طرح اس عنوان سے محدث اعظمی کی حیات اور صلاحیت کا ایک نیا گوشہ سامنے آتا ہے، جو غالباً اسی کتاب کی خصوصیت ہے۔

چوتھا باب متفرقات کے عنوان سے ہے جس میں مولانا کی چند متفرق کتابوں کے تعارف کے علاوہ تقریباً ساٹھ مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ باب پنجم میں مولانا رحمہ اللہ کے متعلق اہل علم و نظر کی آراء پیش کی گئی ہیں جن سے مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے مقام بلند کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آخر میں اختتامیہ کے عنوان کے تحت حضرت مولانا اعظمی کی حیات و خدمات پر ایک اجمالی تبصرہ ہے جو بیک نظر مولانا کی شخصیت کو سامنے لے آتا ہے۔ سب سے آخر میں کتابیات کا عنوان ہے جس کے تحت مؤلف نے ان مراجع کی فہرست دی ہے جن سے انہوں نے اپنے اس مفصل تحقیقی مقالہ میں استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں ۱۶ عربی و اردو کتب، چار انگریزی و ہندی کتابیں اور ۳۲ رسائل و مجلات شامل ہیں، یہ فہرست بجائے خود مؤلف کی عرق ریزی و جانفشانی کی بہترین گواہ ہے۔ مجموعی اعتبار سے کتاب اپنے موضوع پر نہایت کامیاب ہے جس کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ جناب مولوی محمد صہیب صاحب نے اپنے مآخذ سے براہ راست اور بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس طرح وہ تحقیقی مقالہ کی حیثیت سے اس نام کی آبرو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

دعاء ہے کہ باری تعالیٰ اس محنت کو قبول عام عطا کرے اور اس کو محدث اعظمی کی شخصیت اور خدمات سے استفادہ کا ذریعہ بنائے آمین۔

ریاست علی بجنوری غفرلہ

خادم تد ریس، دارالعلوم دیوبند

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حرفے چند

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

ریڈر شعبہ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بس وکاش است قصہ خواباں، و ز اں میاں

تو یوسفی و قصہ تو احسن القصص

فخر الامثال حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نور اللہ مرقده (متوفی

۱۰/ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ / ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء) عہد حاضر کے کبار علماء میں سے

تھے، عرب و عجم کے اساطین علم نے ان کے فضل و کمال اور تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی جلالت علمی کی وجہ سے ارباب علم کے درمیان محبوبیت کی شان رکھتے تھے۔

ناچیز اپنی سعادت تصور کرتا ہے کہ کم سنی ہی میں اسے اپنے والد مرحوم کے

ہمراہ حضرت کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ پھر کسی نہ کسی تقریب سے حضرت کی

خدمت میں حاضری کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ جامعہ مظہر العلوم، بنارس میں ختم

بخاری کے موقع پر ایک سے زائد مرتبہ حضرت کے درس حدیث میں شرکت کی توفیق

بھی نصیب ہوئی، اس طرح ابتدا ہی سے حضرت کی محبت و عقیدت دل میں راسخ ہو

گئی، پھر اس میں اس وقت اور اضافہ ہوا، جب یہ معلوم ہوا کہ آپ حضرت تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ انور شاہ کشمیری جیسے اکابر کے محبوب و معتمد رہے ہیں۔

وہ اہل علم حضرات جنہیں محدث جلیل کی صحبت میں رہنے اور ان سے مستفید ہونے کے مواقع نصیب رہے ہیں، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ معقولات و منقولات دونوں پر حاوی تھے اور علوم مشرقیہ متداولہ کے تمام شعبوں اور گوشوں پر ان کی غائر نظر تھی، بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ مذکورہ فنون میں سے کسی فن کا منتہی بھی، علم کے اس بحرِ ذخار کے سامنے خود کو مبتدی تصور کرتا تھا۔ (ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء) تاہم آپ کا میدان اختصاص حدیث، فقہ اور ادب تھا، مولانا نعمت اللہ اعظمی مدظلہ العالی (استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند) نے علم حدیث میں انھیں ذہبی اور ابن حجر سے تشبیہ دی ہے، ناچیز عرض کرتا ہے کہ حدیث و فقہ کی جامعیت کے لحاظ سے وہ ابن جریر طبری اور امام طحاوی کے مشابہ تھے، عربی زبان و ادب پر بھی انھیں قدرتِ تامہ حاصل تھی، لیکن اپنے اسلاف کی طرح انھوں نے اسے مقصود بالذات بنانے کے بجائے علومِ دینیہ کا خادم بنایا تھا۔

محدث جلیل کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ نہایت وسیع المطالعہ تھے، مختلف علوم و فنون کی امہات کتب کے علاوہ نوادرِ مخطوطات سے بھی ان کی واقفیت بے پناہ تھی، ہند و بیرون ہند کے معروف کتب خانوں کے علاوہ مختلف علمی خانوادوں کے ذاتی ذخیروں کی بھی خبر رکھتے تھے، مطبوعات کی طرح اہم مخطوطات کا مطالعہ بھی بالاستیعاب کرتے تھے۔

وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس نابغہ روزگار محدث کو منتقدین کا سا حافظہ ارزانی فرمایا تھا کہ جس فن کی جو تحریر ایک بار نگاہ سے گزر جاتی نقش

کا لہجہ ہو جاتی تھی، قریب رہنے والوں کا مشاہدہ ہے کہ سالکین دیار و امصار سے آتے، اپنی مشکلات و معضلات پیش کرتے، محدث جلیل کسی توقف یا مراجعت کتب کے بغیر فی البدیہہ جواب شافی سے نوازتے، مصنفین اور کتابوں کے نام ہی نہیں، ان کے سنین وفات، سنین اشاعت اور مطابع کے نام بھی بلا مبالغہ ہزار ہا کی تعداد میں انھیں محفوظ تھے، ناچیز نے ایک بار عرض کیا کہ خیر الدین الزرکلی نے 'الأعلام' میں 'شمس الدین البرماوی' باء کے کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے، فرمایا: "غلط ہے، صحیح 'البرماوی' فتح کے ساتھ ہے۔" "علوم دینیہ اور مطبع نول کشور" کے عنوان سے اپنی ایک تحریر بہ غرض اصلاح خدمت والا میں پیش کی۔ دیکھنے کے بعد فرمایا: مضمون ٹھیک ہے البتہ بعض مصنفین کے سنین وفات صحیح نہیں ہیں۔

علم ایسا راسخ، مرتب اور منقح تھا کہ جس مسئلے میں ایک بار جو رائے قائم فرما لیتے وہ ایسی صائب اور درست ہوتی کہ اختلاف کرنے والا مہینوں نہیں، برسوں بھٹک بھٹکا کر بالآخر وہیں پہنچتا۔

عقوان شباب میں درس و تدریس کے پہلو بہ پہلو باطل اور گمراہ فرقوں کے ہجمات و ہفوات اور شکوک و شبہات کے رد و ازالے کی طرف توجہ زیادہ رہی اور یہ وقت کی ایک اہم ضرورت بھی تھی، کیوں کہ یہ دور ابو حیان تو حیدی (متوفی تقریباً ۴۰۰ھ) کی تعبیر کے مطابق "نبح کل کلب من کل زاویۃ، و زار کل أسد من کل أجمۃ، و ضبح کل ثعلب من کل تلعة" (ہر گلی سے ہر کتا بھونکا اور ہر جھاڑی سے ہر شیر دھاڑا اور ہر ٹیلے سے ہر لو مڑی نے آواز لگائی) کا تھا، کہیں منکرین قرآن تھے، کہیں منکرین سنت تھے، کہیں منکرین صحابہ تھے اور کہیں منکرین فقہا تھے، وغیرہ۔ محدث جلیل نے تحریراً و تقریراً یعنی مناظروں اور کتب و رسائل کے ذریعے ان تمام فتنوں کے سد باب میں حصہ لیا اور علم و عمل کے میدان میں تابندہ نقوش یادگار

چھوڑ گئے۔ پھر جب آپ نے مصنفین صحاح ستہ کے پیش روں کی سنن، مسانید، مصنفات اور حدیث کے دیگر نادر مخطوطات کو فاضلانہ تحقیقات و تعلیقات کے ساتھ مزین فرما کر پہلی بار نور اشاعت سے منور فرمایا تو آپ کی شہرت عجم سے نکل کر عرب تک بلکہ مشرق سے مغرب تک ہر طرف پھیل گئی اور علمائے عصر کے درمیان آپ کا تفوق و امتیاز روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا:

فإنك شمس والملوك كواكب إذا طلعت لم يبد منها كوكب
(نابغہ الدہیانی)

محدث جلیل کے علمی آثار میں ان کے استدراکات و تعلیقات بھی ایک خاص شان کے حامل ہیں، اصل یہ ہے کہ یہ قدر توفیق مطالعہ کتب سبھی کرتے ہیں، لیکن معمولی استعداد رکھنے والے قاری کو مصنف کی اغلاط و تسامحات کا اندازہ بھی نہیں ہوتا، اس کے برخلاف عالم تبصر کی نگاہ باریک بین خفی و جلی ہر قسم کی غلطیوں کا ادراک کر لیتی ہے، محدث جلیل کا یہی معاملہ تھا، وسعت مطالعہ، نگاہ ثاقب اور علمی استحضار کی وجہ سے زیر مطالعہ تحریر کی خامیاں ان پر فوراً عیاں ہو جاتی تھیں، ایسی صورت میں کبھی تو اصل کتاب یا مضمون پر ہی اپنے استدراکات ثبت فرما دیتے اور اگر ضرورت متقاضی ہوتی تو مستقل کتاب یا مضمون کی شکل دے دیتے، متفرق مضامین و مقالات سے قطع نظر شیخ احمد محمد شاکر، محمود محمد شاکر، ناصر الدین البانی اور صاحب تحفۃ الاحوذی پر آپ کے استدراکات غیر معمولی اہمیت کے حامل اور آپ کے تجربہ علمی کے آئینہ دار ہیں۔

محدث جلیل کو تصنیف و تالیف کا ذوق عہد طالب علمی ہی سے تھا، چنانچہ اس دور کی بعض تحریریں اب بھی محفوظ ہیں، پھر یہ شوق ترقی کرتا گیا اور آپ نے مدت العمر تحریر و تسوید سے اشتغال رکھا، حسن ترتیب، زور بیان اور قوت استدلال آپ کی نگارشات کے بنیادی اوصاف ہیں، اسی طرح مخاطب خواہ کوئی ہو اور موضوع چاہے

مناظرانہ ہی کیوں نہ ہو، آپ کی کوئی تحریر علمی متانت سے عاری نہیں ہوتی، یہ عجیب بات ہے کہ آپ کی ابتدائی قلمی کاوشیں بھی پختگی و رزانت میں بعد کی تحریروں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

محدث جلیل نے اپنی عربی تصانیف و تعلیقات سے قطع نظر، علمی افادات و افاضات کے لیے عام طور پر اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا ہے، اس طرح اس زبان کی ثروت میں اضافہ ہوا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درس و تدریس سے وابستہ علمائے کرام عام طور پر اردو زبان و ادب سے اشتغال نہیں رکھتے، اس لیے نامانوس عربی مرکبات و مفردات کی کثرت کی وجہ سے ان کی اردو تحریروں میں بسا اوقات ناہمواری اور دقت کا احساس ہوتا ہے، لیکن محدث جلیل کی اردو تحریروں میں بھی ان کا موضوع کیسا ہی خشک کیوں نہ ہو، سلاست و شگفتگی کی حامل اور سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، بات یہ ہے کہ آپ نے اردو ادبیات کا بھی مطالعہ کیا تھا، شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے، اردو کے مشہور انشاء پردازوں اور ان کے اسالیب سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے صاف ستھری اور شگفتہ نثر لکھتے تھے، ایک بار سید احمد دہلوی کی ”فرہنگ آصفیہ“ کا ذکر آیا تو فرمایا: ”نور اللغات اس کے مقابلے میں زیادہ بہتر لغت ہے۔“

محدث جلیل کی وفات کے بعد آپ کی حیات و شخصیت اور علمی خدمات کے تعارف کے لیے سہ ماہی ”ترجمان الاسلام“ بنارس نے ”مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نمبر شائع کیا، اس کے بعد آپ کے نبیرہ گرامی قدر واکرم مسعود احمد الاعظمی نے پہلے عربی پھر اردو میں آپ کی سوانح حیات مرتب کی، اردو سوانح حیات ”حیات ابوالہماثر“ کے نام سے ۲۰۰۰ء میں مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ، منو سے شائع ہو چکی ہے۔ اس

میں فاضل نو جوان نے بڑی خوبی و دل آویزی اور جان کا ہی وثر ف نگاہی کے ساتھ حیات ابوالہ آثار کے بکھرے دانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

اب ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ محدث جلیل کی علمی خدمات کا بھی نسبتاً جامع اور مفصل انداز میں تعارف کرایا جائے، قسماً ازل نے یہ سعادت بھی ایک نو جوان فاضل ڈاکٹر محمد صہیب قاسمی الہ آبادی کے لیے مقدر فرمائی تھی۔ چنانچہ عزیز موصوف نے ”مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اور ان کی علمی خدمات“ کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا، جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔

راقم نے یہ مقالہ شروع سے آخر تک پڑھا ہے، اس کا تیسرا اور چوتھا باب محدث جلیل کی علمی خدمات کا بڑی حد تک احاطہ کرتا ہے، مقالہ نگار نے تفسیر، حدیث، فقہ، مناظرہ، تاریخ و تذکرہ، اور ادب کے ذیلی عنوانات قائم کر کے ہر موضوع سے متعلق محدث جلیل کی تمام تحریروں کا تعارف کرایا ہے، اس ضمن میں انھوں نے رسائل اور کتابوں ہی پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ موضوع زیر بحث سے متعلق مضامین، مقالات اور دوسروں کی کتابوں پر تحریر کردہ مقدمات وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے، پھر آخر میں متفرقات کے تحت ان کتابوں سے متعلق گفتگو کی ہے، جو مذکورہ عنوانات کے تحت نہیں آتیں، مثلاً ”حسن ادب اور اس کی اہمیت“ اور ”اسرار المحبت“ وغیرہ اس طرح علمی خدمات کے اس تجزیہ و تعارف میں جامعیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

مقالہ نگار کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انھیں اس کام کے دوران محدث جلیل کے خلف رشید مولانا رشید احمد الاعظمی کی سرپرستی اور نبیرہ گرامی قدر ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی کی رفاقت حاصل رہی، اس طرح انھیں اپنے موضوع سے متعلق تمام بنیادی مآخذ تک رسائی کے مواقع نصیب ہوئے، ساتھ ہی قدم بہ قدم زبانی رہنمائی بھی ملتی رہی، لہذا

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موضوع زیر بحث سے متعلق ان کے بیانات کو اعتبار کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ انھوں نے محدث جلیل کی تمام دستیاب تحریریں خواہ وہ مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ دیکھی اور بیشتر پڑھی ہیں۔

اس مقالے کی ایک اچھی صفت یہ بھی ہے کہ مقالہ نگار نے افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے اس میں ہر جگہ اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ اس کی زبان غیر آرائشی، اسلوب سادہ اور پیش کش متناسب ہے۔ اسی طرح تمہید، تعارف اور مثالوں وغیرہ کے سلسلے میں غیر ضروری تطویل سے احتراز کیا گیا ہے، اگر کسی مختلف فیہ مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے تو اس میں مخالف نقطہ نظر کو بھی ہمدردی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اس کا مرجوح ہونا ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً جامع معمر اور جامع عبدالرزاق کی بحث وغیرہ۔

ممالک عربیہ کے برخلاف ہندوستان کے عصری جامعات میں ادبیات کے شعبوں میں تحقیق کا معیار بہت درجہ زوال پذیر ہے۔ طلبہ عموماً محنت سے جی چراتے ہیں، اس لیے اچھے اور معیاری مقالے شاذ و نادر ہی منظر عام پر آتے ہیں، ڈاکٹر محمد صہیب نے تین سال تک شبانہ روز محنت کی ہے، پیش نظر مقالہ اسی کا ثمرہ ہے۔ امید ہے کہ اشاعت کے بعد علمی حلقوں میں اسے شرف قبول حاصل ہوگا۔ شکراً للہ مساعیہ۔

ظفر احمد صدیقی

علی گڑھ - ۱۷ جولائی ۲۰۰۶ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تمہید

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين، وعلى آله وصحبه الطيبين الطاهرين، وعلى من اتبعهم الى يوم الدين.

ہندوستان کی سرزمین کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے ایسی ایسی یگانہ روزگار شخصیتوں کو جنم دیا جنہوں نے اپنی علمی کاوشوں سے ظلمت کدہ ہند کو منور اور روشن کیا۔ اس خاک کے خزف ریزے بھی درناب کی طرح روشن ہوئے اور ایسے ایسے تابناک اور درخشندہ علمی ستارے جگمگائے کہ جن کی ضیاء علم نے نہ صرف یہ کہ تاریخ کے صفحات کو روشن کیا بلکہ علم و تحقیق کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔

یہ ہمارے ملک کا شرف و اعزاز ہے کہ اگر فارسی زبان میں امیر خسرو سے لے کر مرزا غالب تک جید علماء و ادباء کے کارنامے نظر آتے ہیں، تو عربی میں بھی ایسے نابغہ روزگار گزرے ہیں کہ جن کی علمی فتوحات نے عرب کو بھی ان کا معترف و مداح بنادیا۔

اگرچہ عربی ایک دینی و مذہبی زبان سمجھی جاتی ہے اور عام طور سے یہ خیال ہے کہ اس زبان میں کسی غیر عرب کا شرف و امتیاز حاصل کرنا مشکل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو بھی خدمت دین کی توفیق کرامت کرے، وہ اپنے معجز قلم سے ایسے کارنامے

انجام دیتا ہے کہ جس کی عظمت و بلندی پر صحرائے عرب کے حدی خانوں کو بھی رشک آتا ہے۔

ایسی ہی شخصیتوں میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی شخصیت ہے۔ اتر پردیش میں نسبتاً ایک غیر معروف علاقہ میں پیدا ہونے والے ایک فرد نے اپنے علمی کارناموں سے اسے بین الاقوامی وقار عطا کیا۔ مولانا اعظمی نے مکو میں بیٹھ کر اپنے رشحات قلم سے دنیائے اسلام کو متوجہ کیا، انہوں نے کبھی اختلاف کی پرواہ نہ کی، اور جو کچھ حق سمجھا اور صحیح جانا، اس کے اظہار میں کبھی نہ ہچکچائے اور نہ کبھی ان کے قلم کو لغزش ہوئی، ان کا قلم تمام عمر حق و صداقت کی آواز بلند کرتا رہا۔

مولانا اعظمی کو موضوع تحقیق بنانے کی دشواریوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی علمی جلالت ہشت پہل ہے۔ مفسر، محدث، فقیہ، مؤرخ، محقق، ادیب، مناظر اور مدرس اور پھر ایک سیاسی شخصیت! مجھے جیسا بے بضاعت اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا، اگر مجھے ایسے رہنما کا دامن نہ ملتا، جس کی نگاہ علوم کے ان تمام شعبوں پر ہے۔

ہندوستان کی اہم ترین تصنیفات میں شمس بازغہ کی بڑی اہمیت ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی ”شمس بازغہ“ سے معرفت الہی حاصل ہوئی اور ان کی جہاں میں نظروں پر سارے اسرار و رموز آشکار ہوئے۔ مجھ جیسے کم علم کو بھی ایک شمس ملا جس کو دنیا مولانا شمس تبریز خاں کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی وجہ سے ساری دشواریاں آسان ہوئیں، انہوں نے حق راہنمائی ادا کیا، اور اگر کہیں اس مقالہ میں میرا قلم لڑکھڑایا ہوگا تو وہ میری عدم استعداد کا نتیجہ ہوگا۔ انہوں نے انتہائی حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے تنبیہ و تادیب کے فرائض کی انجام دہی بھی کی، اگر ان کی توجہ و عنایت شامل حال نہ ہوتی تو اس مقالہ کا پایہ تکمیل تک پہنچنا از بس مشکل تھا۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول میں اس دور کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور علمی و ثقافتی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں مولانا نے آنکھیں کھولیں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سیاست کا ثقافت اور تعلیم سے گہرا رشتہ ہے، دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی شخصیت کی حیات کے مختلف گوشوں اور اس کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لئے اس کے عہد اور ماحول سے متعارف ہونا ضروری ہے، چنانچہ اس باب میں ہندوستان کے بیسویں صدی کے سیاسی و ثقافتی حالات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں مولانا اعظمی کی سوانح حیات قلم بند کی گئی ہے۔ چونکہ اس مقالہ میں مولانا کی علمی خدمات سے بحث کرنا مقصود ہے؛ اس لئے حیات کے شخصی گوشوں کو مختصر اہی پیش کیا گیا ہے۔ البتہ حیات سے متعلق ان تمام گوشوں کو احاطہ تحریر میں لانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، جن سے کسی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

تیسرا باب علوم و فنون سے متعلق مولانا کی خدمات اور تحقیقی کارناموں کا ہے۔ اس باب میں ہر فن سے متعلق مولانا کی خدمات کو علیحدہ علیحدہ فصل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے عناوین یہ ہیں: تفسیر، حدیث، فقہ، مناظرہ، تاریخ اور ادب۔

چوتھا باب ”متفرقات“ کا ہے۔ اس باب میں مولانا اعظمی کی مختلف علمی کاوشوں کو یکجا پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب ”مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں“ ہے۔ اس باب میں ان مشاہیر و اعلام کی آراء پیش کی گئی ہیں، جنہیں مولانا کی وجاہت علمی اور جلالت شان کا اعتراف تھا۔

مولانا اعظمی کی علمی خدمات کو مقالے کا موضوع بنانا نہایت مشکل اور دشوار

اور حد درجہ احساس ذمہ داری پیدا کرنے والا امر تھا، لیکن راقم الحروف نے اس کے باوجود اس بار کو اٹھایا جسے صاحبان علم و بصیرت نے مقدس پتھر سمجھ کر چومنا اور چھوڑ دیا۔ استاذ محترم کی مسلسل حوصلہ افزائیاں مشعل راہ تھیں، حسن اتفاق سے ایسے صاحبان علم کی صحبت بھی نصیب ہوئی کہ جن کے تعاون نے اس مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

میں اپنے تمام احباب کا شکر گزار ہوں، جن کا سلسلہ لکھنؤ، الہ آباد، اعظم گڑھ اور موتیک پھیلا ہوا ہے۔ انگریزی میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی قابل قدر ہیں جو کنارے پر کھڑے ہو کر تیراک کا دل بڑھاتے ہیں، میں ان سب کا ممنون ہوں۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ مجھے خاندان سے باہر بھی ایسے بزرگ ملے جنہوں نے مسلک کے اختلاف کے باوجود میرے طالب علمانہ شوق کے مد نظر میری مدد کی۔ اس مدد میں دایہ درمے نہ سہی مگر قدمے اور سخن کے ساتھ کتابیں بھی شامل تھیں۔

میں اپنے والد محترم جناب احمد علی صاحب مدظلہ کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اپنے بڑے بھائی جناب محمد شعیب صاحب (مقیم اسکندریہ - مصر) کا ذکر کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، جو کچھ بھی میں لکھ سکا اس کا ایک ایک لفظ ان کی شفقتوں اور محبتوں سے گرا نبار ہے۔

میں اس مقالہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ صاحبزادہ محدث اعظمیؒ کی سرپرستانہ رہنمائی کا بہ صمیم قلب ممنون ہوں۔ مقالے کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی جس خلوص کا جناب والا نے مظاہرہ کیا ہے، اس کا میرے قلب پر بہت اثر ہے اور شکریہ کے لئے الفاظ نا کافی ہیں۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر ان کے سایہ عاطفت کو مدت دراز تک باقی رکھے۔

”المآثر“ کے نائب مدیر برادر محترم جناب ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی اور

جناب مولانا انور رشید الاعظمی (مدیر مسئول المآثر) کا بے حد تشکر ہوں، انہوں نے اپنے خزانہ علم و خلوص کے سارے دروازے میرے لئے کھول دیئے اور مجھے اجازت دے دی کہ میں لعل و گہر چن کر اس مقالہ کو مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے شایان شان بنا سکوں۔ بالخصوص ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ قدم بہ قدم ان کے قیمتی مشوروں نے راہ تحقیق کو ایسا روشن کر دیا کہ منزل مقصود تک رسائی میرے لئے آسان ہو گئی۔ ناسپاسی ہوگی اگر مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی (مدیر المآثر) و سرپرست مجلہ 'ضیاء الاسلام' کا ذکر نہ کیا جائے، انہوں نے مقالہ سے متعلق اہم ترین مواد فراہم کئے۔ اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ اگر اس مقالہ میں تسامحات ہو گئے ہیں، تو وہ تقاضائے بشریت ہیں اور تحقیق میں کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ علوم کے صفا و مروہ کے درمیان جتنی سعی ممکن تھی، وہ میں نے کی، پھر بھی قبولیت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور صاحبان نظر اگر اسے یہ شرف عطا کریں گے تو باعث صدا افتخار ہوگا۔

السعي مني والإتمام من الله.

باب اول

ہندوستان بیسویں صدی

کے اوائل میں

○ سیاسی حالات

○ علمی و ثقافتی حالات

باب اول

ہندوستان بیسویں صدی کے اوائل میں

تاریخ شاہان اولوالعزم کی مہم آزمائیوں کا نام نہیں ہے، اور نہ وقت کو کسی بھی خط ابیض سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دراصل تاریخ اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے جنکی روشنی میں تاریخ کی تفہیم ممکن ہوتی ہے۔ ’وقت‘ یا ’تصورِ زمان‘ لاکھ بے حقیقت سہی سلسلہ روز و شب نقشِ گرِ حادثات ہونے کے باوصف اپنا اول بھی فنا رکھتا ہے، آخر بھی فنا رکھتا ہے۔ واقعات وجود میں آتے ہیں اور وقت کے دریا کی طوفانی لہروں میں ابھرتے ہیں اور غرق ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح واقعات سے وقت کی شناخت ہوتی ہے، خود وقت کی شناخت اور پہچان اس انسان کے کارناموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو ”إني جاعل في الأرض خليفه“ کا بجا طور پر مصداق ہے۔

خلافت الہیہ کا سر پر تاج رکھنے والے انسان کو واقعات کا خالق نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن واقعہ ساز تو کہا ہی جائیگا۔ وہ اپنے خونِ جگر سے واقعات کو اس طرح کی سرفی دیتا ہے کہ وہ کائنات کا جزوی عنوان بن جاتے ہیں۔ یہی وہ انسان ہے جو وقت کی سیل کو روک لیتا ہے اور اپنے علم و فضل کے جلال و جمال سے نئے نئے جہانوں کو آباد کرتا ہے۔

۱۹۰۱ء ایک ایسی ہی شخصیت کے سفرِ حیات کا نقطہ آغاز ہے، جس نے علم کو

اپنے عمل کی سرخی دیکر تابتا کی عطا کی۔ اس سے پہلے کہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی زندگی کے نقوش پیش کئے جائیں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا ایک دھندلا سا عکس پیش کیا جائے کہ آخر تاریخ کے کن حوادث و واقعات سے ہوتے ہوئے کاروانِ وقت ۱۹۰۱ء تک پہنچا۔

۱۸۵۷ء بذاتِ خود ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو اس طرح وجود میں آچکا تھا کہ میر جعفر کی غداری نے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں سرنگوں کر دیا تھا اور ہندوستانی ۱۸۵۷ء میں آپس میں لڑ کر جب پانی پت میں ساری طاقت و توانائی کھو چکے تھے، تو بکسر کے میدان میں انکا متحدہ لشکر جو بھیڑ یعنی مجمع معلوم ہوتا تھا، انگریزوں کی منظم فوجی طاقت کے سامنے شکست کھا گیا۔ ایک ایک کر کے ہندوستان کی دیسی ریاستیں امدادی صلح اور الحاق کی پالیسی کی وجہ سے غائب ہوتی گئیں۔

۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء کے آس پاس وہی مولویوں کا طبقہ جسے متعصب سمجھا جاتا تھا اور جس پر پہلے بھی تنگ نظری کا الزام تھا اور آج بھی ہے، سر سے کفن باندھ کر شمشیر بکف انگریزوں سے نبرد آزما ہوا۔ چونکہ وہ اپنی تاریخ سے باخبر تھا اور یہ زبانی یاد تھا کہ ”شہادتِ معراجِ مومن ہے“ اس لئے اس کے پیشِ نظر سر کٹانے یا سر پر تاج درخشاں رکھنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اور تب وقت کی گرد چھٹی اور چاند، سورج کو شرمادینے والے دورِ روشن نام شاہ محمد اسماعیل، اور سید احمد شہید بریلوی کے ابھرے، جنکے پس منظر میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز وغیرہ کے قلمی جہاد کی تجلیاں تھیں، انہیں صاعقہ بردار شخصیتوں کے قلمی، علمی اور عملی جہاد نے ہندوستان کو ایک نئی شاہ راہ کی طرف متوجہ کیا۔

در اصل علماء اس نکتہ سے بخوبی واقف تھے کہ سیاسی غلامی کا نقطہ آغاز معاشی غلامی ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ بات محسوس کر لی تھی اور انکے

نظریات بڑی حد تک اگر بے تعصبی اور غور و فکر سے پڑھے جائیں تو یہ احساس دلاتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی نظریں جتنا غبار میں چھپے ہوئے ماضی کو دیکھنے کی عادی تھیں اس سے کہیں زیادہ وہ مستقبل کے افق کو دیکھ رہی تھیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے باہمی تعاون کی اہمیت پر زور دیا اور یہ بتایا کہ مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لئے دفاعی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے وہ قوم کا دشمن ہے۔ اسکو ختم ہونا چاہئے، کام کے اوقات محدود کئے جائیں، تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، تاجروں کی غلط قسم کی مسابقت سے روج تعاون کو نقصان نہ پہنچنا چاہئے اور حکومت کو بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہئے۔

جیۃ اللہ البالغہ اور البدور البالغہ میں شاہ صاحب نے جو بحث کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں شاہ صاحب بنیادی حقوق یا Fundamental Rights کا وہ تصور رکھتے تھے جو دور حاضر میں بھی اس حد تک نہیں پہنچ سکا مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، نکاح کرنے کی استطاعت، بچوں کی تعلیم و تربیت بلا لحاظ رنگ و نسل ہر اک انسان کا پیدائشی حق ہے، زبان و تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو ولی اللہی تحریک کے خدوخال اور نقوش کو روشن کرتے ہیں۔

اسی دوران بہت سے حوادث و واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ملک کی سیاسی جہتوں کو بدل دیا اور ہنگامہ خیز صورت پیدا کر دی، ایک طرف مرکزی اور باب حکومت کے درمیان ایرانی اور تورانی امراء میں اختلاف نے زور پکڑ لیا جسکے نتیجہ میں

خانہ جنگی شروع ہوئی تو دوسری طرف صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے۔ جنوبی ہند میں مرہٹوں کی ایک مستقل طاقت بن گئی، دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت قائم ہو گئی اور پھر اودھ کی وزارت بادشاہت سے بدل گئی۔

ان تمام حوادث و واقعات کے باوجود مغل بادشاہ ایک لمحہ بھی اس زخم کو نہیں بھولا جو اسے بکسر کی جنگ میں پہونچا تھا، لیکن کربھی کیا سکتا تھا، ایک طرف انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار تھا تو دوسری جانب ارباب حکومت کی سرد و گرم جنگ، اس سلسلہ میں مولانا محمد میاں لکھتے ہیں کہ:

”مرہٹوں کے سیلاب کو دہلی تک پہونچانے والا نظام الملک آصف جاہ اول تھا جبکہ بنگال و بہار میں ہندوستان کی حکومت ختم ہو کر انگریزی اقتدار بڑھ رہا تھا۔“

تاریخی حالات کے جبر کی بنیاد پر اب جو شیرازہ بندی ہوئی تو ایک طرف انگریز تھے تو دوسری جانب انکے مخالفین جن میں روہیلہ، مراٹھا، حیدر علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں جب دہلی پر قبضہ کیا تو اس طے شدہ پالیسی سے کام لیا ”خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا“۔

ایسے حالات میں ولی اللہی تحریک آگے بڑھتی رہی اور اس کے ہمہ گیر نظریہ کو عوامی تائید حاصل ہوتی رہی، البتہ اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو تاریخی طور پر شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ درست نہیں ہے کہ شاہ صاحب مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کو اٹھانا چاہتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۲۱ دئیقعدہ ۱۱۴۲ھ ۱۷۳۱ء شب جمعہ کو مکہ مکرمہ میں شاہ صاحب نے ضمیر کی آواز سنی کہ:

”ملک و ملت کی فلاح صرف اسی صورت میں ہے کہ دور حاضر کے تمام

نظاموں کی دھجیاں بکھیر دی جائیں اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جائے۔“^۱

دوسری جانب حضرت سید احمد بریلوی اپنے رفقاء کے ہمراہ اصلاح معاشرہ اور ازالہ بدعات کی خاطر پورے ملک کا دورہ کرتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس اصلاحی دورہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”ہندوستان میں توحید، اتباع سنت اور جہاد کے سلسلہ میں سید احمد شہید (۱۲۴۶ھ) کے دوروں کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپکو معلوم ہوگا کہ ہزاروں لوگ شرک و بدعات جیسے گناہوں سے تائب ہوئے، شراب خانے سونے پڑ گئے اور مسجدیں تنگ پڑنے لگیں۔“^۲

ڈاکٹر عابد حسین نے سید صاحب کی تحریک کا سیاسی طور پر یوں جائزہ لیا ہے:

”اس جہاد کا رخ سردست پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا..... سید صاحب کا مقصد اصلی جس کے لئے انہوں نے پنجاب میں افغانوں کی مدد سے مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت قائم کی، یہ تھا کہ اسے صدر کمپ بنا کر انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کریں اور انکو ہندوستان سے نکال کر دم لیں۔“^۳

انگریزوں نے سید صاحب کے ساتھ کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی بلکہ انکی تحریک کی خاموش تائید کی، سید احمد شہید کی تحریک کے سلسلہ میں پروفیسر عزیز احمد انگریزوں کے نرم رویہ کو دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

^۱ علماء ہند کا شاندار ماضی ۲: ۲۶

^۲ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ص ۲۱۶ مولانا ابوالحسن علی ندوی

^۳ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ص ۶۶-۶۷ ڈاکٹر عابد حسین

”سید احمد بریلوی کی تحریک کی تنظیم کے ابتدائی مراحل میں اس سے بے اعتنائی نے شاہ اسماعیل کے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالا اور انہوں نے مذہبی بنیادوں پر برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔“

۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جس نے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کیا، انگریز مورخ لکھتا ہے کہ ”۱۸۵۷ء کا غدر ایک نئے طبقہ کے لئے واضح موڑ بنا۔“ ۲ یہ تاریخی موڑ اس اعتبار سے یادگار ہے کہ بہادر شاہ اول پسر اورنگ زیب کے بعد ہندوستان نے مرکزیت کھودی تھی اور انگریزوں کے قدم پورے ملک میں جننے لگے تھے، اسی دوران ہندوستانیوں نے غاصبانہ انگریزی تسلط کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے ایک عظیم مہم چلائی جو ۱۸۵۷ء کی ”جنگ آزادی“ کی شکل میں رونما ہوئی، اور نوے سال بعد ۱۹۴۷ء میں کامل طور پر اس طرح بار آور ہوئی کہ ۱۸۵۷ء میں جو طبقہ تحریک آزادی میں غالب تھا وہ متعدد وجوہ سے مغلوب ہو چکا تھا۔ موضوع سے غیر متعلق ہونے کی بناء پر غدر کے تفصیلی حالات سے گریز کیا جاتا ہے، البتہ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اس نازک موقع پر مسلم علماء نے جہاد بالقلم اور جہاد بالسیف دونوں فرض ادا کئے۔ مشہور شخصیتیں جو اس موقع پر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئیں، ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولوی احمد اللہ شاہ، مفتی صدر الدین آزر دہ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر مولانا نانوتوی نے باقاعدہ شاملی کے محاذ پر ایک مجاہد کی حیثیت سے فرن شمشیر زنی کا مظاہرہ کیا۔

مولانا قاسم نانوتوی ۱۲۳۸ھ میں ضلع سہارنپور کے نانوتہ نامی مقام پر پیدا

۱۔ ہندوپاک میں اسلامی کلچر ص ۳۲۵ پروفیسر عزیز احمد ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۔ A History Of India Vol.II.P.167 -Percival Spear

ہوئے، اور گیارہ سال کی عمر میں مولانا مملوکِ اعلیٰ کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ وہاں ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حدیث شاہ عبدالغنی دہلوی سے پڑھی، اور بیعت و سلوک کا رشتہ حاجی امداد اللہ مکی سے رکھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے کتب خانوں میں تصحیح کا کام شروع کیا۔ اسی دوران بخاری شریف کے آخری کچھ پاروں پر حاشیہ بھی لکھا۔ مولانا نے عیسائیوں سے مناظرہ بھی کیا اور علمی و عقلی دلائل سے حریف کو شکست فاش دی۔ اس سلسلہ میں ’میلہ خدا شناسی‘ میں مسئلہ توحید پر ایک زبردست تقریر اور رڑ کی کا ایک لکچر جو قبلہ نما کے نام سے مشہور ہوا، ایک تاریخی یادگار ہیں۔

مولانا نانوتوی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے، انگریزوں کے سامنے سپر انداز نہ ہوتے ہوئے اس شمع کو روشن رکھا جو آزادی کے لئے جلائی گئی تھی۔ شامی کی شورش کے بعد ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو صرف درسیات والا مدرسہ نہ تھا بلکہ مدرسہ فکر و تبلیغ بھی تھا۔ مدرسہ کے قیام کے سلسلہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

”۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جسکے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔“ ۱

مولانا نانوتوی کو وطن عزیز سے بیحد محبت اور فرنگیوں سے سخت نفرت تھی انہوں نے ”اپنے مریدوں کو سرکاری امداد قبول کرنے سے منع کیا۔“ ۲ لیکن انگریزی زبان کی تعلیم کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ مولانا نانوتوی ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ء کو دیوبند ہی میں ۴۹ سال کی عمر میں بعارضۃ ضیق النفس انتقال فرما گئے۔

۱۔ سوانح قاسمی ۲: ۲۲۶ مولانا مناظر احسن گیلانی
۲۔ انقلاب اٹھارہ سو ستاون ص ۱۰۴ مرتبہ: پی سی جوشی

سر سید نے جو سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے مولانا سے اختلاف رکھتے تھے، مولانا کی وفات پر ایک تعزیتی نوٹ لکھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید مولانا کے ذاتی کمالات کے معترف تھے۔ اس نوٹ کی چند سطر میں پیش خدمت ہیں:

”لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق کے کوئی شخص انکی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والی نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے..... انکا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا..... درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے..... دیوبند کا مدرسہ انکی نہایت عمدہ یادگار ہے۔“

صدر کی تاریخ لکھنے والوں میں پنڈت سند رلال، خلیق احمد نظامی، خواجہ حسن نظامی، براہ راست ماضی کے طور پر منشی منیر شکوہ آبادی، مرزا غالب دہلوی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ بے شمار ڈاکریوں، روزناموں، فرامین اور خودنوشت سوانح عمریوں، اور بعض شعری تخلیقات سے بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے، بالخصوص اب تو غالب کی دستنویز کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ غرض کہ دو برس میں پورا ہندوستان مجروح اور زخموں سے چور ہوا تھا تو مسئلہ یہ تھا کہ اب کیا کریں، حکومت چھین گئی تھی، اقتدار ہاتھ سے نکل گیا تھا، اور ایک خوف و انتقام کی تلوار تھی جو لٹک رہی تھی۔

جیسے جیسے انگریز ہندوستانی عوام پر ظلم و زیادتی کر کے انہیں اپنے زیر اقتدار رکھنے کی کوشش کرتے، ویسے ویسے ہندوستانیوں میں وطنیت اور قومیت کے جذبات

۱۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے ص ۲۲۸-۲۳۲ مولانا اسیر اوروی

کی ترقی ہوتی رہی، جسکے نتیجہ میں مختلف سیاسی پارٹیاں اور تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ان میں ایک نمایاں نام 'انڈین نیشنل کانگریس' کا ہے، یہ تنظیم اے. او. ہیوم کی کوششوں سے ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی، انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی گوگل داس تیج ہال سنسکرت کالج میں ہوا، جس کے صدر ڈبلیو سی. بھرجی منتخب ہوئے۔

۱۷ شوال ۱۲۶۲ھ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مقام بالا کوٹ میں مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا نور اللہ، میر مقصود علی جیسی برگزیدہ ہستیوں کی قیادت کا آغاز ہوتا ہے۔ ان شخصیتوں نے وہ فضا بنائی تھی اور اس ذہن کی تعمیر کی تھی جو فرنگی سے تعاون کے بجائے تصادم کا قائل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے تصادم کی مختلف شکلیں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں رونما ہوئیں۔ انہیں کی ایک کڑی مولانا محمود حسن دیوبندی کی قیادت میں اس خفیہ تحریک کا آغاز تھا جسے "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے شہرت ملی، یہ تحریک اس لئے شروع کی گئی تھی کہ ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے اور خلافت مرکزیہ و بلاد اسلامیہ کو تباہی سے بچایا جائے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ترک فوجی افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملہ کریں گے اور اندرون ملک مسلمان بغاوت کر کے انگریزوں سے ملک آزاد کرائیں گے۔ ۳

تحریک ریشمی رومال کا باقاعدہ آغاز یوں ہوا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کا بل

۱۔ بھارتیہ سوتنتر تانڈولن کا اتہاس حصہ دوم ص ۲۸۴ تاریخچند مترجمہ: منمنہ ناتھ گپت،

The History of the Indian National Congress Volume 1

(1885-1935) p18, Dr. Pattabhi Sita Ramayya

۲۔ تحریک خلافت ص ۴۲ قاضی عدیل عباسی

۳۔ مضمون بعنوان "ریشمی رومال" کرائقی کمار ماہنامہ نیادور جنوری ۱۹۷۷ء ص ۵۰

روانہ کئے گئے، تاکہ افغانستان سے فوجی امداد حاصل کی جاسکے۔ اس کے بعد خود شیخ الہند مولانا محمود حسن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز کے لئے روانہ ہو گئے۔ حجاز پہنچ کر ترکوں کے گورنر غالب پاشا سے مل کر تین تحریریں حاصل کیں، پہلی تحریر مسلمانان ہند کے نام تھی۔ ۲۔ دوسری تحریر مدینہ کے گورنر کے نام تھی کہ وہ حضرت شیخ الہند کی انور پاشا سے ملاقات کرادیں۔ ۳۔ اور تیسری تحریر انور پاشا کے نام تھی کہ وہ مولانا کے مطالبات پورے کریں۔ ۴۔ پہلی تحریر جو مسلمانان ہند کے نام تھی 'غالب نامہ' سے معروف ہوئی۔

ترکی افغانستان معاہدہ کا سارا مضمون مولانا عبید اللہ سندھی اور نصر اللہ خاں نے ایک پیلے رنگ کے ریشمی رومال پر کڑھوا لیا جو ایک گز مربع تھا۔ ۵۔ مولانا نے کابل سے ایک خط ریشمی رومال پارچہ پر لکھ کر شیخ عبدالحق کے ہاتھ شیخ عبد الرحیم سندھی کے پاس بھیجا تھا کہ وہ اسے خود یا کسی معتمد علیہ کے ذریعہ حضرت شیخ الہند کو پہنچا دیں۔ لیکن یہ تحریر کسی طرح سے پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈائر کے پاس پہنچ گئی، جس سے مولانا عبید اللہ سندھی اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے کچھ اہم راز معلوم ہو گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کو بھی مکہ معظمہ میں گونا گوں حوادث سے گزرتے ہوئے گرفتاری و نظر بندی قبول کرنی پڑی۔

اس طرح وہ فضا، وہ ماحول اور وہ تناظر سامنے آ جاتا ہے جسمیں شخصیتوں نے اپنی عظمت کی تاریخ اپنے خون دل سے لکھی اور ایک راستہ بتا گئے کہ سر بلندی و عظمت انہیں کے نقش قدم پر چل کر حاصل ہو سکتی ہے۔ عالمی اور ملکی سطح پر مسلمان جس

۱۔ تاریخ دیوبند ص ۲۲۶-۲۲۷ سید محبوب رضوی

۲۔ ۳۔ ۴۔ نقش حیات ۲: ۲۱۳ مولانا سید حسین احمد مدنی

۵۔ مضمون "ریشمی رومال" کرائی کمار نیا دور جنوری ۱۹۷۷ء ص ۵۵

کشاکش کا شکار تھا اس کا اندازہ اقبال کی 'طلوع اسلام' پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔

مگر اس دور بلاخیز میں وہ لوگ جو ریشمی رومال تحریک کے نتیجہ میں پیش آنے والی پریشانیاں جھیل چکے اور قید فرنگ کے مزے چکھ چکے تھے، وہ بدلتے ہوئے عالمی حالات کے، اور ملک کے سیاسی خلفشار کے، خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے جب پہلی جنگ عظیم اپنے اختتام تک پہنچی اور ترکوں کی شکست تقریباً یقینی ہو گئی تو مسلمانوں نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر 'خلافت تحریک' شروع کی جس کا مقصد ترکی میں خلافت کو برقرار رکھنا تھا۔ حالانکہ مشہور مؤرخ جم میسلاس کے خیال میں "گاندھی جی اس طرح اپنی ستیاگرہ کی بنیادوں کو مضبوط بنا رہے تھے۔"

مسلمانوں میں خلافت تحریک کے سلسلہ میں سب سے اہم نام مولانا محمد علی جوہر کا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس، خلافت کانفرنس، جمعیتہ العلماء، اور مسلم لیگ کا اجلاس ساتھ ساتھ امرتسر میں منعقد ہوا۔ ۲ خلافت کانفرنس کے اجلاس میں یہ طے ہوا کہ مولانا محمد علی کی قیادت میں ایک وفد خلافت کے سلسلہ میں اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے یورپ بھیجا جائے۔ ۳ چنانچہ فروری ۱۹۲۰ء میں ایک وفد لندن روانہ ہوا، اس وفد کے صدر مولانا محمد علی جوہر اور ارکان سید سبط حسین، مولانا سید سلیمان ندوی، ابوالقاسم اور سکریٹری جناب حسن محمد حیات منتخب ہوئے۔ ۴ اس وفد نے انگلستان پہنچ کر مسٹر فشر، سر ولیم ڈیوک، مسٹر جے ای شک برگ اور مسٹر ایس کے براؤن سے ملاقات کی اور اپنے مطالبات رکھے۔ ۵ لیکن افسوس کہ نتیجہ میں مایوسی ہی ہاتھ لگی۔

۱ Nationalism On The Indian Subcontinent .P.133.-Jim Masselos

۲ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ص ۱۱۰ ڈاکٹر عابد حسین

۳ ایضاً ص ۱۳۰

۴ مولانا محمد علی کی یاد میں ص ۱۱ سید صباح الدین عبدالرحمن

۵ ایضاً ص ۱۲

شیخ الہند مولانا محمود حسن متوفی ۱۹۲۰ء بھی خلافت کمیٹی سے منسلک ہو گئے۔
خلافت تحریک کے سلسلہ میں شیخ الہند کی اختتامی تحریر سے انکی رائے کا علم ہوتا ہے جو
جمعیتہ علماء ہند کے اجلاس میں پڑھی گئی:

”حق تعالیٰ شانہ نے کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق

سے آپکے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنادیا، اور میں ان دونوں

قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور منجج سمجھتا ہوں.....“

یہ وہ خطوط ہیں جنکے سہارے ہندوستانی سیاست آگے بڑھتی رہی۔ آگے چل
کر ہندوستانی تاریخ میں کتنے موڑ آئے؟ کتنے حوادث و واقعات رونما ہوئے اور
انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے میں کتنی جدوجہد برداشت کرنی پڑی؟ یہ ایسے سیاسی
نکات ہیں جو خود ایک عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ سیاست ہمارا موضوع نہیں
اس لئے ان سے گریز کیا جاتا ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیاسی عوامل ثقافتی اور تعلیمی محاذ پر بھی
اثر انداز ہوئے تھے۔ چاہے یہی بات یوں کہی جائے کہ ثقافتی اور تعلیمی حالات نے
سیاست کو متاثر کیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے تعلیمی محاذ پر جو
روش اختیار کی گئی اور جو بعد میں مختلف رجحانات کی نمائندہ بنی، اسکی جھلکیاں دیکھی
جاسکتی ہیں۔ ان ہنگامی حالات میں دو شخصیتیں ایسی ابھریں جنہوں نے سیاسی اور
تعلیمی دونوں محاذ پر کام کیا۔ دونوں کے مقاصد ایک تھے مگر طریقہ کار میں بعد المشرقین
تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

”دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم اور سرسید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم علی

گڑھ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے لیکن ان دونوں قائدوں کی سیرت

وطبیعت میں بعد المشرقین تھا۔ سرسید مسلمانوں کے طبقہ امراء و اشراف کی بہترین روایات کے وارث تھے تو مولانا محمد قاسم طبقہ علماء و زہاد کی بہترین صفات کے حامل تھے۔^۱

عام طور پر یہ سمجھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ جناب سرسید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک استاد مولانا مملوک العلّی کے شاگرد تھے، جیسا کہ ابھی ذکر عابد حسین کی تحریر میں دیکھا گیا۔ ”یہ روایت و اطلاع صحیح نہیں اور معتبر ثبوت کی محتاج ہے۔“^۲

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء میں بروز جمعرات دیوبند مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اس کے پہلے معلم بھی محمود تھے اور معلم بھی محمود۔ گزشتہ صفحات میں اس مدرسہ کے قیام کی وجہ تحریر کی جا چکی ہے، اور اس سلسلہ میں شیخ الہند کا بیان بھی درج کیا جا چکا ہے۔ مولانا نانوتوی نے اس مدرسہ کو اپنے خون جگر سے یوں سینچا کہ اس چھوٹے سے مدرسہ نے دنیا کی ایک عظیم ترین دانشگاه کی حیثیت اختیار کر لی۔ دارالعلوم دیوبند ایک ایسا سرچشمہ علم و آگہی ثابت ہوا جس سے ساری دنیا کے لوگوں نے علمی و دینی پیاس بجھائی۔ مولانا نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کے قواعد و ضوابط کو ترتیب دیتے ہوئے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا کہ مادی مصلحتوں پر روحانی مصلحتوں کو ترجیح حاصل ہو، چنانچہ انکا عقیدہ یہ تھا کہ دارالعلوم کی جب تک غیر مستقل آمدنی رہے گی اس وقت تک یہ توکل علی اللہ کے سہارے چلتا رہے گا اور جہاں اسکی آمدنی مستقل ہوئی تو پھر اندیشہ ہے کہ امداد بھی موقوف ہو جائے۔^۳

۱۔ ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ص ۶۸

۲۔ ترجمان دارالعلوم ج: ۱۰، ص ۵۱

۳۔ سوانح قاسمی ۲: ۲۲۲

جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو ہندوستان میں تین علمی مراکز تھے۔ دہلی جہاں حدیث و تفسیر پر زیادہ توجہ تھی۔ دوسرا علمی مرکز لکھنؤ تھا جہاں کے علماء پر فقہ اور اصول فقہ کا رنگ غالب تھا۔ اور تیسرا مرکز خیر آباد تھا جہاں منطق اور فلسفہ پر زیادہ زور تھا۔ دارالعلوم نے ان تینوں مراکز کے موضوعات کو شامل کر کے ایک جامع نصاب مرتب کیا اور انہیں تین کی بنیاد پر علوم دینیہ، حدیث و قرآن، فقہ و تصوف اور حکمت و کلام کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی خدمت انجام دی۔

چونکہ دارالعلوم دیوبند فقہ و حدیث کے مرکز کی طرح قائم رہا اور اس پر انہیں دونوں علوم کا گہرا اثر رہا اسی لئے وہاں کے فضلاء نے ہر دور میں ان مضامین کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اس جانفشانی و جاسوزی سے اس میدان میں کام کیا کہ فقہ و حدیث کی تاریخ انکے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کی جائے گی۔ ان فضلاء میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا یوسف بنوریؒ وغیرہ ممتاز رہے ہیں۔ دارالعلوم کے بارے میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

”دین کو مضبوطی سے پکڑے رہنا، حنفی مسلک پر پختگی سے کار بند رہنا، اسلاف کی روایات و اقدار کی حفاظت، اور سنت کا دفاع دارالعلوم کا شعار ہے۔“

اسی طرح اعلاء کلمۃ اللہ، حفاظت دین، اور اشاعت علم کا ایک عظیم مرکز ”مظاہر علوم سہارنپور“ ہے۔ اس مدرسہ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اسکا سنگ بنیاد یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ ۹ نومبر ۱۸۶۶ء بروز جمعہ رکھا

۱۔ المسلمون فی الہند ص ۱۰۵ مولانا ابوالحسن علی ندوی

گیا۔ اس کے بانیوں میں فقیہ العصر حضرت مولانا محمد سعادت علی سہارنپوری، محدث کبیر حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہم تھے۔ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم اور منہج تقریباً ایک ہی ہے۔ اس مدرسہ نے حدیث، فقہ اور علوم و فنون کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

لسانی تفریق کی وجہ سے سرسید نے پہلے ۲۲ دسمبر ۱۸۷۰ء میں ’تہذیب الاخلاق‘ جاری کیا۔ اس رسالہ کے اجراء کے ساتھ ہی سرسید جب ولایت سے واپس آئے تو مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کے قیام میں مصروف ہو گئے، چنانچہ انہوں نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء میں ”محمدن اینگلو اورینٹل کالج“، علی گڑھ میں قائم کیا، جس کا افتتاح سرولیم میور نے کیا۔ اس کالج نے ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔

سرسید کی ”تحریک علی گڑھ“ کا مقصد مسلمانان ہند کو مایوسی و قنوطیت سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کی اشاعت تھی؛ تاکہ مسلمان جو اقتصادی اعتبار سے نسبتاً کمزور تھے، تعلیم کے ذریعہ ملازمتیں حاصل کر کے اپنی اقتصادی پوزیشن مضبوط کریں، اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ زندگی کی مسابقتی دوڑ میں آگے بڑھیں۔ اس یونیورسٹی نے پسماندگی کی طرف تیزی سے ڈھلکنے والے مسلم معاشرہ کو کافی حد تک سنبھالا اور اسے حیات نو عطا کی۔ مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے فضلاء نے مسلمانوں کی زندگی کے ارتقاء اور ملک کی سیاست میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اور اسی یونیورسٹی سے ہندو قومی تحریک کے بالمقابل مسلم قومی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔

ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ایک اہم ادارہ ”جامعہ ملیہ اسلامیہ“ دہلی ہے، جس کی بنیاد مولانا محمد علی جوہر نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی تھی۔

اس یونیورسٹی کی تاسیس اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ شیخ اکرام کے لفظوں میں یہ یونیورسٹی ”سرسید کے خواب کی تعبیر ہے۔“ اس یونیورسٹی نے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا۔ اس کے ارباب اقتدار میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، پروفیسر مشیر الحق وغیرہ بہت معروف ہوئے۔ تہذیب و ثقافت اور علم و ادب میں اس کا خاص مقام ہے۔

ہندوستان کی ایک اہم تعلیمی تحریک اور ایک عظیم درس گاہ ”ندوۃ العلماء“ کا قیام ۱۸۹۳ء میں عمل میں آیا۔ اس کے مقاصد درج ذیل تھے:

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

۳۔ اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

ندوہ کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تکمیل مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری نے کی۔ عربی زبان و ادب کی خدمت اس جامعہ کا امتیازی وصف ہے۔ ندوہ کی تحریک کو ترقی دینے والوں میں علامہ شبلی نعمانی بہت نمایاں رہے۔ اور اس کے قابل فخر اساتذہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا نام روشن ستارہ کی طرح جگمگاتا رہے گا، اسی طرح مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، سید نجیب اشرف قابل فخر فرزندوں میں ہیں۔ معاصر دور میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کو

کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام درسگاہوں اور دانشگاہوں کے پس منظر میں ایک علمی، دینی، فکری، اور ثقافتی تحریک بھی تھی۔ مثلاً علی گڑھ کے پیچھے سرسید کی تحریک کارفرما تھی۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں ولی اللہی تحریک کا سلسلہ 'قاسمیت' سے بڑھ کر 'مدنیت' تک پھیلا ہوا تھا۔ ندوہ کے قیام میں اصلاح نصاب کی فکر نمایاں تھی۔ علامہ شبلی کی سرپرستی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی کی علمی و دینی خدمات نے اس کا نام روشن کیا اور اسے مرتبہ اور وقار بخشا۔

لیکن جیسے جیسے علمی، ثقافتی اور اصلاحی تحریکات بڑھ رہی تھیں اور انہیں مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی، ویسے ویسے نئے نئے فتنے بھی وجود میں آرہے تھے۔ انہوں میں ہی طرح طرح کے اختلافی مسائل پیدا ہو رہے تھے اور اختلافات اس حد تک پہنچ گئے کہ نئے مسلک وجود میں آئے۔ ان مسالک میں ایک اہم نام "غیر مقلدیت" کا تھا۔

سید احمد بریلوی، شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے بدعات و خرافات کی روک تھام کی خاطر اور شیعیت کے خلاف ملک گیر جوہم چلائی تھی، اسے جگہ جگہ ترقی مل رہی تھی اور مسلمانوں پر اس کے بے حد اہم اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ضرورت یہ تھی کہ اسے آگے بڑھایا جاتا لیکن خانوادہ ولی اللہی کے ہی ایک فیض یافتہ میاں نذیر حسین نے ایک نئے مسلک کی تبلیغ شروع کی۔ ہندوستان میں میاں نذیر حسین کو ہی غیر مقلدیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک نے میاں نذیر حسین اور نواب صدیق حسن خان کے زیر سایہ زور پکڑا یہاں تک کہ انکا اور انکے شاگردوں کا مشغلہ ہی بدعات و خرافات کو روکنے کے بجائے ردِ حقیقت ہو گیا۔ حدیث و فقہ میں عدم تقلید کا رجحان پیدا

ہوا، اور انہوں نے احناف کو چیلنج کرنا شروع کیا۔

دیوبند کا مسلک وہی رہا جو حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز کا تھا کہ حدیث کے بعد فقہ واجتہاد کی اہمیت کے پیش نظر فقیہ امت حضرت امام ابوحنیفہ کو امام تسلیم کیا جائے۔^۱ لچنانچہ اہلحدیث حضرات کے جواب میں شیخ الہند، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شوق نیوی، علامہ عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی نے حنفیت کی تائیدی حدیثوں کی اشاعت کی۔ علامہ عثمانی کی تصنیف ”فتح الملہم“ حنفی نقطہ نظر سے صحیح مسلم شریف کی پہلی شرح ہے۔^۲ اور پھر حدیث کے پورے ذخیرے خصوصاً غیر مطبوعہ حصے کی تحقیق کا خیال ہوا، جسے ہندوستان سے باہر علامہ زاہد الکوثری اور شیخ ابو نعیم نے، اور ہندوستان میں مولانا عبداللہ فرنگی محلی، مولانا شوق نیوی، علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا ظفر احمد تھانوی اور پھر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے عملی شکل دی۔

اتر پردیش کا ایک ضلع جو صرف اپنے نام ہی میں اعظم نہیں، اپنے کاموں کے ذریعہ بھی عظیم ہے۔ اس سرزمین سے ایسے غواص معانی اٹھے جن کے لئے ہر بحر پر آشوب پایاب تھا۔ ایک دور افتادہ گاؤں بندول کا شبلی نعمانی اپنے قلم کی توانائی سے یہ بتا چکا تھا کہ علم دلی اور لکھنؤ کی میراث اور جاگیر نہیں۔ کوئی خطہ ہو، کوئی گوشہ ہو، جس طرح شعاع آفتاب سے ذروں میں چمک پیدا ہوتی ہے اسی طرح معمولی جگہوں پر بھی اہل دانش و بینش وجود میں آسکتے ہیں۔

ایسے سیاسی اور علمی ماحول و فضا میں اسی سرزمین سے ۱۹۰۱ء میں ایک اور بندہ خدا وجود میں آیا جو آگے چل کر اپنی صدی کی علمی جلالت کی علامت بن گیا۔

۱۔ مسلک علماء دیوبند ص ۷ قاری محمد طیب

۲۔ تاریخ دیوبند ص ۵۰۲-۵۰۳ محبوب رضوی

راقم الحروف کی نظر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مَنو نا تھ بھنجن اب اعظم گڈھ سے الگ ایک با اختیار ضلع ہو گیا ہے، وہ کمشنری ہو جائے، وہ اتر پردیش کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز بن جائے، لیکن اہل علم کی نظر میں اسکی پہچان صرف یہی ہے کہ علامہ شبلی کے بعد یہاں ایک اور اسلامی اسکالر اور محقق پیدا ہوا تھا، جس نے حدیث نبوی کے نایاب خزانوں کو وقف عام کر دیا اور علم و تحقیق کا معیار بلند کر دیا۔

آئندہ صفحات میں پہلے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی حیات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ انکی علمی شخصیت کے خدو خال زیادہ نمایاں ہو سکیں، پھر اس کے بعد ان کی علمی تحقیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم

سوانح حیات

باب دوم سوانح حیات

ولادت اور نام و نسب

مولانا حبیب الرحمن بن صابر بن عنایت اللہ بن خوشحال، مشرقی اتر پردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک معروف اور قدیم قصبہ منونا تھہ بھنبھن میں ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ راقم سطور کو تاریخ پیدائش اور مہینہ کی تعیین دریافت نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے مولانا کی سوانح میں تخمینہ اور یادداشت کی بنیاد پر ولادت کا مہینہ جمادی الاخریٰ لکھا ہے۔ غالباً انہیں بھی تاریخ اور مہینہ کے بارے میں کوئی متیقن یا معتبر بات کا پتہ نہ چل سکا۔ شیخ عبداللہ عراقی نے تاریخی نام 'انتر حسن' رکھا۔ ۳ کنیت 'ابوالماثر' تھی اور امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے خود کو 'الاعظمی' لکھتے تھے۔

تحریری شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً یہ خاندان منو کے قریب "ادری"۔

۱۔ اعظم گڑھ اور چریاکوٹ کے بیچ میں منو واقع ہے، یہ قصبہ شہزادی جہاں آراہت شاہ جہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا شاہی نام جہان آباد تھا۔ یہ نام شاہی فرامین میں موجود ہے۔ (حیات شاہی ص ۵۷ سید سلیمان ندوی)

۲۔ حیات ابوالماثر ص ۸۳ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

۳۔ ایضاً

نام کے ایک قصبہ میں آباد تھا بعد میں منقول ہوا۔ مولانا خود تحریر فرماتے ہیں کہ:
 ”خوشحال جد پدر من از اداری انتقال مکان کردہ بمو آمد و در محلہ
 پٹھان ٹولہ اقامت کرد۔“ ۱

اس طرح یہ خاندان منو میں ہی آباد ہو گیا۔

مولانا الاعظمیٰ کی نشوونما ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں دولت و ثروت
 کا دور دور تک پتہ نہ تھا، مادی وسائل تک رسائی نہ تھی دنیاوی عیش تو کیا، ضروریات
 زندگی بھی بڑی مشکلوں سے پوری ہو پاتیں۔ مگر اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس
 خاندان میں دینداری، زہد و تقویٰ جیسی عظیم دولت و دیعت کی تھی۔ مولانا کے والد
 ماجد مولانا محمد صابر صاحب نہایت عابد، زاہد اور دیندار شخص تھے۔ قرآن مجید سے
 خاص شغف تھا، کثرت سے تلاوت فرماتے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے
 بیعت تھے۔ مولانا حبیب الرحمن قاسمی مولانا صابر صاحب کے بارے میں تحریر
 فرماتے ہیں:

”تقریباً ۳۶ سال تک اپنے محلے کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو فارسی اور
 دینیات کی تعلیم دیتے رہے، اس طویل مدت میں ایک کثیر جماعت نے
 آپ سے استفادہ کیا۔“ ۲

تعلیم و تربیت

مولانا الاعظمیٰ نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں اسکی فضا علم و دین سے
 معمور تھی، ظاہر ہے ایسے ماحول میں تعلیم و تربیت پر خاص توجہ اور اسکا اہتمام ایک
 ۱۔ حیات ابوالآثر ص ۷۶

۲۔ ضمیمہ تذکرہ علماء اعظم گڑھ ملاحظہ ہو۔ مولانا حبیب الرحمن قاسمی

لازمی امر تھا، چنانچہ والد محترم نے اس کا خاص لکھم کیا اور قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں خود پڑھائیں۔ تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق پہلی بھتیجی کے پاس پڑھا اور اسے زبانی یاد کر لیا۔ مولانا عبدالرحمن مٹوی کے پاس فارسی کی دیگر کتابیں پڑھیں۔ مولوی عبدالعزیز مٹوی اور ایک دوسرے مولانا محمد صابر صاحب (ساکن محلہ بلاتی پورہ مٹو) سے عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

گھر ملو اور ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا ابوالحسن عراقی کی خدمت میں پہنچے اور صرف و نحو کی مختلف کتابیں آپ سے پڑھیں، یہیں رہ کر صرف و نحو میں ٹھوس اور پختہ صلاحیت پیدا کی۔ مزید حصول علم کی خاطر مولانا عبدالغفار صاحب مٹوی جو اس دور میں علم و فن کے سرچشمہ سمجھے جاتے تھے، کی خدمت میں مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں حاضر ہوئے، مولانا الاعظمی اس سلسلہ میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

”۱۹۱۶ء میں..... میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مٹوی کے ساتھ گورکھپور چلا گیا اور اپنے مناسب حال درسی نظامی کی کتابوں میں شامل ہو گیا۔“

۱۹۱۷ء میں جب مولانا عبدالغفار صاحب بنارس منتقل ہوئے تو مولانا الاعظمی بھی مدرسہ مظہر العلوم بنارس جا پہنچے اور اکتساب فیض میں مصروف ہو گئے۔ مولانا نے مولانا عبدالغفار صاحب سے ادب، بلاغت، فقہ، اور حدیث میں مشکوٰۃ شریف اور ترمذی نصف اول تک پڑھی۔ مظہر العلوم بنارس میں قیام کے دوران اس زمانہ کے سخت ترین امتحان جو الہ آباد بورڈ کی طرف سے منعقد ہوتے تھے ملا ۱۹۱۸ء اور ملا فاضل مارچ ۱۹۱۹ء میں شریک ہوئے اور دونوں امتحانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

مولانا اعظمی دارالعلوم دیوبند میں | مزید علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے لئے مولانا نے دیوبند کا رخ کیا، مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:

”شوال ۱۳۳۳ھ غالباً جولائی ۱۹۱۹ء میں میں نے دارالعلوم میں پہلی بار داخلہ لیا۔“ ۱

مگر کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ دیوبند میں فصلی بیماری پھیل گئی، اس بیماری نے اس قدر زور پکڑا کہ پورا شہر اسکی زد میں آ گیا۔ لازماً مولانا بھی اسکے شکار ہوئے اور دوران سال ہی دیوبند سے واپس ہونا پڑا۔ جیسا کہ مدارس کے طلبہ میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ دیوبند پہنچ کر براہ راست وہاں کے علمی و روحانی چشموں سے سیراب ہوں، اسی طرح کی خواہش اور شوق مولانا الاعظمی میں دوبارہ دیوبند جانے کا داعیہ پیدا کر رہا تھا، آخر کار ایک بار پھر رخت سفر باندھا اور ۱۳۳۹ھ میں دوبارہ دیوبند کے لئے نکل کھڑے ہوئے، اس مرتبہ امتحان داخلہ میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور دارالعلوم میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔

لیکن مقدر کچھ اور ہی تھا۔ اس سال بھی بخار آ گیا، دوسری طرف تحریک ”ترک موالات“ کا بھی پورے ملک میں زور تھا، چنانچہ اس سال بھی آپ کو وطن لوٹ آنا پڑا۔ مولانا اسکا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان حالات سے والد صاحب بہت مشوش اور پریشان تھے، چاہتے تھے کہ واپس ہو جاؤں، اسی اثناء میں مجھے اس سال بھی بخار آ گیا والد صاحب نے اطلاع ملتے ہی لکھ بھیجا کہ تم مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ، چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں میں چلا آیا۔“ ۲

دورۂ حدیث | دارالعلوم دیوبند سے واپسی پر اپنے ہی قصبہ کے قدیم مدرسہ دارالعلوم مکو میں دورۂ حدیث شریف میں داخلہ لیا، اس وقت دارالعلوم میں حضرت شیخ الہند کے مایہ ناز شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلی شیخ الحدیث و صدر مدرس کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ نے دورۂ حدیث کی تکمیل مولانا سنبھلی ہی کے پاس کی اور ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں سند فراغ حاصل کی۔

اسناد حدیث | دینی و اسلامی علوم و فنون میں سند کی اہمیت کے پیش نظر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا الاعظمی کی سندوں کو ذکر کر دیا جائے کہ کن طرق سے ان تک علم حدیث پہونچا۔ مولانا صحیح بخاری کی سند خود بیان فرماتے ہیں کہ:

”صحیح بخاری میں“ نے حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی سے انہوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے، انہوں نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے، انہوں نے مولانا عبد الغنی مجددی سے، انہوں نے حضرت شاہ محمد اہلق صاحب سے، شاہ محمد اہلق صاحب نے شاہ عبد العزیز صاحب سے اور شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنے والد شاہ ولی اللہ صاحب سے پڑھی یا سنی۔“ ۱

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کو صحاح اور دیگر کتب حدیث کی اجازت آپ کے مشفق استاذ محترم حضرت مولانا عبد الغفار صاحب سے بھی حاصل تھی۔ وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مولانا الاعظمی اس سند کا ذکر

۱۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم بن حسن کردی مدنی سے اجازت حاصل ہے، تفصیل کے لئے حضرت شاہ صاحب کی الارشاد الی مہمات الاسناد، حضرت شاہ عبد العزیز کی العجالة النافعة اور شیخ محسن ترہتی کی الیانع الجنی ملاحظہ ہو۔

اجمالیوں کرتے ہیں:

”وقد أجازني الشيخ المذكور مولانا عبد الغفار مشافهة بجميع ما تصح له روايته عن شيوخه مولانا رشيد احمد الكنكوهي ومولانا أشرف علي التهانوي ومولانا عبد الحق وغيرهم رحمهم الله عن كتب الصحاح والجوامع والسنن والمسانيد والمسلسلات وغيرها من مجاميع الحديث والأوراد والأذكار وغيرها.“

(مجھ کو مولانا عبد الغفار صاحب نے جتکو مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عبد الحق وغیرہ سے اجازت حاصل تھی، کتب صحاح، جوامع، سنن، مسانید، مسلسلات وغیرہ کے ساتھ حدیث اور اوراد و اذکار کے دیگر مجموعوں کی زبانی اجازت دی۔)

مذکورہ بالا سندوں کے علاوہ مولانا الاعظمیٰ کی ایک اور سند ہے۔ آپ کو مولانا عبد الرحمن صاحب بھوپالی کے واسطے سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے، مولانا عبد الرحمن بھوپالی مولانا عبد القیوم صاحب کے شاگرد تھے اور مولانا عبد القیوم صاحب حضرت شاہ محمد اختر صاحب دہلوی کے شاگرد ہیں اور حضرت شاہ صاحب کی سند مشہور ہے۔ چنانچہ یہ سند مذکورہ دونوں سندوں سے عالی ہوئی۔

اساتذہ

مولانا حبیب الرحمن الاعظمیٰ کو جن اساتذہ اور اہل علم سے استفادہ کا موقع ملا وہ نادرہ روزگار شخصیات تھیں۔ ہر ایک علم و فن کا امام اور مرجع خلافت تھا، جی چاہتا ہے

۱۔ رسالہ الاول ص ۳۳ شیخ محمد سعید بن سنبل کی

کہ علوم و فنون کی بساط پر تابندہ نقوش چھوڑنے والی ان شخصیات کا ذکر اختصار کے ساتھ ہی سہی مگر ضرور ہو؛ تاکہ بخوبی یہ اندازہ ہو سکے کہ مولانا کی ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت کیسے ماحول اور کن لوگوں کے ہاتھوں ہوئی، چنانچہ ان اساتذہ کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالغفار عراقی مئوی ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت مئو میں ہوئی، حصول علم کے لئے آپ کا پہلا سفر ”نوانگر“ ضلع بلیا کا ہوا۔ مزید علم کی پیاس بجھانے کے لئے غازیپور، مرزاپور اور لکھنؤ کا سفر کیا۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض اللہ مئوی، شیخ عبدالحق الہ آبادی، مولانا امام الدین پنجابی تھے۔ علم حدیث حاصل کرنے کے لئے مولانا عبدالحق فرنگی محلی کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ حضرت فرنگی محلی کا انتقال ہو گیا، اس لئے اس سعادت سے محروم رہ گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ ہی میں رہ کر آپ نے حکیم باقر حسین سے علم طب سیکھا اور اس میں مہارت پیدا کی۔ پھر ۱۳۰۵ھ میں گنگوہ کا سفر کیا، وہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے صحاح ستہ پڑھی اور اجازت حدیث حاصل کی۔ فراغت کے بعد آپ نے سلسلہ درس و تدریس شروع کیا۔ ایک زمانہ تک سراج گنج (بنگال) میں تدریسی خدمات انجام دیں، اسکے بعد آپ کو مدرسہ ”انوار العلوم“ نوانگر ضلع بلیا میں تدریسی ذمہ داریاں سونپی گئیں، ۱۳۲۱ھ میں جج وزارت سے مشرف ہوئے اور شیخ عبدالحق الہ آبادی مہاجر کی سے اجازت حدیث حاصل کی۔ مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بھی آپ مدرس رہے۔

آپ کی مشہور تصانیف میں غرائب البیان فی مناقب النعمان، مسلک البرہ فی الحج والعمرة، الجام المحتشین فی تعدیل الائمة المتبوعین، طیب الاقاحی فی

مسائل الاضاحی اور کشف المکنون وغیرہ ہیں۔ مولانا الاعظمی نے آپ سے سب سے زیادہ کسب فیض کیا۔

مولانا کریم بخش سنبھلی | شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے شاگرد تھے۔ ۱۳۱۷ھ میں شیخ الہند سے دورہ حدیث کی تکمیل کی فراغت کے بعد مختلف مدارس اور دینی درسگاہوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں صدارت تدریس کی ذمہ داری سونپی گئی جسکو آپ نے بخوبی نبھایا، اسکے بعد دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس و شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ آپ ایک جید الاستعداد عالم تھے، آپ کے مایہ ناز شاگردوں میں مولانا سید فخر الدین احمد (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ تھے۔ ۱۳۶۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

علامہ انور شاہ کشمیری | شوال ۱۲۹۲ھ میں صوبہ کشمیر کے دودھ وان نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ میں دیوبند کا سفر ہوا اور ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کی۔ پھر آپ مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ایک زمانہ تک وہاں قیام رہا۔ ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے، پھر جب ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند سفر حج پر جانے لگے تو آپ کو اپنا جانشین منتخب کیا اور دارالعلوم کی صدر مدرس کی ذمہ داری سونپی جس کو علامہ کشمیری نے بحسن و خوبی نبھایا۔ ۱۳۴۶ھ میں بعض اختلافات کے سبب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے، تشنگان علم نے اس موقع کو نعمت غیر مترقبہ جانا اور اس سرچشمہ علم و فن سے خوب خوب مستفیض ہوئے، اور بالآخر ۱۳۵۲ھ کو یہ آفتاب علم دیوبند میں غروب ہو گیا۔

علامہ کشمیری کو علم حدیث سے والہانہ وابستگی تھی۔ حدیث اور متعلقات حدیث میں انکا پایہ بہت بلند تھا۔ قوت حافظہ اور ذہانت شہرہ آفاق تھی، علوم و فنون پر

اس قدر مضبوط گرفت تھی کہ عقلیں حیران رہ جاتیں، انہیں تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ ان جیسے (علامہ کشمیری) کا امت اسلامیہ میں وجود ہی اس بات کی علامت ہے کہ اسلام ایک سچا اور برحق مذہب ہے۔

علامہ کشمیری کی تالیفات و تصنیفات اور درسی افادات کثیر تعداد میں ہیں جن میں مشکلات القرآن، عقیدۃ الاسلام، العرف الشذی، اور فیض الباری کو کافی شہرت حاصل ہوئی، مولانا الاعظمی نے علامہ کشمیری سے ترمذی، جلد اول کتاب الحج تک پڑھی۔
علامہ شبیر احمد عثمانی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء کو بجنور میں پیدا ہوئے، ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد علامہ عثمانی نے ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۵ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم دی، ۱۳۳۶ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۵۲ھ میں علامہ انور شاہ کشمیری کی وفات کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث منتخب ہوئے۔ اور پھر ۱۳۶۶ھ میں پاکستان ہجرت کر گئے۔

آپ کے عظیم کارناموں میں شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر حواشی اور مسلم شریف کی حنفی نقطہ نظر سے شرح 'فتح الملبہم' ہیں۔ دنیائے اسلام میں ان دونوں کاموں کی زبردست پذیرائی ہوئی، ۱۳۶۹ھ میں انتقال فرما گئے۔ مولانا الاعظمی نے آپ سے 'مسلم شریف' از اول تا کتاب الزکوٰۃ پڑھی۔

مفتی عزیز الرحمن عثمانی ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، آپ زبردست صلاحیتوں کے مالک تھے جب دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا تو فتویٰ نویسی کی بھی ذمہ داری سونپی گئی، ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم مقرر ہوئے، دوران قیام دارالعلوم آپ کے فتاویٰ کی تعداد

ایک لاکھ اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔^۱ مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:
 ”آپ کے بعد دارالعلوم دیوبند کو آپ جیسا مفتی اب تک میسر نہیں آیا اور
 مستقبل قریب میں کوئی توقع بھی نہیں۔“^۲
 ۱۳۴۷ھ میں وفات ہوئی، مولانا الاعظمیٰ نے مفتی صاحب سے جلالین کے
 کچھ اسباق پڑھے۔

مولانا اصغر حسین دیوبندی | ۱۲۹۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، ۱۳۳۳ھ کی
 دارالعلوم کی روداد میں انکی نسبت لکھا ہے:

”مولوی صاحب کو علوم دینیہ حدیث، تفسیر، فقہ، فرائض اور تاریخ وغیرہ
 میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت واستعداد حاصل ہے، آپ صاحب تصانیف بھی
 ہیں..... آپ ایک صاحب ورع وتقویٰ عالم باعمل اور سلف کا نمونہ
 اور انکے صحیح خلف ہیں۔“^۳

۱۳۶۲ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اردو زبان میں فقہ و فرائض
 اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ۳۵ کتابیں مولانا کی یادگار ہیں،
 مولانا الاعظمیٰ نے آپ سے ”سنن ابوداؤد“ کتاب الصلوٰۃ تک پڑھی۔

مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی | حضرت شیخ الہند کے چھوٹے بھائی تھے، انکی
 نسبت ۱۳۳۳ھ کی روداد دارالعلوم میں درج ہے:

”دارالعلوم کو ایک ایسے عالم کی ضرورت تھی جو علوم درسیہ کے علاوہ طب کی
 تعلیم بھی دے سکے اور حسب ضرورت طلبہ کی مدارات بھی کر سکے اس

۱۔ تذکرۃ اکابر ص ۹۳ مولانا نظام الدین قاسمی

۲۔ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ۲۶۹:۱ سید محمد میاں

۳۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۹۰:۴ محبوب رضوی

ضرورت کے تحت ۱۳۰۲ھ میں انکا تقرر ہوا اور اس وقت سے برابر ہر قسم کی درسی کتب کے درس میں مشغول ہیں، اور اسی کے ساتھ تعلیم طب اور مطب کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔^۱

۱۳۴۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

مولانا رسول خاں ہزاروی | ۱۲۸۸ھ میں ولادت ہوئی۔ ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مدرسہ دارالاسلام میرٹھ میں آپ صدر مدرس رہے، تقریباً ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۵۳ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۵۳ھ میں اورینٹل کالج لاہور میں شعبہ عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور یہیں سے ریٹائر ہوئے، ۱۳۹۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ مولانا الاعظمی نے بیضاوی شریف کا کچھ حصہ آپ سے پڑھا۔

مولانا ابوالحسن مسوی | ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے، مولانا عبدالغفار صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، مولانا عبدالغفار صاحب ہی کی خدمت میں رہ کر علوم و فنون حاصل کیا۔ صحاح ستہ حضرت گنگوہیؒ سے پڑھ کر اجازت حدیث یا سند فراغ سے سرفراز ہوئے، مولانا کو فتویٰ نویسی اور علم الفرائض میں ملکہ تامہ حاصل تھا، رد بدعات میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، اس فن میں آپ کی تصنیفات اس بات کی شاہد ہیں، جن میں الفرائض، الجواب المحمود قابل ذکر ہیں۔^۲ ۶۵ برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، مولانا الاعظمی نے آپ ہی سے صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔

مولانا محمد صابر مسوی | ۱۸۶۶ء میں ولادت ہوئی، تکمیل علوم کے بعد دارالعلوم مسوی میں مدرس مقرر ہوئے، بعد ازاں مظہر العلوم بنارس میں آپ نے تدریسی ذمہ داریاں

۱۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲: ۴۹

۲۔ تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۳۸ مولانا حبیب الرحمن قاسمی

سنجالیس، مولانا نے آسان فارسی قواعد پر مشتمل ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام ”نظام الفوائد“ رکھا، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، ۱۹۴۹ء میں اس دارقانی سے کوچ کر گئے۔

تعلیمی و تدریسی سرگرمیاں

دیوبند سے واپسی پر مظہر العلوم بنارس میں ۱۳۳۸ھ م ۱۹۲۰ء سے ۱۳۳۹ھ تک کی مدت تدریس کو اگر چھوڑ دیا جائے تو مولانا الاعظمیٰ کی تدریسی مہم کا باقاعدہ آغاز ۱۳۴۰ھ سے ہوتا ہے۔ ۱۳۴۰ھ میں جب دارالعلوم منو سے فارغ ہوئے تو یہیں پر درجہ علیا کے مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا، مولانا نے یہاں دورہ حدیث تک کی کتابیں پڑھائیں، تقریباً تین سال تک دارالعلوم منو میں درس دیتے رہے۔ ۱۳۴۴ھ میں صدر مدرس کی حیثیت سے مظہر العلوم بنارس کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۷ھ تک مظہر العلوم میں صدر مدرس کے عہدہ پر فائز رہے اور ۱۳۴۷ھ میں آپ نے یہاں سے استعفا دے دیا۔

بنارس سے واپسی پر استاذ محترم مولانا ابوالحسن منوی کی خواہش پر مفتاح العلوم منو میں تشریف لائے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ مفتاح العلوم میں ۱۔ مظہر العلوم کے ناظم مدرسہ ”حی علی الصلوٰۃ“ پر کھڑے ہونے کے فتویٰ پر مولانا سے دستخط کرانا چاہتے تھے، اس کے بدعت ہونے کی وجہ سے مولانا نے دستخط سے انکار کر دیا اور مدرسہ سے استعفا دے دیا۔ (حیات ص ۱۵۲)

۲۔ مدرسہ مفتاح العلوم قدیم شاہی مسجد میں قائم ہوا تھا، جامع مسجد شہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں نے تعمیر کرائی تھی۔ (حیات شبلی ص ۵۷) لیکن بعد میں اس شاہی مسجد کو شہید کر کے اسکی جگہ ایک وسیع و عریض مسجد تعمیر کی گئی۔

اپنی تقرری کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

”جب میں بنارس چھوڑ کر مسو آیا تو مولانا ابوالحسن صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے باصرار تمام مدرسہ مفتاح العلوم میں لا کر بٹھا دیا۔“^۱

مولانا کا تقرر شیخ الحدیث و صدر مدرس کے عہدہ پر ہوا تھا۔ مفتاح العلوم سے عرصہ دراز تک وابستہ رہے، تقریباً بائیس سال تک اس مدرسہ کو اپنی بیش بہا خدمات پیش کیں، مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

”اس وقت (۱۳۴۷ھ) سے لے کر ۱۳۶۹ھ تک برابر مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے، اور بلاناغہ ہر سال یہاں دوسری کتابوں کے ساتھ دورہ حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے رہے عام طور پر آپ کے یہاں بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف مکمل ہوا کرتی تھی۔“^۲

مولانا ایوب صاحب کی نظامت سے سبکدوشی کے بعد مولانا الاعظمی مفتاح العلوم مسو کے ناظم منتخب کئے گئے۔ اس ذمہ داری کو بھی بحسن و خوبی چھ سال تک نبھایا۔ مولانا عبداللطیف نعمانی مفتاحی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

”حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے ۱۳۶۶ھ سے ۱۳۷۱ھ تک نظامت کا عہدہ بھی سنبھالا۔“^۳

اگرچہ ۱۳۶۹ھ میں بعض مصالح کی بناء پر مدرسہ کی تدریسی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، لیکن مفتاح العلوم کی بقا اور ترقی کے لئے مولانا نے جس

۱۔ تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۵۶

۲۔ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۱۳۴

۳۔ مفتاحی ڈائری ۱۳۸ھ بحوالہ حیات ابوالمآثر ص ۱۶۵

قدر انتھک کوششیں کیں اور جتنی صعوبتیں برداشت کیں اور فریفتگی کی حد تک آپ کو جو اس سے تعلق تھا، تاریخ کے اوراق میں ایسے پیوست ہیں کہ انھیں کھرچ کر مٹایا نہیں جاسکتا۔ جب کبھی بھی مفتاح العلوم کو کسی طرح کی ضرورت محسوس ہوئی مولانا الاعظمی نے خود کو اس ضرورت کو پورا کرنے کا سب سے زیادہ مستحق سمجھا، اس مدرسہ میں تصنیف و تالیف کا شعبہ مولانا کی ہی سرپرستی میں قائم ہوا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب مختلف اوقات میں مختلف انداز سے مفتاح العلوم سے وابستہ رہے، حالانکہ بین الاقوامی مؤقر اداروں اور جامعات کی طرف سے مسلسل مولانا کو اونچے اونچے مشاہروں پر دعوت تدریس دی جاتی رہی، لیکن چونکہ خود کو مفتاح العلوم کے لئے وقف کر رکھا تھا اس لئے آپ کی طرف سے ہمیشہ انکار ہی رہا۔ مولانا عبداللطیف نعمانی کے جنوری ۱۹۷۳ء میں انتقال کر جانے کے بعد پھر مولانا الاعظمی کو صدر مدرس اور ناظم کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ مولانا مفتاح العلوم سے ۱۹۷۵ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۷۵ء میں بعض اسباب کی بناء پر مکمل طور پر علیحدگی اختیار کر لی۔

المعہد العالی اور مرقاۃ العلوم کا قیام | مفتاح العلوم سے جب علیحدہ ہوئے تو اپنے تحقیقی و تصنیفی کاموں میں پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ لیکن مزاج چونکہ درس و تدریس کا تھا اور نئے فارغ التحصیل طلبہ کی صلاحیت و استعداد دیکھ کر کچھ تشویش بھی لاحق تھی؛ اس لئے مولانا نے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے مختلف علوم و فنون میں بحث و تحقیق کرانے کی غرض سے ”المعہد العالی“ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا شیخ نذیر حسین کے نام مولانا کے ایک مکتوب میں ”المعہد العالی“ کے لائحہ عمل یا نصب العین کی وضاحت ہوتی ہے، مولانا الاعظمی تحریر فرماتے ہیں:

”میں اس سال صحیح بخاری اور سنن ترمذی کا درس تبرعاً دے رہا ہوں، ہمارے یہاں اس سال بارہ لڑکے دورۂ حدیث میں ہیں، ان میں کچھ لڑکے ایسے ہیں جن کو آئندہ سال ”المعهد العالي للدراسات الاسلامیہ“ میں داخل کر کے ان کی علمی تربیت کا ارادہ ہے اور تربیت کے بعد انھیں سے مدرسہ میں معیاری تعلیم اور تعلیم کے نظم و نسق کا کام لینے کی نیت ہے۔“

لیکن یہ ادارہ تین چار سال سے زیادہ نہ چل سکا، چونکہ طلبہ حسب منشا معیار پر کھرے نہیں اترتے تھے اس لئے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ المعهد العالی کے ساتھ ایک مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی جس کا نام ”مرقاۃ العلوم رکھا۔ مولانا نے یہاں دورۂ حدیث تک کی تعلیم کا نظم کیا۔ دورے کی بعض کتابیں خود بھی پڑھاتے۔ الحمد للہ اس وقت یہ مدرسہ سو ہی نہیں بلکہ اتر پردیش کے مشہور علمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس وقت اس مدرسہ کے ناظم مولانا الاعظمی کے صاحبزادہ محترم جناب مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی مدظلہ ہیں۔

تلامذہ

چونکہ مولانا کا محبوب مشغلہ علم دین کی اشاعت اور درس و تدریس تھا۔ پوری زندگی ہی تعلیم و تدریس کے لئے وقف تھی، ظاہری بات ہے کہ اس دوران بے شمار لبہ کو استفادہ اور کسب فیض کا موقع ملا ہوگا اور بہت سے علم کے شیدائیوں کو شرف تلمذ حاصل ہوا ہوگا جن کا شمار مشکل اور دقت طلب امر ہے۔ البتہ چند مشہور اور مخصوص علماء جو پ کے کیسے فیض سے مستفیض ہوئے ان کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں:

- (۱) مولانا عبد الجبار مئوی شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس
- (۲) مولانا محمد منظور نعمانی ایڈیٹر الفرقان
- (۳) مولانا محمد حسین بہاری استاذ دارالعلوم دیوبند
- (۴) مولانا محفوظ الرحمن نامی بانی مدرسہ نورالعلوم بہرائچ
- (۵) مولانا عبد الستار معروفی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ
- (۶) مولانا سعید الرحمن اعظمی مہتمم ندوۃ العلماء و مدیر تحریر البعث الاسلامی
- (۷) مولانا محمد ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند
- (۸) مولانا ضیاء الحسن مئوی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ
- (۹) مولانا عبد الرشید مئوی سابق صدر مفتاح العلوم مئو

بیعت و سلوک

تزکیہ نفس کے لئے مولانا الاعظمی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے۔ یہ مولانا الاعظمی کی خصوصیت تھی کہ حضرت تھانویؒ نے انہیں دور طالب علمی میں بیعت کیا تھا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ اجل حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بھی مولانا کے دیرینہ تعلقات تھے، حضرت شاہ صاحبؒ ہی سے آپ کو اجازت و خلافت حاصل تھی۔ ۲ شاہ صاحبؒ کے اس موقع پر مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے خواجہ صاحب کے ذریعہ مولانا اعظمی سے مشائی کی فرمائش کی تھی؛ کیونکہ حضرت تھانویؒ نے خلاف معمول انہیں بیعت کیا تھا۔ (مقدمہ تذکرہ مصلح الامت حصہ اول)

۲ حیات ص ۵۱۹، دارالعلوم اپریل و مئی ۱۹۹۲ء ص ۱۷۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا اعظمی مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بیعت نہیں تھے، جیسا کہ بعض مصنفین لکھتے ہیں، بلکہ حضرت شاہ صاحب نے مولانا کو خلافت تفویض کی تھی۔ راقم سطور اس سلسلہ =

علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ قاری منیر الدین صاحب سے بھی مولانا کو اجازت و خلافت حاصل تھی۔

سیاسی و سماجی سرگرمیاں

مولانا کا مزاج خالص علمی و دینی تھا۔ یکسوئی کے ساتھ خام سفالہ پوش مکان میں بحث و تحقیق میں ہمہ تن منہمک رہتے، مگر اسکا مطلب یہ نہ تھا کہ گرد و پیش سے کبھی بھی غافل رہے ہوں، اور جب قوم و ملت کو سیاسی و سماجی کسی بھی طرح کی ضرورت پیش آئی ہو، پیچھے رہے ہوں۔ سیاست میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مسلک سے قریب تھے۔

مولانا محمد حنیف ملی مولانا الاعظمی کے سیاسی نقطہ نظر کے سلسلہ میں تحریر

فرماتے ہیں:

”ہمارے سیاسی رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمن، رفیع احمد قدوائی نے جس طرح معاہداتی سیاست سے کنارہ کش ہو کر عملی سیاست کو دائرہ کار بنایا یہی عملی مثال حضرت مولانا اعظمی نے بھی قائم فرمائی، دارالعلوم دیوبند کی جب تلاشی ہوئی اور یہ پروپنڈہ کیا گیا کہ یہ سیاسی طور پر پاکستانیوں کی پناہ گاہ ہے اور یہاں پاکستانی ٹرانسمیٹر نصب ہے، تو مولانا اعظمیؒ نے بذات خود اسکی تردید کی اور حکومت کے ذمہ داروں کی توجہ اسکی طرف مبذول بھی فرمایا (کذا)۔“

= میں جناب مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی کا شکر گزار ہے کہ ان کے توسط سے یہ بات معلوم ہوئی۔

۱۔ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۲۳۴، دارالعلوم اپریل و مئی ۱۹۹۲ء

۲۔ معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۱ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۳۴

۳۔ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۲۲۱-۲۲۲

اسمبلی کی رکنیت | ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد پہلا عام انتخاب ہندوستان میں ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس دور میں کمیونزم کی لہر عام تھی، باشندگان ملک پر اسکے بڑے گہرے اثرات نمایاں تھے، مسو میں بھی کمیونسٹ پارٹی حاوی تھی، میدان میں نو (۹) امیدوار تھے، کانگریس کو بڑی مشکلوں کا سامنا تھا، اسے ایک مضبوط امیدوار کی تلاش تھی۔ امیدواری کے لئے پیش کی جانے والی درخواستوں پر کانگریس کی اعلیٰ کمان کو پورا اعتماد نہ تھا، آخر کار بساط سیاست پر شطرنجی چال چلنے والوں کی عقابانی نگاہ مولانا پر پڑی جن کی شخصیت کی سحر انگیزی کو ماہرین سیاست نے بھانپ لیا تھا، چنانچہ لوگوں کے شدید اصرار اور وقت کے اہم تقاضوں کی بناء پر مولانا اسمبلی کی رکنیت کے لئے امیدوار بنائے گئے اور چھ ہزار ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ مولانا ایک مرتبہ بھی اپنے حلقہ انتخاب میں کنونٹنگ کے لئے نہیں گئے۔

ممبری کے دوران درس و افادہ | اسمبلی کی مدت رکنیت کے دوران مولانا الاعظمی کا قیام زیادہ تر مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے قائم کردہ ادارہ دارالمبلغین میں رہا۔ سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہونے کے بجائے درس و افادہ جاری رکھا، اسی دوران ندوہ کے شیخ الحدیث محمد حلیم عطا کا انتقال ہو گیا، اب اس خالی جگہ کو آباد کرنے کے لئے سب کی نگاہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی رکن اسمبلی پر پڑی، مولانا علی میاں صاحب نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی اور مولانا الاعظمی انکار نہ کر سکے۔ مولانا سعید الرحمن اعظمی مہتمم ندوۃ العلماء اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”فما استطاع المحدث الأعظمی أن یرفض طلب سماحة العلامة الندوی. وأبدی استعدادہ لذلك خلال إقامتہ فی لکناؤ مما بعث السرور فی النفوس أساتذہ وطلابہ، ولقد تولی فضيلة الشيخ عمران الندوی رحمہ اللہ عمید

دارالعلوم یومئذ ترتیب دروسہ وإقامتہ فی دارالعلوم وبدأ
العلامة الأعظمی بدرس صحیح البخاری فی السنة النہائیة
للاختصاص فی الشریعة الاسلامیة“۔

(علامہ ندوی کی اس پیش کش پر محدث اعظمی سے انکار نہ ہو سکا۔ اور لکھنؤ
میں قیام کے دوران اس خدمت کے لئے راضی ہو گئے، اساتذہ اور طلبہ
میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، دارالعلوم ندوہ کے مہتمم مولانا عمران ندوی کو گھنٹوں
کی ترتیب اور آپ کے قیام کی ذمہ داری سونپی گئی، علامہ اعظمی فضیلت
کے آخری سال والے طلبہ کو بخاری شریف کا درس دینے لگے۔)

۱۹۵۷ء میں جب رکنیت کی مدت پوری ہو گئی تو مولانا اپنے وطن مکہ واپس
آ گئے۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک ندوہ میں بلا معاوضہ بخاری کا درس دیا۔ اس طرح مولانا
کا یہ سیاسی سفر بھی درس حدیث، مطالعہ کتب اور علم کے فروغ میں ہی گزرا۔
امیر الہند ۱۹۳۵ء میں جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس میں امارت شرعیہ کے مسئلہ پر
علماء نے باہم غور و فکر کیا، تقریباً سبھی کا یہ خیال تھا کہ امارت شرعیہ کا قیام ہندوستان میں
ضروری ہے۔ قبل اسکے کہ متفقہ طور پر اس مسئلہ کے حل تک پہنچتے، علماء سہارنپور نے
فقہی دلائل و براہین کی بنیاد پر اس سے اختلاف کیا، چنانچہ کسی فیصلہ کے بغیر اجلاس ختم
ہوا۔ اس وقت سے مسلسل جمعیت علماء ہند امارت شرعیہ کی شکل میں مسلمانوں کے ایک
نقطہ مرکزیت کی تلاش میں تھی چنانچہ ۱۹۸۶ء میں پھر جمعیت علماء ہند نے اس مسئلہ کو اٹھایا
اور اس مرتبہ اہل علم اور دانشوران قوم کے متفقہ فیصلہ سے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کو
”امیر الہند“ منتخب کیا۔ حالانکہ اتفاق ایسا کہ مولانا اس اجلاس میں شریک بھی نہ تھے،
مولانا سید اسعد مدنی موجودہ صدر جمعیت علماء ہند نے نیابتہ جمیع و طاعت کی بیعت لی۔

صدر جمہوریہ ایوارڈ | مولانا حبیب الرحمن صاحب کے تجمر علمی اور تحقیقی خدمات کو تقریباً ہر حلقہ میں سراہا گیا اور از چہار سوداد تحسین دی گئی، اسی کی ایک کڑی صدارتی ایوارڈ ہے۔ حکومت ہند نے علمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۴ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا۔ اس وقت ہندوستان کے صدر گیانی ذیل سنگھ تھے۔

موقر عالمی اداروں اور تنظیموں کی رکنیت | یوں تو مولانا ملکی و عالمی سطح پر بہت سی تنظیموں کے رکن، مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن اور متعدد بورڈ آف ایجوکیشن کے ممبر کی حیثیت سے رہے۔ لیکن یہاں پر طوالت کے خوف سے دو چار کے ذکر پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے مولانا کو جمعیت علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا رکن منتخب کیا، مولانا اعظمی جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں شریک ہوتے رہے اور اپنی ذمہ داریوں کو برابر نبھاتے رہے۔ ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب کئے گئے، مجلس میں آپ کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ ہی کی زیر صدارت مجلس شوریٰ منعقد ہوتی۔

۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی (Executive Council) کے ممبر ہوئے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بھی رکن رکین رہے۔ ایک مرتبہ جب حکومت ہند نے مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی ٹھانی تو مولانا نے بڑے ہی شد و مد کے ساتھ اس تبدیلی کی مخالفت کی اور ۵ مارچ ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے خلاف انصاری لائبریری خیر آباد کی طرف سے منعقد ہونے والے جلسہ عام میں شریک ہوئے اور قرآن مجید کی پندرہ آیتوں سے ثابت کیا کہ: ”اسلامی شریعت خدا کی نازل کردہ ہے، اسلامی قانون اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور مسلم پرسنل لاء حق تعالیٰ کا وضع کیا ہوا ہے۔“

۱۹۸۹ء میں عراق کے مشہور علمی ادارے ”المجمع العلمي العراقي“ نے مولانا کو اپنا رکن بنایا۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی نصاب کمیٹی کے رکن رہے، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک کے شعبہ تخصص فی الحدیث کے سرپرست رہے اور اسکا نصاب بھی آپ ہی نے تشکیل دیا۔ ادارہ المصنفین اعظم گڑھ کی وقف کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔

اسفار

مولانا نے بیرون ملک سب سے پہلا سفر مقدس سرزمین کی طرف کیا اور حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مولانا الاظمیٰ کو یہ سعادت آٹھ مرتبہ نصیب ہوئی۔ علم کی تلاش اور تحقیق و جستجو کی خاطر دمشق^۱، حلب، لاذقیہ، جبلہ، بیروت، صیدا، بعلبک اور قاہرہ وغیرہ بلاد عربیہ کا سفر کیا۔ ملک سے باہر آخری سفر ۱۹۸۷ء میں ہوا، یہ سفر حجاز کے لئے ہوا تھا، مولانا کے یہ اسفار خالص علمی اور تحقیقی تھے۔

وفات

”کلُّ من علیہا فان“ کے قاعدہ اور ضابطہ کے تحت ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو رحمٰن نے اپنے حبیب کو اس منزل پر پہنچا دیا جو مومن کی

۱۔ تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ص ۲۵۰ فضل الرحمن اعظمی

۲۔ معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۱

۳۔ دمشق کی تعمیر یا اسے آباد کرنے کے سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں، منجملہ اقوال میں سے ایک قول وہب بن منبہ کا ہے، انکے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے حبشی غلام نے دمشق کو آباد کیا تھا، نمرود بن کنعان نے حضرت ابراہیم کو اس وقت یہ غلام عطا کیا تھا، جب آپ آگ سے محفوظ نکل آئے تھے۔ اس غلام کا نام دمشق تھا، چنانچہ اسی کے نام پر یہ شہر آباد ہوا۔ (تہذیب تاریخ دمشق الکبیر

۱۵:۱-۱۶ شیخ عبدالقادر بدران)

معراج ہوتی ہے۔ اور جہاں بے ساختہ یہ آیت شریفہ یاد آ جاتی ہے: ”یَا أَيُّهَا
النَّفْسُ الْمَطمِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً۔“

دوسرے دن ۱۷ مارچ کو ظہر کے بعد مئو کے وسیع ترین ریلوے میدان
میں جنازہ کی نماز ادا کی گئی اور بے شمار سوگواروں کے ہاتھوں سپرد خاک کئے گئے۔
حدیث کے اس خدمت گزار کی مقبولیت اور لوگوں کے دلوں میں انکے لئے
احترام کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا کے انتقال
سے عالمی پیمانہ پر علمی دنیا کو صدمہ پہونچا، انکے انتقال پر ایک عجیب کھرام پڑا تھا۔
مشائخین اور لوگوں کی تعداد نہ جانے کہاں سے بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ اگر کوئی اور موقع
ہوتا تو شاید انتظامیہ کو کافی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ جنازہ میں شریک لوگوں کی تعداد کے
بارے میں عربی مجلہ ”صوت الاسلام“ لکھتا ہے:

”مولانا کے جنازہ میں مسلم اور غیر مسلم عوام کا ایک جم غفیر تھا، تقریباً دو
لاکھ یا اس سے زیادہ لوگ تھے۔ یہ دیکھ کر ہمیں محدث الاسلام امام احمد بن
حنبل یاد آ گئے کہ ان کے جنازہ میں پورا شہر نکل پڑا تھا۔“

مولانا ضیاء الدین اصلاحی اس منظر کو دیکھ کر یہ تاثر بیان کرتے ہیں:
”.....لوگوں کی تعداد کا اندازہ نہ ہو سکا البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے
ہوئے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ
آئندہ اسکی توقع ہے تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام
زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے۔“ ۲



باب سوم

مختلف علوم و فنون سے متعلق خدمات

تفسیر

حدیث

فقہ

مناظرہ

تاریخ و تذکرہ

ادب

باب سوم

مختلف علوم و فنون سے متعلق خدمات

تفسیر

تمام علوم کا سرچشمہ منبع قرآن حکیم ہے، اس کائنات میں جس طرح ہر ذرہ حمد الہی کر رہا ہے، اسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم کا کوئی دریچہ ہو یا اسکی کوئی شاخ ہو، شجر ہو، حجر ہو، ثمر ہو، وہ قرآن کے دائرے سے باہر نہیں ہے، چنانچہ ائمہ نے قرآن کی اپنی اپنی فہم کے مطابق تفسیر کی۔ استدلال کے لئے عقل و منطق کا سہارا لیا، اور استخراج نتائج میں اسکا لحاظ رکھا کہ حدیث سے تعارض نہ ہو، اقوال و سیر صحابہ کرام سے ہر نتیجہ کی تائید ہو، اور منشأ قرآن کی توضیح و تشریح بھی ہوتی ہو۔

چنانچہ اس میدان وسیع بیان میں جو علمی کارنامے انجام دیئے گئے، وہ کبھی کشف، کبھی تفسیر کبیر، کبھی درمنثور اور کبھی بیضاوی وغیرہ کے نام سے یاد رکھے گئے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تاقیام قیامت انسان اپنی فہم کے مطابق قرآن کی آیات سے روشنی حاصل کرتا رہے گا۔ اور جیسے جیسے یہ دنیا ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے علوم و فنون کے دریچے کھولے گی، اسے مفتاح العلوم یعنی قرآن حکیم کا سہارا لینا پڑے گا۔

راقم الحروف اپنے اس عقیدہ پر مفتخر ہے کہ جس نے قرآن سے اپنا رشتہ توڑا

وہ علم خالص سے بے بہرہ ہوا، اور اس آیت شریفہ کا مصداق ہوا: ”ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم۔“

اس تصور کے پیش نظر کسی عالم کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہئے کہ اس نے قرآن سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، اور میدان تفسیر میں اسکے فکری اکتسابات کس منزل پر ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ نے کوئی تفسیر نہیں لکھی، لیکن انکا علمی ذوق صحتمند، خالص اور پاکیزہ اقدار پر مبنی تھا؛ اس لئے انہوں نے جہاں کہیں یہ دیکھا کہ قول سدید سے انحراف ہو رہا ہے وہاں انکا خامہ شرر بار خاشاک غیر اللہ کو پھونک دینے کے لئے بیچین ہوا اٹھا۔ اس سلسلہ میں انکے دو مضامین ہیں، جنکا تجزیہ کیا گیا ہے، حالانکہ تفسیر کے نکات اور قرآن فہمی کے اسرار و غوامض کی تشریح مولانا کے تمام علمی کارناموں میں کسی نہ کسی نہج سے ملتی ہے، لیکن خاص طور سے یہ دور سائل معتزلہ اور بزم خود مجد دانہ فکر کا ابطال کرتے ہیں۔

التنقید السدید علی التفسیر الجدید

مولانا عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ نے ”التفسیر الجدید“ کے نام سے ایک تفسیر تحریر کی۔ اپنی اس تفسیر کی تمہید میں قرآن کی عمدہ اور صحیح تفسیر کے لئے مولانا نے کچھ معیار بھی مقرر کئے، جو اگرچہ صراحتہ تو درج نہیں لیکن ضمناً مفہوم ہوتے ہیں۔ وہ اصول یہ ہیں:

۱۔ تفسیر لکھنے کے وقت احادیث صحیحہ کو پیش نظر رکھنا لازم ہے، کسی آیت کی تفسیر میں یہ چیز سب سے مقدم ہے۔

۲۔ متبادر معانی و مطالب کو اخذ کیا جائے، تاکہ فتنہ و فساد اور توجیہ و تاویل کا باب نہ کھل جائے۔

۳۔ منطقی دلائل، فلسفیانہ موثکافیوں، ریاضیات، طبعیات اور ہیئت و نجوم کے زور سے استدلال و حجت کو قوی سے قوی بنانے سے گریز کرتے ہوئے بغیر کسی خفاء کے واضح اور صاف باتیں کی جائیں۔

۴۔ ہر آیت کے لئے کوئی نہ کوئی واقعہ فرض کر لینا پھر اس کے مطالب اسی مخصوص حادثہ میں محدود کر لینا جن میں بیشتر ایسے واقعات ہیں جو اہل کتاب سے منقول ہیں لہذا اس لئے ناقابل اعتماد ہیں، غلط فہمی ہے۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے مطابق پروفیسر عبدالحی نے قرآن کی تفسیر کا جو معیار یا خاکہ بنایا ہے، خود انہوں نے ہی اس کا پاس نہیں رکھا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”ہر شخص کو یہ خیال ہوگا کہ مولانا نے ان اصول کی مراعات کرتے ہوئے تفسیر کی ہوگی، لیکن واقعات آپ کو بتائیں گے کہ مولانا نے ان میں سے کسی چیز کی بھی کوئی پروا نہیں کی، اور ان تقیدات سے بالکل آزاد ہو کر آیات کے معانی و مطالب بیان کئے ہیں حتیٰ کہ بیشتر مقامات میں نحو و صرف، معانی و بلاغت کے اصول و قواعد کی رعایت بھی غیر ضروری سمجھی ہے، مفردات کے معانی لغویہ کے بیان کرنے میں بھی اجتہاد و قیاس کو دخل دیا ہے۔“ ۳

مولانا الاعظمی نے عقیدہ اہل سنت والجماعت سے متصادم اس تفسیر ”التفسیر الجدید“ کا رد کیا، اس سلسلہ میں ۴۸ صفحات پر مشتمل مستقل ایک رسالہ تحریر فرمایا، جس کا نام مولانا نے ”التقید السدید علی التفسیر الجدید“ رکھا۔ اس کتاب میں انہوں نے سولہ

۱۔ التفسیر الجدید ۳، ۱۳، بحوالہ التقید السدید ۳-۴ (النجم لکھنؤ یقعدہ ۱۳۴۹ھ)

۲۔ مولانا سے مراد پروفیسر عبدالحی ہیں۔

۳۔ التقید السدید ص ۴ (النجم لکھنؤ یقعدہ ۱۳۴۹ھ)

مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں پروفیسر عبدالحی نے قرآن کی تصریح، صحابہؓ کی روایات اور تفاسیر وغیرہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ایک اجتہادی رائے قائم کی اور جدید انکشافات و تحقیقات پیش کی ہیں۔ وہ سولہ مقامات یا مباحث مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱۔ آدم علیہ السلام کی جنت، جنت ارضی تھی، ۲۔ صاعقہ جو بنی اسرائیل پر آیا تھا وہ بیہوشی تھی، ۳۔ اسی واقعہ میں بعث بعد الموت سے مراد ہوش میں لانا ہے، ۴۔ اصحاب السبت پر جو نکال اور عذاب بخیس نازل کیا گیا تھا اس سے مراد پوری قوم کا بتلائے زنا ہو جانا ہے، ۵۔ اصحاب السبت درحقیقت بند نہیں ہو گئے تھے، بلکہ بندروں کی خصالتیں ان میں پیدا ہو گئی تھیں، ۶۔ حرام حیلوں کی تدوین دوسری صدی ہجری میں شروع ہو گئی تھی، ۷۔ تقلید معمول بہ کو رانہ تقلید اور تقلید ائمی ہے اور مقلدین فبذوہ وراء ظہورہم اور قالوا بل نبتع ما ألفینا علیہ آباننا کے مصداق ہیں، ۸۔ رفع طور سے اسکا سروں پر بلند کرنا مراد نہیں ہے، بلکہ بنی اسرائیل اسکو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے، ۹۔ ہاروت وماروت دو فرشتہ خصلت انسان تھے، ۱۰۔ انہوں نے اپنی بزرگی اور ادو وظائف کے ذریعہ قائم کی تھی، ۱۱۔ یہودیوں نے بھی اور ادو وظائف ان سے سیکھے تھے، ۱۲۔ یہ اور ادو وظائف شیطانی باتیں ہیں، ۱۳۔ انکار کمر، ۱۴۔ آیت الم تر الی الذین خرجوا من دیارہم الایۃ میں جنگ عماقہ کا ذکر ہے، ۱۵۔ اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ خرق عادت کے طور پر نہیں مرے تھے، ۱۶۔ مرنے کے بعد وہ زندہ نہیں ہوئے تھے۔

پروفیسر عبدالحی کی تفسیر پر مولانا اعظمی کی تنقید کا یہاں ایک نمونہ پیش خدمت ہے؛ تاکہ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح سے متعلق مولانا کے مطالعہ اور اس سلسلہ میں انکی دقت نظر اور فکری تعمق کا کچھ اندازہ کیا جاسکے۔

”وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ“ کی تفسیر میں مولانا

عبدالحی تحریر فرماتے ہیں:

”اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہاڑ ان کے سر پر بلند کر دیا گیا تھا بلکہ اپنے سامنے اس کو دیکھ رہے تھے۔ حدیث میں آتا ہے ”فَرَفَعْتُ لَنَا صَخْرَةً“ جس کے معنی صاحب بحار الانوار نے یہ کئے ہیں کہ ظہرت لأبصارنا یعنی چٹان ہمیں نظر آنے لگے پس یہاں یہی معنی مراد ہیں کہ وہ اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔“

مولانا الاعظمی نے اولاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، جن کو خود مصنف نے دور اول کے مفسرین میں شمار کیا ہے، کی اس آیت کریمہ کے بارے میں رائے اور انکی تفسیر نقل کی جو مصنف کی تفسیر کے خلاف ہے، پھر آگے چل کر مولانا نے پروفیسر عبدالحی کی تفسیر کو قرآن حکیم کی تصریح کے خلاف قرار دیا۔ مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی دلیل قرآن مجید کی ہی دوسری آیت سے پیش کی، مولانا کی تحقیق خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”سورۃ اعراف میں اسی واقعہ کو دوسرے الفاظ میں ذکر کیا ہے، وإذا

نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظِلَّةٌ فَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمُ الْآيَةُ اس آیت سے بچند وجوہ مصنف کے خیال کی تردید ہوتی ہے۔ (اولاً) تو یہاں رفع کا لفظ ہی نہیں ہے اس لئے یہاں اس تصرف کی گنجائش ہی نہیں جو سورۃ بقرہ کے الفاظ میں تھی۔ (ثانیاً) نثق کے معنی فشانیدن و جنبا نیدن یعنی جھاڑنے اور جھٹکا دینے کے ہیں چنانچہ صراح میں ہے وإذا نَتَقْنَا الْجَبَلَ اِي زَعَزَعْنَاهُ اور علامہ راغب نے فرمایا ہے کہ نثق

کے معنی کسی چیز کو اس طرح کھینچنا کہ ڈھیلی ڈھالی ہو جائے۔ (مثال)
 کاندہ ظلہ میں بالکل تصریح ہے کہ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان کی
 طرح بلند کر دیا گیا تھا اور یہ وہ لفظ ہے کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش
 نہیں ہے۔ (رابعاً) فظنوا اندہ واقع بہم سے بھی یہ ثابت ہے کہ وہ
 ان کے سروں پر بلند تھا ورنہ اگر وہ پہلے کی طرح اپنے مرکز ہی میں جما ہوا
 تھا تو انہوں نے بلا وجہ بیٹھے بیٹھے آج یہ یقین یا گمان کیوں کر لیا کہ پہاڑ
 ان کے سروں پر آرہے گا۔ ان دلائل قاہرہ سے بلا شک و ریب ثابت
 ہو گیا کہ مولانا کا اجتہاد غلط اور ”قداامت پرستوں“ کا صدیوں کا
 ”فرسودہ“ خیال عین مطابق قرآن ہے۔“

اسی طرح ”قلنا یا آدم اسکن أنت وزوجک الجنة“ کی تفسیر میں
 ائمہ اہل سنت والجماعت کے خلاف پروفیسر عبدالحی کے اس دعویٰ: ”آدم کو جس جنت
 میں رہنے کا حکم دیا گیا ظاہر ہے کہ وہ حقیقی جنت نہیں ہو سکتی۔“ کو مولانا الاعظمیٰ نے
 تفسیر مدارک کے حوالہ سے بعینہ معجزہ کا مسلک قرار دیا۔ اسی بحث کے ذیل میں
 مولانا عبدالحی کا وضع کردہ وہ معیار کہ تفسیر کے سلسلہ میں فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہونی
 چاہئیں، عالم مثال کے سلسلہ میں خود انہیں کی تقریر سے ٹوٹ جاتا ہے، لامحالہ وہ
 فلسفیانہ اور منطقی مباحث میں اپنی تفسیر میں الجھے نظر آتے ہیں، جو انہیں کے نقطہ نظر
 کے خلاف ہے۔

آدم علیہ السلام کے قیام جنت کے متعلق مولانا الاعظمیٰ نے طویل کلام کیا
 ہے، چونکہ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ صرف ایک مثال پیش کریں گے اس لئے یہاں پر

اس پوری بحث کو نقل کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی اپنی تحقیق کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ پروفیسر عبدالحی نے اپنی تفسیر میں اصول تفسیر کی رعایت نہیں برتی، بلکہ یہ کہتے کہ مخالفت کی اور یہی بنیادی سبب ہے کہ انکی تفسیر درجہ اعتبار و قبول سے ساقط ہوگئی۔ مولانا نے 'الفوز الکبیر' کے حوالہ سے تفسیر کے چند اصولوں کا بھی ذکر کیا ہے، جنکی پروفیسر عبدالحی نے اپنی تفسیر میں خلاف ورزی کی ہے۔ وہ اصول یہ ہیں:

۱۔ قرآن پاک کے مشکل الفاظ کے حل میں حسب ذیل چیزوں پر بہ ترتیب ذیل اعتماد ضروری ہے:

(الف) حضرت ابن عباسؓ سے جو شرح الفاظ بطریق ابن ابی طلحہ مروی

ہے۔

(ب) حضرت ابن عباسؓ سے جو شرح بطریق ضحاک مروی ہے۔

(ج) جوابات حضرت ابن عباسؓ بہ سوالات ابن الزرق۔

(د) وہ شرح الفاظ جو صحیح بخاری میں ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔

(ه) مفسرین نے جو شرح الفاظ صحابہ، تبع تابعین سے نقل کی ہے۔

۲۔ قرآن کے کسی مشکل مقام کی تشریح و توضیح میں سب سے زیادہ قابل قبول بلکہ متعین طور پر واجب القبول وہ تشریح تفسیر ہے جو خود قرآن پاک کے کسی دوسرے مقام سے حاصل ہو مصنف نے ورفعنا فوقہم الطور کی تفسیر میں اسکی خلاف ورزی کی۔

۳۔ اسباب نزول و توجیہ مشکل کے متعلق جو آثار و احادیث امام بخاری، امام ترمذی اور حاکم نے ذکر کئے ہیں انکا یاد رکھنا مفسرین کے لئے ضروری ہے۔ مصنف نے الم تر إلى الذين خرجوا من ديارهم الآية اور اصحاب سبت کے قصہ میں اس کی خلاف ورزی کی ہے۔

۴۔ کسی آیت کی تفسیر اگر حدیث میں مذکور ہو یا اس کی تفسیر میں کسی حدیث سے مدد ملتی ہو تو وہی تفسیر متعین ہے۔ مسخ بنی اسرائیل کے بیان میں مصنف نے اس اصول کو ترک کر دیا ہے۔

۵۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں کہ اسباب نزول بیان کرنے میں ہمارے مولانا (پروفیسر عبدالحی) سخت ہیں، حالانکہ بعض اوقات اس چیز کے بغیر آیت کی مراد تک رسائی ناممکن ہے۔

۶۔ جس قصہ کا ذکر قرآن پاک میں ہوا اسکی تفصیل میں دوسری چیزوں سے مدد لینا ضروری ہے لیکن اسی حد تک کہ وہ انتظار دفع ہو جائے جو قرآن پاک کے الفاظ پڑھنے سے پیدا ہوا تھا اور جتنا حصہ قرآن پاک میں مذکور ہے وہ واضح اور منکشف ہو جائے۔

۷۔ اسرائیلیات مطلقاً شجرہ ممنوعہ نہیں ہیں، بلکہ اسمیں تفصیل ہے۔ مصنف نے سرے سے اسرائیلیات کا انکار کیا ہے، لیکن خود انہوں نے بیشتر مقامات میں اپنے کلام کی بنیاد انہیں اسرائیلیات پر رکھی ہے۔

۸۔ متون لغات و اوضاع الفاظ میں ماوشما کی رائے و قیاس کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ عرب کی تقلید اس باب میں ضروری ہے۔ پروفیسر عبدالحی صاحب نے رفع الطور اور صاعقہ کی شرح میں اس اصول کو نظر انداز کیا ہے۔

مولانا الاعظمی نے ”التنقید السدی علی التفسیر الجدید“ میں تفسیر اور اصول تفسیر سے متعلق اپنے مختصر مگر جامع تحقیقی و تنقیدی مباحث کے ذریعہ ”میدان تفسیر“ میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ مولانا نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ تفسیر کے سلسلہ میں پڑی سے اتر جانے والی آزادانہ روش کو پھر سے پڑی پر لائیکسی ایک قابل ستائش کوشش کی ہے۔ انہوں نے تفسیر میں اصول تفسیر کی خلاف ورزی کو گمراہی قرار دیا۔ مولانا اعظمی کا یہ رسالہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے مشہور علمی مجلہ ”النجم“ میں ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ میں شائع ہوا۔ اس کتاب کو علمی دنیا نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسکے مصنف کو داد تحسین

دی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قوت استدلال، حسن اداء، دفع شبہات، لیکن کلام غرض ہر پہلو سے ”تنقید سدید“ کی تحسین و توصیف فرمائی ہے، جس کو آئندہ کسی مناسب موقع پر نقل کیا جائے گا۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ ۲۸/ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ کے ایک خط میں اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہیں:

”سبحان اللہ عنوان اور معنوں، تعبیر اور معبر عنہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر رسالہ..... رسالہ کا موضوع باوجود یکہ تنقید و مناظرہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس متانت و تہذیب اور انصاف و حق گوئی کا ثبوت اس تحریر میں دیا گیا ہے عموماً مناظرانہ تحریریں اس سے خالی دیکھی گئی ہیں.....“

نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے

ایک مشہور اور قابل احترام عالم نے ”قرآن محکم“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ اس کتاب میں انہوں نے نسخ آیات کے سلسلہ میں بحث و تحقیق کی تھی، نسخ کے متعلق مولانا کی تحقیق یہ تھی:

”جن جن آیتوں کو نسخ و منسوخ سمجھا جاتا ہے، محض غلط فہمی پر مبنی ہے،

ورنہ قرآن پاک کا چہرہ اس بد نماداغ سے پاک ہے۔“

بہر حال مصنف کی تحقیق کالت لباب یہ تھا کہ ”نسخ“ عیب اور بد نماداغ ہے، قرآن کریم جیسی پاکیزہ اور مقدس کتاب میں اس کے ہونے کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیؒ نے ”قرآن محکم“ کا رد لکھا، مولانا نے

نسخ کے اصطلاحی معنی کی تعیین کرتے ہوئے اسکی حقیقت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی، مفسرین، علماء کبار اور فقہاء کی تفاسیر اور انکی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیات نسخ کی تفسیر کی، اور ”قرآن محکم“ کے مصنف کے پیش کردہ نقطہ نظر پر سخت تنقید کی۔ مولانا الاعظمی کے رسالہ کا نام ”نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے“ ہے۔ مولانا نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بحث کی:

(۱) دلیل کیا صرف قرآن ہی ہے، (۲) ناقابل معافی جرأت، (۳) جملہ شرطیہ کی تحقیق، (۴) قرآن میں وقوع نسخ، (۵) نسخ کے لئے تعارض ضروری نہیں، (۶) تاویلات فاسدہ۔

مولانا اعظمی کے مطابق امت محمدیہ میں اس حقیقت کا انکار صرف ابو مسلم اصفہانی معتزلی نے کیا ہے۔ اسکے بالمقابل ابو بکر رازی، ابو الحسین بصری، قاضی بیضاوی، ابن الہمام، اسنوی، ابن امیر الحاج، شاہ ولی اللہ اور تمام علماء اصول کے نزدیک نسخ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ ابو الحسین نے اس کو حسن و خوبی سے تعبیر کیا ہے۔ بہر حال قرون اولیٰ سے آج تک سبھی کو نسخ کی حقیقت تسلیم ہے۔

ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها أو مثلها. (سورہ بقرہ)

(ہم کوئی بھی آیت منسوخ کرتے یا اسے بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل لاتے ہیں)

اس آیت کے بارے میں ”قرآن محکم“ کے مصنف نے کہا کہ:
 ”اس آیت سے نسخ آیت کا نہ وقوع سمجھا جاسکتا ہے نہ نسخ آیت کے وقوع کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔“

مولانا الاعظمی کہتے ہیں کہ فاضل مصنف کا یہ دعوی غلط ہے؛ کیونکہ حضرت عمرؓ نے انکے دعوے کے خلاف اس آیت سے وقوع نسخ سمجھا ہے، اور انکا ایسا سمجھنا اہل عربیت پر بھی حجت ہے اور اہل فقہ پر بھی۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ابی بن کعبؓ اگرچہ ہم میں سب سے بڑھ کر عالم قراءت ہیں پھر بھی ہم انکی بہت سی قراءتوں کو اختیار نہ کرنے اور چھوڑ دینے پر مجبور ہیں، اس لئے کہ انکا قول یہ ہے کہ حضرت کی زبان سے میں نے جو بھی سنا ہے میں اسکو چھوڑ نہیں سکتا، اور حق تعالیٰ کا قول ہے کہ: ما ننسخ من آية أو ننسها النسخ.

مولانا نے حضرت عمرؓ کے اثر کو پیش کر کے لکھا کہ اگر حضرت عمرؓ اس آیت سے نسخ کا واقع ہونا نہ سمجھتے تو وہ حضرت ابیؓ کی بہت سی آیتوں کو چھوڑ دینے کی وجہ اس آیت کو کیوں قرار دیتے؟ اسی طرح اگر نسخ کا وقوع ہوا ہی نہیں اور یہ آیت نسخ پر دلالت ہی نہیں کرتی تو حضرت ابیؓ کی کوئی قراءت نہ منسوخ ہو سکتی تھی اور نہ حضرت عمرؓ کے لئے اسکا چھوڑنا روا ہو سکتا تھا، نہ اس آیت کو چھوڑنے کی حجت قرار دینا صحیح ہو سکتا تھا۔

کیا سبب ہے کہ ”قرآن محکم“ کے فاضل مصنف نے ایسی جرأت کی کہ نسخ کے وقوع کے سلسلہ میں ایک اجماعی رائے ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی علیحدہ رائے قائم کی اور سرے سے نسخ کا انکار ہی کر بیٹھے اور اس سلسلہ میں ایسی تحقیق پیش کی کہ معتزلہ سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے وہ سبب اور وہ علت بھی ڈھونڈ نکالی جس نے مصنف کو مغالطہ میں ڈال دیا تھا یا خود مصنف کی اس کے صحیح مفہوم و مصداق تک رسائی نہ ہو سکی تھی۔ مولانا نے غلط فہمی کا اصل منشاء ”نخبہ“ کی اس عبارت کو قرار دیا جہاں یہ ذکر ہے کہ دفع تعارض کی ایک صورت نسخ آیت بھی

ہے، یعنی جب تک دو آیتوں میں تعارض نہ ہوگا نسخ ہوگا ہی نہیں۔ مولانا الاعظمیٰ نے اس خیال کو باطل قرار دیا کہ نسخ کے لئے تعارض ضروری ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

”یہ خیال فاسد اس لئے ہے کہ فرضیت تہجد اور فرضیت صلوٰۃ خمسہ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ پھر بھی تمام علمائے امت نے تہجد کی فرضیت کو منسوخ اور فرضیت نماز پنجگانہ کو نسخ قرار دیا ہے۔“

”قرآن محکم“ کے مصنف نے ان آیات میں تاویلات کر کے غیر منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن کو متقدمین و متاخرین علماء نے منسوخ تسلیم کیا ہے۔ اسکی بھی ایک مثال نذر ناظرین ہے:

”کتاب علیکم إذا حضر أحدکم الموت إن ترک خیراً

الوصیۃ للوالدین والأقربین بالمعروف حقاً علی المتقین۔“

(جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو اگر اس نے مال چھوڑا ہے تو تم پر

والدین اور رشتہ مندوں کے لئے موافق شرع وصیت کرنا واجب قرار دیا

گیا، یہ متقیوں پر ضروری ہے۔)

فاضل مصنف نے اسکو غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ انکی تحقیق کے مطابق لفظ

’الوصیۃ‘ سے وصیت بالمال مراد نہیں ہے، بلکہ خاص وصیت الہی مراد ہے۔ اس آیت

کے نزول کا مقصد یہ اطلاع ہے کہ تمہارے ترکہ کے متعلق والدین و اقرباء کے لئے

ایک خاص وصیت الہی ہے جو تم پر فرض کی گئی ہے، اور اسکا بیان سورۃ نساء میں ہے۔

چنانچہ سورۃ نساء کی آیت میراث سورۃ بقرہ کی آیت کی تفصیل اور بیان ہے۔

مولانا الاعظمیٰ کے نزدیک مصنف کی یہ تاویل دراصل ابو مسلم اصفہانی

معتزلی کی بیان کردہ ہے۔ نیز فرمایا کہ اس آیت کو منسوخ نہ کہنا حضرت ابن عباسؓ کی

سُنی کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ المآثر ج: ۱۱: ش: ۳ ص: ۲۲

تصریح کے خلاف ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ:

عن ابن عباس قال: كان المال للولد وكانت الوصية
للوالدین فمسح الله من ذلك ما أحب الخ (فتح الباری
جلد ۴ ص ۲۴۰ کی)

(یعنی مال کا وارث لڑکا ہوتا تھا، اور والدین کے حق میں وصیت ہوا کرتی
تھی، پس اللہ نے جو چاہا اس میں سے منسوخ کر دیا۔)

اسکے علاوہ مولانا نے آیت کریمہ کے سیاق و سباق، اسکے مفہوم، اور آیت
کی نحوی ترکیب پر بحث کرتے ہوئے ”قرآن محکم“ کے مصنف کی تاویل کو قرآن کے
خلاف قرار دیا۔ مولانا نے اس آیت سے ہی چار دلیلیں پیش کیں۔ قرآن محکم کے
مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا کہ:

”ہم کو خود قرآن شریف کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ خود قرآن ناسخ
و منسوخ آیات کی موجودگی کا حامی ہے یا منکر؟ اگر منکر یا ساکت ہے تو
اسکی طرف بغیر کسی دلیل کے منسوب کرنا ناقابل معافی جرات ہے۔“

مولانا نے اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ تمام اہلسنت کے موقف کے
خلاف ہے، بلکہ انہوں نے اس اظہار خیال کو فرقہ اہل قرآن کی ہم نوائی قرار دی۔
لکھتے ہیں کہ مان لیا جائے کہ قرآن ساکت ہے کہ اس میں نسخ واقع ہوا ہے یا نہیں،
لیکن اس حدیث کا کیا کیا جائے جس میں اسکے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولانا نے
حدیث پیش کی:

كلام الله ينسخ بعضه بعضاً.

۱۔ نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ المآثر ج: ۱۱ ش: ۳ ص ۲۳

۲۔ قرآن محکم ص ۱۹ بحوالہ المآثر ج: ۱۱ ش: ۲ ص ۲۸

(کلام الہی ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتے ہیں۔)

دوسری حدیث:

إن أحادیثنا ینسخ بعضها بعضاً کینسخ القرآن.

(مشکوٰۃ شریف ص ۲۳)

(قرآن ہی کی طرح ہماری حدیثیں ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتی ہیں۔)

مولانا نے نسخ کے سلسلہ میں حدیث کی ان وضاحتوں کے بعد 'قرآن محکم' کے مصنف سے سوال کیا کہ:

”تو کیا اسکے بعد بھی قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کہنا ناقابل معافی جرات ہے؟“

مولانا نے اپنی اس مختصر تحریر میں مصنف کی ہر بات کا جواب دینے کا تہیہ نہیں کیا ہے لیکن پھر بھی ”نسخ آیات“ کے موضوع پر اہم اور بنیادی باتوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ انکے اس مضمون کو دیکھ کر آیات کی تفسیر و تشریح میں انکی گہری نگاہ، مفسرین اور اصول تفسیر کے مصنفین کی آراء اور اقوال سے پوری طرح واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس طرح سے مولانا نے تفسیر، اصول تفسیر، نحوی صر فی بحث، احادیث و آثار صحابہ، منطقی دلائل وغیرہ تمام کو سامنے رکھ کر ”نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے“ مضمون مرتب کیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علوم قرآن پر مولانا کو دسترس حاصل تھی۔

مولانا الاعظمیٰ کا یہ مختصر رسالہ اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ ابھی حال ہی میں مجلہ ”الماثر“ مکتوبہ جلد ۱۱ شمارہ ۲، ۳، ۴ میں شائع کیا ہے۔



”نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ الماثر ج: ۱۱، ش: ۲، ص: ۲۹

حدیث

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾

(آپ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے، یہ تو وحی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔)

اسلام کو تمام ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات پر اس لئے بھی ترجیح حاصل ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات کا نظری اور عملی پہلو پیش کرتا ہے۔ اسکا تشریحی پہلو اسکے تشریحی رخ سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ جہاں اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے ایسا معجزہ پیش کیا جو حدودِ زمان و مکان سے ماوراء ہے، وہیں اسلام کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اسکا کوئی رخ ناقابلِ عمل نہیں، کوئی موسم ہو، کیسے ہی پھول کھلیں، اسلام ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام کے نظام میں ایک ایسا جمود و ٹھہراؤ (Rigidity) ہے کہ وہ صرف چند احکامات کے گرد محدود ہے۔

پروردگار عالم نے اپنے بندوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق کے لئے ”انعمت علیہم“ کے مصداق افراد بھیجے، اور انسانوں کو ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین“ والے راستے سے روکنے کے لئے ارشادات، احکامات اور ہادیانِ عصر کو مشعلِ راہ بنایا اور جگہ جگہ یہ بھی وضاحت کر دی کہ اگرچہ ”رسول“ تمہارے ہی جیسا بشر ہے، مگر یاد رکھنا، اس پر وحی آتی ہے، وہ اپنی مرضی سے کلام نہیں کرتا ہے، چنانچہ خداوند قدوس نے اپنے کلامِ پاک میں بہت سے مقامات پر اپنے احکام کی تعمیل کے ساتھ اپنے پیغمبر ﷺ کی اطاعت کا تاکید بھی فرمایا ہے۔

اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ "أطیعوا اللہ" کے ساتھ "أطیعوا الرسول" جابجا قرآن مجید میں ہے۔ انتہائی عاجزی سے یہ عرض کرنا ہے کہ صامت کی اطاعت کیسے ہو سکتی؟ اور جب رسول صامت نہیں ہے، مطلق ہے، تو یہی اطلاق حدیث شریف کی بنیاد ہے، یعنی اسکا اطلاق اسکی اپنی مرضی سے نہیں ہے بلکہ آیت شریفہ کا مصداق ہے۔

حدیث دراصل اسلام کا وہ پہلو ہے کہ جسکی وجہ سے راہ نجات روشن ہے، جسکی تاثیر پر دلیل کی کوئی ضرورت نہیں، مینات نظروں کے سامنے ہیں۔ حدیث کی عظمت و اہمیت کا اس طرح سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بہت ہی محدود طبقہ اسکی افادیت پرکتہ چیں ہے، مگر وہ بھی کسی نہ کسی رخ سے حدیث کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

تجدد اور ذہنی کج روی ہمیشہ تاویلات کے سہارے کچھ انحراف پسندانہ بت خانے بناتی رہی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علماء حق نے اپنے تیشہ استدلال سے نظریاتی بت شکنی کا شاندار و خوشگوار فریضہ انجام دیا ہے۔ ایسے بت شکن محققین میں ایک نام مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کا بھی ہے۔

چنانچہ انکی شخصیت کے مختلف جہات اور ابعاد ہیں مگر غالب حیثیت حدیث سے والہانہ شغف اور علم حدیث کی تحقیق و تدوین کی ہے۔ اس فصل میں حدیث کے سلسلہ میں سنین کے اعتبار سے مولانا کی تحقیقی خدمات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

الحاوی لرجال الطحاوی

امام طحاوی | احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن عبد الملک بن سلمہ بن سلیمان بن حامد ابو جعفر ازدی حجازی مصری ثم طحاوی مصر کے ایک گاؤں 'طحا' میں ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے علم و فن کے ہر میدان میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں لیکن 'فقہ' آپکا اہل لسان المیزان ۲/۱۷۳ ابن حجر عسقلانی

خاص میدان عمل رہا ہے۔ امام طحاوی نے ابتداء اپنے ماموں ابو ابراہیم اسمعیل مزنی جو کہ شافعی المسلک تھے، کی خدمت میں رہ کر تلافی و تدبیر حاصل کیا، کتاب السنن وغیرہ کی سماعت انہوں نے مزنی سے ہی کی جسکو مزنی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ لیکن پھر امام طحاوی کا میلان مذہب امام ابو حنیفہ کی طرف ہوتا گیا اور آپ نے امام اعظم کے مسلک کو اپنایا، انکی فقہ کو اپنا طریقہ عمل بنایا اور ایسے پختہ حنفی فقیر ہوئے کہ مصر میں حنفیہ کی قیادت و ریاست آپ پر ختم ہو کر رہ گئی۔ امام طحاوی کے چند مشہور شیوخ و اساتذہ میں ابو ابراہیم اسمعیل مزنی، ہارون بن سعید الایلی، ابو شریح محمد بن زکریا، امام نسائی، ابو عثمان سعید بن بشر، ربیع بن سلیمان الجبزی، وغیرہ ہیں۔ تلامذہ یا روایت کرنے والوں میں ابو الحسن علی بن احمد طحاوی، ابو محمد عبد العزیز بن محمد یحییٰ، ابو بکر بکی، ابو القاسم مسلمہ بن القاسم بن ابراہیم قرطبی، ابو القاسم عبید اللہ بن علی الداودی القاضی وغیرہ ہیں۔ ۳

امام طحاوی کے بارے میں ابن یونس فرماتے ہیں کہ: ”کان ثقة ثبتاً لم یخلف مثله“ ۴ یعنی امام طحاوی ثقہ ہیں، ثبت ہیں، خلف میں انکی مثال نہیں ملتی۔ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ:

”کان الطحاوی کوفی المذہب عالماً بجمیع مذاہب العلماء.“ ۵

امام طحاوی کوفی المذہب ہیں، علماء کے تمام مذاہب سے واقف و باخبر ہیں۔

۱۔ لسان المیزان ۱: ۲۷۳

۲۔ الاعلام ۱: ۲۰۶ - خیر الدین زرکلی

۳۔ الخاوی فی سیرۃ الامام ابی جعفر الطحاوی ص ۶ - ۷ محمد زاہد الکوثری

۴۔ العصر فی خبر من غیر ۲: ۱۸۶ - ذہبی

۵۔ الفوائد المصیبة فی تراجم المخطیة ص ۳۴ - مولانا محمد عبدالحی لکھنوی

۳۲ھ میں امام طحاوی کی وفات ہوئی ہے۔
 طحاوی کثیر التصانیف بزرگ ہیں، سیکڑوں علمی و فقہی کتابیں آپ کی یادگار
 ہیں، انہیں میں دو اہم ترین کتابیں: شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار بھی ہیں۔
 طحاوی کی خصوصیت | ملا علی قاری کی تصریح کے مطابق معانی الآثار امام طحاوی کی
 سب سے پہلی اور مشکل الآثار سب سے آخری تصنیف ہے۔ ۲ متعدد محدثین
 و شارحین نے معانی الآثار کے رجال پر کام کیا اور ان کا تذکرہ مرتب فرمایا ہے، اس
 سلسلہ میں علامہ بدرالدین عینی کی دو جلدوں میں معانی الاختیار فی رجال معانی الآثار
 جس کا قلمی نسخہ کچھ نقص کے ساتھ دارالکتب المصریہ میں موجود ہے۔ ۳ اور قاسم بن
 قطوبغا متوفی ۷۹۵ھ کی ”الاخبار برجال معانی الآثار“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۴
 لیکن مشکل الآثار کے رجال کو اب تک کسی نے موضوع بحث نہیں بنایا تھا۔
 مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار دونوں کے
 رجال و رواۃ پر کام کیا اور ان کے حالات و تذکرے مرتب کئے۔ ڈاکٹر مسعود احمد کے
 لفظوں میں:

”یہ علامہ اعظمی کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں کوئی ان کا ثانی نہیں،
 کیونکہ شرح معانی الآثار کے رجال پر متعدد اہل علم نے کام کیا، لیکن
 شرح مشکل الآثار کی خدمت آپ کی بے نظیر انفرادیت ہے۔“ ۵
 مشکل الآثار کے رجال پر مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے کام کی

۱۔ الباب فی تہذیب الانساب ۲: ۸۲ ابن اثیر

۲۔ الفوائد المہیۃ فی تراجم المحفۃ ص ۳۳

۳۔ الحاوی فی سیرۃ الامام ابی جعفر الطحاوی ص ۳۳

۴۔ اتمان العباد ص ۱۵۴ نواب صدیق حسن خاں

۵۔ حیات ابوالماثر ص ۱۷۸-۱۷۹

بدرت، انفرادیت اور نوعیت کو جان کر اہل علم حضرات کی مسرت کی انتہا نہ رہی، بشیر
 لب محققین کے لئے ”الحاوی“ کی حیثیت ایسی ہو گئی جیسے صحرائیں کسی کو ٹھنڈے پانی کا
 کوئی چشمہ نظر آ جائے اور وہ اس سے اپنی پیاس بجھانے کو بے تاب ہو۔ علامہ شبیر احمد
 عثمانی کے ایک خط مکتوبہ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے،
 لکھتے ہیں کہ:

”کاش (الحاوی) چھپ جاتی، تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی، حق تعالیٰ
 کوئی سامان فرمادیں، انشاء اللہ مناسب موقع پر کوئی کوشش ہو سکی تو دریغ
 نہ ہو گا۔“

جب ”الحاوی“ کے بارے میں علامہ انور شاہ کشمیری کو معلوم ہوا تو آپ کے
 یہاں بھی مسرت و حیرت کی کچھ ایسی ہی کیفیت دیکھنے میں آئی، جسکو ہم آئندہ کسی موقع
 پر نقل کریں گے۔

مولانا اعظمی نے جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ میں ”الحاوی“ کی تصنیف و تالیف کا
 کام مکمل فرمایا، انہوں نے مخطوطہ کے آخری صفحہ پر یہ مادہ تاریخ نکالا:
 ”إنه والله تصنیف شریف ۱۳۴۸ھ۔“

اس کتاب کی تکمیل کے وقت مولانا کی عمر ۲۹ برس تھی۔

مولانا اعظمی کا یہ پہلا تحقیقی کارنامہ ہے، لیکن اب تک یہ کتاب شائع نہ
 ہو سکی؛ اس لئے ”الحاوی“ کے مخطوطہ کے اول اور آخری صفحوں کے عکس پیش کئے
 جا رہے ہیں۔

الحمد لله رب العالمین جو مصنف نے الی و مرسلہ ہمارے دوست و محبت ابوسعید خدری سے
 نو قیسی بن عبد بن بکر حبیبی و لاہور نقیہ بن عبد الرحمن بن خروون و دوری قیسی
 ابو جعفر بن احمد بن زکریا بن ابی حشہ بن ابی مسیرہ و کئی شیخ و کاتب و محدث و محدث
 و لاہور آریہ و شہر بن کعبہ ابی الکرنی نقیہ بن ابی شہر بن کعبہ و لاہور
 ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ

ابن ابی مسیرہ شیخ ابی مسیرہ بن عبد بن زکریا بن ابی حشہ و لاہور
 ابو جعفر بن احمد بن زکریا بن ابی حشہ بن ابی مسیرہ و کئی شیخ و کاتب و محدث و محدث
 ابو جعفر بن احمد بن زکریا بن ابی حشہ بن ابی مسیرہ و کئی شیخ و کاتب و محدث و محدث

و لاہور آریہ و شہر بن کعبہ ابی الکرنی نقیہ بن ابی شہر بن کعبہ و لاہور
 ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ
 الحمد لله رب العالمین

ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ
 ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ

ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ
 ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ
 ابو جعفر بن کعبہ بن خروان بن نقیہ

الحاوی کا آخری صفحہ

= نظروں سے اوجھل تھے، ان کو منظر عام پر لانے میں اس کتب خانہ کا اہم اور قابل قدر رول ہے۔
 اس کتب خانہ کی خوش قسمتی ہے کہ اسکو حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی جیسی علم دوست
 شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے، جن کو کتابوں سے لگاؤ اور علم و تحقیق سے والہانہ محبت ہے۔ علم کے
 فروغ میں اپنے اس اہم علمی کارنامہ پر وہ علمی دنیا کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

منية الألمعي في ما فات من تخریج أحادیث الهدایة للزیلعی

علامہ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف حنفی زیلعی متوفی ۶۲۷ھ نے فقہ کی مشہور کتاب 'ہدایہ' کی احادیث کی تخریج کی ہے۔ زیلعی کی اس تصنیف کا نام 'نصب الراية لأحادیث الهدایہ' ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے 'الدرایہ فی تخریج احادیث الهدایہ' کے نام سے اس کی تلخیص کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے بقول ابن حجر جیسے ماہر فن سے جیسی تلخیص و تنقیح کی امید تھی 'الدرایہ' اس پر کھری نہیں اترتی۔

علامہ قاسم بن قطلوبغا (۷۷۹ھ) نے 'نصب الراية' کی تذیل کی ہے۔ زیلعی نے جن مقامات پر اپنی اصطلاح کے مطابق 'غریب' یا 'غریب جداً' لکھا ہے، علامہ قاسم بن قطلوبغا نے ان کا مخرج بیان فرمایا، اسی طرح سے زیلعی نے جہاں سند و متن کو چھوڑ دیا تھا علامہ قطلوبغا وہاں سند و متن کو ذکر کرتے ہیں۔

قطلوبغا کی یہ کتاب 'منية الألمعي في ما فات من تخریج أحادیث الهدایة للزیلعی' کے نام سے ہے۔ ۱۳۵۷ھ میں مجلس علمی ڈابھیل نے 'نصب الراية' کی جب طباعت کا ارادہ کیا تو 'منية الألمعي' کی تلاش شروع ہوئی اور یہ ارادہ ہوا کہ 'نصب الراية' کے ساتھ اس کو بھی شائع کر دیا جائے، لیکن اس وقت اس کا نسخہ دستیاب نہ ہو سکا اور 'نصب الراية' کو تنہا شائع کرنا پڑا۔

بعد میں اتفاق سے 'منية الألمعي' کا نسخہ شیخ زاہد الکوثری کو ان کے ایک دوست علامہ سید احمد تیمور پاشا کے پاس مل گیا۔ اب زاہد الکوثری اس کی طباعت

۱۔ مقدمہ نصب الراية ۱۳:۱

۲۔ منية الألمعي ص ۴ قاسم بن قطلوبغا

واشاعت کے بارے میں سوچ رہے تھے، انہیں انتظار تھا کہ نصب الراية دوبارہ چھپے تو اس کے ساتھ 'مدیۃ اللمعی' کو شائع کر دیا جائے، لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ حال ہی میں تو مجلس علمی سے 'نصب الراية' چھپی تھی، دوسرے ایڈیشن میں ابھی تاخیر تھی۔ اسی پس و پیش میں شیخ کوثری تھے کہ دوسری جانب ہندوستان میں ابن حجر کی "الدرایۃ فی تخیص نصب الراية" کا ایک مخطوطہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر علامہ قاسم بن قطلوبغا کی تحریر کردہ تعلیقات تھیں، ابن حجر نے جن مقامات پر 'لم أجده' تحریر فرمایا تھا، قطلوبغا نے اپنی تعلیقات میں احادیث کا مخرج ذکر کیا تھا، گویا یہ ایک طرح سے ابن حجر پر قطلوبغا کے استدراکات تھے۔ مولانا الاعظمی اصل مخطوطہ سے تعلیقات کو نوٹ کرتے ہیں، اور مزید تعلیقات و حواشی لکھ کر علامہ زاہد الکوثری کے پاس مصر روانہ فرمادیتے ہیں۔

تحقیق کی دنیا میں مولانا اعظمی کی یہ دریافت علم کی ایک نادر خدمت تھی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے محض مخطوطہ سے عبارت نقل کر کے بھیج دی اس میں ان کا کون سا کمال؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی قدر و قیمت وہی بتائے گا جو اس میدان کا شہسوار ہوگا، یہ اس آبلہ پامحقق کے لئے ایک عظیم نعمت ہے جو تحقیق کی وادی میں برسوں پھرا ہو پھر بھی یہ چیز اس کی دسترس سے باہر رہی ہو۔ شیخ زاہد الکوثری کو جب مولانا اعظمی نے اطلاع دی کہ درایہ کے کچھ حصہ پر قطلوبغا کی تعلیقات دستیاب ہوئی ہیں، تو ان کی مسرت و انبساط کی انتہا نہ رہی اور فوراً مولانا اعظمی سے درخواست کی کہ انہیں نوٹ کر کے بھیج دیں، پھر یہیں سے شیخ کوثری نے 'مدیۃ اللمعی' کی اشاعت و طباعت کا پختہ ارادہ کر لیا۔ شیخ زاہد الکوثری 'مدیۃ اللمعی' کے مقدمہ میں بڑے والہانہ انداز میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خود انہیں کی زبانی اس کی تفصیل سنئے:

".....لکن لم تکن ظروفی تجعلنی أنشط للسعی فی نشر

المنیة حتی بقیت بین إقدام وإحجام إلى أن استنهض حامد
عزیمتی کتاب کریم بعث به إلى هذا العاجز مولانا العلامة
التحریر الجہد الخیر أبو المآثر حبیب الرحمن الأعظمی
عمید کلیة 'مفتاح العلوم' وصدر مدرسہا فی 'أعظم گدہ'
فی الهند، یفیدنی فیہ: أن النصف الآخر من الدراية فی
تلخیص نصب الراية لابن حجر دخل فی حیازته وعلیہ
تعلیقات للحافظ العلامة قاسم بن قطلوبغا بخطه ...،
فطرت فرحاً بذلك النبا السار فبادرت بالکتاب إلى
الأستاذ أبي المآثر المشار إليه راجياً استنساخ تلك
المواضع من الكتاب المذكور فأسرع فی الإجابة بما فطر
علیہ من السجایا الکریمة حیث قام بنسخ التعلیقات بقلمه
المبارک وأرسلها إلى هذا العاجز فأنعشني ذلك....." (۱)
(..... لیکن المنیہ کی نشر و اشاعت کے واسطے کوشش و سعی کے لئے میری
طبیعت آمادہ نہیں ہو رہی تھی، میں اسی پس و پیش میں تھا کہ ایک گرامی
نامہ نے میرے پست ارادے میں تحریک پیدا کر دی، جسے مولانا علامہ
نحریر جہد خیر ابو المآثر حبیب الرحمن الأعظمی جامعہ مفتاح العلوم اعظم گدہ
ہند کے پرنسپل اور صدر مدرس نے اس عاجز کے پاس ارسال فرمایا۔ لکھتے
ہیں کہ ابن حجر کی 'الدراية فی تلخیص نصب الراية' کا ایک نصف اخیر مجھے
دستیاب ہوا ہے، جس پر علامہ قاسم بن قطلوبغا کی تحریر کردہ تعلیقات ہیں،
..... اس خوشخبری کو سن کر میں خوشی سے جھوم اٹھا اور جلدی سے ایک خط

استاذ ابوالآثر کی خدمت میں اس امید پر روانہ کیا کہ مذکورہ کتاب سے ان مواقع تعلیقات کو نقل کر کے بھیج دیں، چنانچہ انہوں نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق ان تعلیقات کو اپنے دست مبارک سے نوٹ کر کے اس عاجز کے پاس ارسال فرمادیا، جسے پا کر میں بہت خوش ہوا.....“

شیخ زاہد الکوثری نے ’مدیۃ اللمعی‘ کے ساتھ ۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء میں ’تعلیقات الحافظ قاسم بن قطلوبغا علی النصف الثانی من الدرایۃ‘ کو شائع کیا ہے۔ مجلس سی سے نصب الراہیہ کا جب دوسرا ایڈیشن ۱۳۹۳ھ میں شائع ہوا، تو اس میں بھی درایہ پر قطلوبغا کی تعلیقات مولانا اعظمی کے حوالہ سے شائع کی گئیں۔ یہ تعلیقات چار صفحے پر ہیں، پہلی تعلق کتاب النکاح میں حدیث ”لا نکاح الا بشہود“ پر ہے۔ مولانا اعظمی نے چار جگہ اس پر حاشیہ لگایا ہے، یہ مولانا کی ہی دین ہے کہ زیلعی پر قطلوبغا کے استدراکات کے ساتھ ساتھ وہ تعلیقات و استدراکات بھی منظر عام پر آ گئے، جو حافظ قطلوبغا نے نصب الراہیہ کی تلخیص پر تحریر فرمائے تھے، اور وہ اب تک اصحاب تحقیق کی نظروں سے اوجھل تھے۔ شیخ کوثری نے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے: ”إنه هو السبب الأوحـد لنشر الاثنین معاً“۔ (مولانا اعظمی) ہی دونوں کی ایک ساتھ نشر و اشاعت کا واحد سبب ہیں۔

کتاب الثقات

ابن شاہین | ابو حفص عمر بن احمد بن عثمان معروف بہ ابن شاہین ایک عظیم المرتبت محدث ہیں، ۲۹ھ میں پیدا ہوئے، مشہور اساتذہ میں محمد بن محمد باغندی، ابو القاسم بغوی، ابو بکر بن داؤد اور ابن ابی شیبہ ہیں۔ شاگردوں میں برقانی، عقیلی اور تنوخی

خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، فلاح کثیر نے ان سے کسب فیض کیا۔
 تزییب، تفسیر، مسند، تاریخ اور زہد کے موضوعات پر انکی کتابیں ہیں، انکے قلم
 گہر بار سے تین سو تیس تصنیفات وجود میں آئیں۔ انہوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں کہ
 ان جیسی کتابیں کسی نے بھی نہیں لکھی۔ وہ ثقہ تھے، البتہ قرأت وغیرہ میں غلطی اور چوک
 ہو جایا کرتی تھی، اور فقہ کی معرفت حاصل نہ تھی۔ محمد بن ابی الفوارس کا بیان ہے کہ ابن
 شاہین کے سامنے فقہاء کے مذاہب کا ذکر ہوتا مثلاً امام شافعی وغیرہ کا تو فرماتے کہ میں
 محمدی المذہب ہوں۔ ۱۲۳۲ ہجری المرجعہ بروز یکشنبہ ۳۸۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

کتاب الثقات کی خصوصیت | ابن شاہین کی ایک کتاب 'کتاب الثقات' ہے،

اس کتاب میں ان محدثین اور رواۃ کا حروف تہجی کے اعتبار سے تذکرہ ہے، جن کی شہادت
 قابل قبول اور حدیث مشہور ہے۔ اور جن سے روایتیں نقل کی جاتی رہی ہیں، جیسے یحییٰ
 ابن معین، عبد الرحمن بن مہدی، احمد بن حنبل، علی بن مدینی اور عثمان بن عبد اللہ وغیرہ۔

کتاب الثقات کا نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں تھا، مولانا اعظمی نے اس
 نسخہ کی ایک نقل تیار کرائی، مخطوطہ کے ناقل قاضی اطہر مبارکپوری تھے۔ قاضی صاحب تحریر
 فرماتے ہیں کہ: "مولانا کے حکم سے میں نے پوری کتاب نقل کی اور میں نے اور مولانا محمد عثمان
 صاحب نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔" اسکے بعد مولانا اعظمی نے اس کتاب کی تحقیق و تعلیق
 کی۔ ۱۰ مارچ ۱۳۵۹ء کو قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ایک خط میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:
 "کتاب الثقات کا کام مکمل ہو گیا، اب اسکی اشاعت کا سوال درپیش ہے۔"

شیخ ابو نعیم کے سامنے جب اس کتاب کا تذکرہ ہوا تو شیخ نے اصرار کیا کہ میں

۱۔ تاریخ بغداد ۱۱: ۲۶۴-۲۶۵ خطیب بغدادی

۲۔ طبقات الحفاظ ص ۳۹۳ جلال الدین سیوطی

۳۔ تاریخ بغداد ۱۱: ۲۶۶

۴۔ ایضاً ص ۲۶۷

۵۔ دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۳

۶۔ ترجمان الاسلام ۱۱: ۱۲ ص ۴۶

[illegible]

قدّم الميرزا حسين في مرض الموت جليله ما بين يديه من ثوبين من الحرير
مولى عبد الكريم ابو عيسى الخلد وخاله احمد مولى ميرزا محمد خلد وخاله احمد خلد

کتاب الثقات کا آخری صفحہ

نوٹ:- کتاب اشقات کے مخطوطہ کا عکس راقم الحروف کو محدث اعظمی لاہوری سے دستیاب ہوا۔

انتقاء الترغیب والترہیب

اللہ تعالیٰ نے نیکی اور اس کے فضائل و مناقب، ہدی اور اسکے معصیات و عیوب کو قرآن میں کھلے اور واضح لفظوں میں بیان فرمایا ہے، اور ان دوراہوں میں کسی ایک کے انتخاب پر ہونے والے ثواب و عذاب کو بھی واضح فرمادیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام یہ بھی ہے کہ اس نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اعمال پر مرتب ہوئے والے ثواب و عذاب سے مطلع فرمادیا تاکہ وہ اسکے ذریعہ لوگوں کو تبلیغ کریں، جس سے لوگوں کے قلوب میں اعمال صالحہ کی رغبت اور اعمال سیئہ کرنے سے خوف پیدا ہو اور وہ جذبہ فطری کے تحت عمل کریں۔

تہذیب نفس یا ترغیب و ترہیب کے موضوع پر حدیث کی مستقل کتابیں تالیف کی گئیں ان مجموعوں میں احکام سے متعلق احادیث نہ جمع کر کے صرف ترغیب و ترہیب سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر تالیف کرنے والے مشہور ائمہ حدیث میں ابن زنجویہ متوفی ۲۳۸ھ ابن شاہین متوفی ۳۸۵ھ، یحییٰ متوفی ۴۵۸ھ، ابوالقاسم اصہبانی متوفی ۵۳۵ھ، ابو موسیٰ مدینی متوفی ۵۸۱ھ امام حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری متوفی ۶۵۶ھ ہیں۔

منذری کی ”الترغیب والترہیب“ کو سب سے زیادہ شہرت ملی کیونکہ اس کتاب میں دوسری تمام کتابوں کے مشمولات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ صحاح ستہ اور مستند کتابوں کے حوالے ہیں، اسناد کی صحت اور ضعف کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس

۱۔ حجتہ اللہ البالغہ ۳۲۶:۱ شاہ ولی اللہ دہلوی

۲۔ الترغیب والترہیب ۱۳۱-۱۵۰ منذری

کتاب میں موضوع احادیث نہیں ہیں۔ لیکن اسکے باوجود اس میں ضعیف احادیث کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ احادیث فضائل اعمال کے سلسلہ میں ہیں اور فضائل میں ضعیف احادیث قابل قبول ہیں، لیکن پھر بھی بقول مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے حدیث، ضعف اور وہم کے شائبہ سے جتنا دور ہوگی اتنی ہی مؤثر اور اوقع فی النفس ہوگی۔

چنانچہ اس قاعدہ کی رو سے منذری کی ترغیب و ترہیب کے انتقاء کی ضرورت تھی۔ اختصار کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ یہ کتاب بہت مفصل اور مطول ہوگئی تھی جس سے اصحاب علم یا جن کو حدیث سے شغف ہو وہی استفادہ کر سکتے تھے، عام طالب علم کے لئے سہل الاستفادہ نہ تھی۔ اس اہم کارنامہ کو امام الحافظ حافظ ابن حجر نے انجام دیا۔ انہوں نے اس کتاب کا انتقاء کر کے اس کو مفید سے مفید تر بنا دیا۔

حافظ ابن حجر شلاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن محمد کنانی عسقلانی مصری شافعی مصر میں ۳۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد میں کسی کا نام حجر تھا، انھیں کی طرف منسوب ہو کر آپ ابن حجر سے مشہور ہوئے۔ ابن حجر کے والد کی کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی، وہ بہت افسردہ خاطر رہتے، ایک دن مشہور بزرگ شیخ صنابری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی، شیخ نے دعا دی کہ تیرے پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو ساری دنیا کو علم کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔ ۲

یہی ہوا بھی کہ ایسی جامع شخصیت دنیا میں وجود پذیر ہوئی کہ دنیا اسکی مثال لانے سے عاجز ہے۔ ابن حجر نے بہت سے محدثین عظام اور ائمہ وقت سے استفادہ کیا، ان میں مشہور اساتذہ شیخ ابو عقیف نشاوری، حافظ ابو حامد محمد بن ظہیرہ، حافظ زین

۱۔ طبقات الحفاظ ص ۵۵۲ سیوطی

۲۔ بستان المحمدین ص ۱۲۷ شاہ عبدالعزیز

الدین عراقی، عبد الرحیم بن رزین، ابو حفص عمر بن رسلان بلقینی، ابراہیم بن موسیٰ،
مجد الدین فیروز آبادی وغیرہ ہیں۔ آپ سے علم حدیث حاصل کرنے اور کسب فیض
کے لئے دور دراز علاقوں سے طالبان علم آتے تھے، خانقاہ پھرس میں انہوں نے تقریباً
تیس سال تک حدیث املا کرائی، مصر کے اکثر علماء نے ان سے قراءت سیکھی۔ امام محمد
بن عبد الرحمن سخاوی، برہان الدین ابراہیم بن عمر بقاعی، ابن فہدکی، زکریا بن عمر
الانصاری جیسے ائمہ آپ کے شاگردوں میں ہیں۔

قدماء نے آپ کے حفظ، ثقاہت، امانت، معرفت تامہ، روشن دماغی، حد
سے بڑھی ہوئی ذہانت اور مختلف فنون میں آپ کے تجر اور وسعت علمی کی شہادت دی
ہے۔ امام شوکانی انکی شان میں لکھتے ہیں کہ: "الإمام المنفرد بمعرفة الحديث
وعلمه في الأزمنة المتأخرة." (۴) حدیث اور اسکے علل کی معرفت میں بعد کے
زمانہ میں یہ (ابن حجر) ایک منفرد امام ہیں۔

ابن حجر نے ہر فن میں ملکہ حاصل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپ کی ذات علم
و تحقیق کا محور بن گئی اور تاریخ اسلام نے ان کو حافظ الحدیث، محی السنۃ، خاتمۃ الحفاظ
جیسے مؤقر القاب سے نوازا۔ ابن حجر صاحب التصانیف امام ہیں، شاہ عبدالعزیز دہلوی
کے بقول ابن حجر کی تصنیفات کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے۔ ۵ فتح الباری شرح
البخاری، تہذیب التہذیب، الدراایہ فی منتخب تاریخ احادیث الہدایہ، الاصابہ فی تمییز
الصحابہ آپ کی علمی حذاقت و مہارت کی روشن مثالیں ہیں۔ انتقاء الترغیب والترہیب

۱۔ الدرر الكامنة فی أعيان الائمة الثامنة ۳: ۳۹۲-۳۹۳ ابن حجر عسقلانی

۲۔ شذرات الذهب ۷: ۲۷۱ ابن عماد حنبلی

۳۔ الضوء اللامع ۲: ۳۹۲ سخاوی

۴۔ البدر الطالع ۱: ۸۷ شوکانی

۵۔ بستان المحمدین ص ۱۲۸

بھی ابن حجر کی ایک اہم تالیف ہے۔ ۲۸ رذی الحجہ ۸۵۲ھ میں قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی۔

انتقاء الترغیب والترہیب کی خصوصیات | مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن حجر عسقلانی نے منذری کی کتاب ”الترغیب والترہیب“ کا اختصار کیا ہے۔ حجم میں یہ ”اختصار“ اصل کتاب کے چوتھائی حصہ کے بقدر ہے۔ ابن حجر نے منذری سے انہیں حدیثوں کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جو سند اقویٰ اور متناصح ہیں۔ انہوں نے متحد المعانی احادیث میں سے چند کے ہی ذکر پر اکتفاء کیا اور رواۃ پر ایک یا دو جملوں میں کلام کیا ہے۔ مولانا مزید فرماتے ہیں کہ یہ ایک عمدہ اور پاکیزہ کتاب ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسکی اسانید اور متون کی تحقیق کئے بغیر ہی اس پر اعتماد کیا جائے۔

تصحیح و تعلیق | مولانا اعظمی کو جنہیں ہمیشہ نادر مخطوطات کی تلاش رہتی تھی، مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے متروکات میں انتقاء الترغیب والترہیب کا سب سے پہلا مخطوطہ دستیاب ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دوسرا نسخہ ملا، اسکا تیسرا نسخہ مولانا اعظمی کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے پہلی مرتبہ جب انتقاء کا نسخہ دیکھا تھا تو اسی وقت اس کی تصحیح و طباعت کا ارادہ کر لیا تھا، لکھتے ہیں:

”رأيت هذا المختصر في بهرائج وخطر ببالي خاطر طبعه

بعد تصحيحه ليعم النفع به.“ ۲

(میں نے اس مختصر کو بہرائج میں دیکھا اور تصحیح کر کے اس کی طباعت کا

۱۔ انتقاء الترغیب والترہیب ص ۲

۲۔ ایضاً ص ۳

خیال میرے دل میں آیا، تاکہ اس کا نفع عام ہو۔

مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے نسخہ کو عاریۃ حاصل کیا اور مولانا عبد الحمید نعمانی نے اس سے ایک دوسرا نسخہ تیار کیا، پھر مولانا الاعظمی نے اس نسخہ کا لکھنؤ یونیورسٹی کے نسخہ سے مقابلہ کیا، ان نسخوں میں کتابت کی غلطیاں اور کاتبوں کے تصرفات بکثرت تھے۔ مولانا عبد الحمید نعمانی اور مولانا محمد عثمان مالیکانوی نے اپنے تیار کردہ نسخہ کی مندری کی اصل کتاب سے مقابلہ کر کے تصحیح کی۔ اور مولانا الاعظمی نے اس نسخہ کے ابتدائی حصہ اور آخر کے تقریباً ستر (۷۰) صفحات کی تصحیح کی اور تعلیقات لکھیں، دارالعلوم کے نسخہ کو اصل قرار دیا، کتاب کے شروع میں حافظ مندری اور حافظ ابن حجر کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔ تصحیح میں اہتمام برتنے کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہیں، چنانچہ کتاب کے آخر میں ان اغلاط کی فہرست بھی دی گئی۔

یہ کتاب ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء میں ادارہ احیاء المعارف مالیکانوی سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ انتقاء الترغیب والترہیب اس ادارہ کی پہلی اشاعت تھی۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے مطابق اسی ادارہ کی برکت تھی کہ مولانا اعظمی کا علمی مقام تسلیم کیا گیا ورنہ اس سے پہلے ان کے علم کا فیض مختصر رسائل تک محدود تھا۔

مولانا الاعظمی نے ”انتقاء الترغیب والترہیب“ شائع کر کے یقیناً ایک عظیم

۱۔ کاروانِ حیات (خودنوشت سوانح) مشمولہ مجلہ ضیاء الاسلام (قاضی اطہر نمبر) ج: ۳، ش: ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰
ڈاکٹر مسعود احمد نے قاضی اطہر مبارکپوری کی اس بات سے سخت اختلاف کیا۔ اور اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا کہ مولانا اعظمی کی شہرت و ناموری ’ادارہ احیاء المعارف‘ کی مرہون منت تھی ا
’انتقاء الترغیب والترہیب‘ کا سن اشاعت ۱۹۶۰ء ہے۔ اور ۱۹۶۰ء سے پہلے مولانا اعظمی کو علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہو چکی تھی، ڈاکٹر مسعود احمد نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا کہ مولانا کی شہرت کا باعث ’انتقاء الترغیب والترہیب‘ کی اشاعت نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون ”دہشتِ عجم سے تاجِ عرب“ کے عنوان سے مجلہ ’الماثر‘ ج: ۱۲، ش: ۴، میں ۲۵ صفحات پر شائع ہوا ہے۔

کام کیا ہے۔ کیونکہ جن طلبہ کے لئے مطلوب سے استفادہ آسان نہ تھا انکے لئے ابن حجر کی ”انتقاء“ ایک بہترین تحفہ ہے۔ اس کتاب کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ترغیب و ترہیب کے سلسلہ میں بہت سی معتبر حدیثیں ایک ہی کتاب میں مل جاتی ہیں۔

تعلیقات کے نمونے:

۱۔ ص: ۳۳: ج: ۱۲۳..... ورجل صلی علی جنازۃ ولم یؤمر الخ
دارالعلوم دیوبند اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ”انتقاء الترغیب والترہیب“ کے نسخوں میں ’لم یؤمر‘ کے بجائے ’لم یتوضأ‘ لکھا ہوا تھا۔
مولانا الاعظمی کے نزدیک یہ تصحیف تھی، صحیح ’لم یؤمر‘ ہے، جیسا کہ آپ متن میں دیکھ رہے ہیں۔

۲۔ ص: ۶۹: ج: ۲۵۶..... فإن الصدقة فکاکم الخ
دیوبند کے نسخہ میں ’فکاکۃ‘ ہے، مولانا الاعظمی فرماتے ہیں کہ دیوبندی نسخہ میں ’فکاکۃ‘ غلط ہے، صحیح ’فکاکم‘ ہے۔ مولانا نے اپنی تصحیح کے سلسلہ میں منذری کا حوالہ دیا۔

۳۔ ص: ۹۵: ج: ۳۵۸..... ”وأمان حرک فهو مذخور لک عند ربک“
(رب کے نزدیک تمہاری قربانی ذخیرہ ہے)

بنیادی نسخہ اور لکھنؤ کے نسخہ میں ’مذخور‘ کے بجائے ’حور‘ تھا۔ مولانا الاعظمی نے منذری کی کتاب کے حوالہ سے اسکی تصویب و تصحیح کی اور متن میں ’مذخور‘ تحریر فرمایا، جس سے یہ جملہ بامعنی ہوا۔

رسالة الأوائل

محمد سعید بن سنبل مجذائی، مکی شافعی المسلک فقیہ ہیں۔ مسجد حرام میں درس و افتاء کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، ۱۲۵۷ھ میں طائف میں آپ کی وفات ہوئی۔ الأوائل السنبلیۃ، اجازات للسید عطاء الدین، اسناد محمد سعید اور ثبت آپ کی تصنیفی یادگار ہیں۔

رسالة الأوائل کی خصوصیت | رسالة الأوائل کو الأوائل السنبلیۃ بھی کہا جاتا ہے، یہ کتاب کیسے معرض وجود میں آئی خود سعید بن سنبل کے الفاظ میں سنئے:

”طلب مني من له حسن ظن بي وهو أعلى مني أن أسمع شيئاً من أوائل كتب الحديث المشهورة فأجبت له ذلك؛ وإن لم أكن أهلاً لذلك؛ لكنني وجدت تأليفاً لبعض الأعلام، فيه طول عن تحصيل المرام؛ فأحببت أن ألخص مما ذكر فيه: أول حديث من كل تأليف سطره تاركاً لباقيه روماً للاختصار وليقرأ في مجلس واحد لأهل الاستبصار.“ ۱

(بعض لوگوں نے جو مرتبہ میں مجھ سے بلند ہیں اور میرے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں، یہ خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں مشہور کتب حدیث سے شروع کی کچھ حدیثیں سناؤں۔ میں نے انکی یہ فرمائش قبول کر لی، اگرچہ میں اس کا اہل نہیں تھا، لیکن مجھے بعض مشاہیر کی ایک تالیف مل گئی جس میں تحصیل مقصد سے زیادہ طوالت تھی، چنانچہ کتاب میں مذکورہ باتوں کی

تلخیص کرنا میں نے بہتر سمجھا کہ جن کتابوں کا اس میں ذکر ہے انکی پہلی حدیث کو نقل کروں اور اختصار کی غرض سے بقیہ کو چھوڑ دوں، ایسا اس نے بھی کیا کہ ایک ہی مجلس میں اہل نظر کے سامنے اسکی قرأت ہو جائے۔
اس رسالہ میں سعید بن سنبل نے ۴۳ کتب حدیث سے ایک ایک حدیث اپنی سند سے نقل کی ہے۔

طباعت و اشاعت پہلی مرتبہ اس رسالہ کو مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے مطابق مولانا نور محمد رسواوی نے مطبعة اکلیل المطابع (جو پہلے رسوا میں قائم ہوا تھا پھر بہرائچ منتقل ہو گیا تھا) میں طبع کرایا تھا، دوسری مرتبہ مصر سے شائع ہوا۔ لیکن افسوس کہ اس کے دونوں نسخے نایاب ہو گئے، ہند و بیرون ہند اس کے نسخوں کا ملنا مشکل ہو گیا۔ بعض اہل علم نے مولانا الاعظمی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ مولانا کے پاس ہندوستانی ایڈیشن کا ایک نسخہ موجود تھا، جس میں بعض جگہ شیخ عبدالحق مہاجر کی کی تعلیقات بھی تھیں، لیکن اس ایڈیشن میں طباعت کی غلطیاں تھیں، مولانا لکھتے ہیں:

”وكان في تلك الطبعة بعض الأخطاء المطبعية“

فاصلحتھا۔“

(اور اس ایڈیشن میں طباعت کی کچھ غلطیاں تھیں، جنکی میں نے اصلاح کر دی ہے۔)

اس طرح سے ’رسالۃ الاول‘ جس کے دو ایڈیشن بہت پہلے شائع ہوئے تھے، لیکن اسکے نسخے نایاب ہو چکے تھے، ایک بار پھر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی گرانقدر کاوشوں کے نتیجہ میں اسکے نسخے عام اور دستیاب ہیں۔ ’رسالۃ الاول‘ کا یہ تیسرا ایڈیشن مولانا اعظمی کی تصحیح و اصلاح کے ساتھ ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں مکتبہ الاعظمی

مسکو اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

آخر میں صفحہ ۳۱ پر مولانا اعظمی نے اپنے مشفق استاذ محترم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب کی جانب سے رسالۃ الأوائل کی عطا کردہ اجازت و سند کو بھی نقل فرمایا ہے، اور صفحہ ۳۴ پر مولانا اعظمی نے مولانا عبدالغفار صاحب کی جانب سے کتب صحاح، جوامع، سنن، مسانید، مسلسلات اور اوراد و اذکار وغیرہ تمام چیزوں کی اجازت کا ذکر کیا ہے، جس کو سوانح کے باب میں نقل کیا جا چکا ہے۔

مسند حمیدی

مسند | اس مجموعہ حدیث کو کہتے ہیں جس میں احادیث کے موضوعات اور ابواب کا لحاظ رکھے بغیر ہر صحابی کی علیحدہ علیحدہ حدیثیں مع انکی اسناد کے جمع کر دی گئی ہوں۔ مسانید کے مرتب کرنے میں بیشتر افضلیت کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ پہلے خلفائے اربعہ، پھر عشرہ مبشرہ اور خلفائے اربعہ میں بھی پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ، پھر حضرت عمرؓ وغیرہ بالترتیب کی مسانید کو نقل کیا جاتا ہے۔

مسانید بہت ہیں شیخ محمد بن جعفر الکتانی نے ۸۰ سے زائد مسانید کا ذکر کیا ہے، اور پھر آخر میں کہا "والمسانید کثیرۃ سوی ما ذکرناہ" ابن الصلاح لکھتے ہیں کہ مسانید کا درجہ سنن سے کمتر ہے کیونکہ اصحاب سنن انہیں حدیثوں کو نقل کرتے ہیں جو ان کی نظر میں سب سے صحیح ہوتی ہیں برخلاف مسانید کے مرتب کرنے والوں کے، کہ وہ اپنی مسند میں صحابی کی روایت کردہ ہر حدیث نقل کرتے ہیں خواہ وہ قابل حجت ہو یا نہ ہو۔ ۳

۱۔ مسند ابوداؤد طیالسی ص ۵۰ ابوداؤد طیالسی
۲۔ الرسالۃ المستطرفہ ص ۶۳ محمد بن جعفر الکتانی
۳۔ مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۴ ابن صلاح

مختلف امصار و ممالک میں مختلف ائمہ حدیث نے مسانید مرتب کی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ کس نے سب سے پہلے مسند مرتب کی، ذہبی خلیلی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ بصرہ میں سب سے پہلے صحابہ کی ترتیب پر مسند مرتب کرنے والے ابوداؤد طیالسی ہیں^۱ حاکم کا کہنا ہے کہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے رجال کے اعتبار سے مسند کی تصنیف کرنے والوں میں عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ اور ابوداؤد طیالسی ہیں^۲ اگرچہ مسند ابوداؤد طیالسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ طیالسی کی مرتب کردہ نہیں ہے، بلکہ بعض خراسانی حفاظ نے اسے مرتب کیا تھا۔^۳

ابن عدی عبد اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ کوفہ میں سب سے پہلے یحییٰ حمانی نے، بصرہ میں مسدد نے، اور مصر میں اسد السنہ نے، مسانید مرتب کیں^۴ ابن خطیب لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے مسند تصنیف کرنے والے نعیم بن حماد ہیں^۵ مسانید مرتب کرنے والوں میں امام حمیدی کا بھی نام آتا ہے، سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں مسند مرتب کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔^۶

قطع نظر اسکے کہ کس نے سب سے پہلے مسند مرتب کی یہ بات تو یہاں واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا ائمہ حدیث مسانید کی تالیف میں صف اول میں ہیں۔

امام حمیدی | ابوبکر عبد اللہ بن زبیر بن عیسیٰ قرشی، اسدی، سلسلہ نسب رسول اللہ ﷺ سے قصبی میں اور زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ سے اسد بن عبد العزیٰ پر جا کر ملتا ہے۔

۱۔ سیر اعلام النبلاء ۵۵۴:۹ ذہبی

۲۔ تدریب الراوی ۱۴۰:۲ جلال الدین سیوطی

۳۔ ایضاً

۴۔ الکامل ۹۸:۹ ابن عدی

۵۔ تاریخ بغداد ۳۰۸:۱۳ خطیب بغدادی

۶۔ مسند امام احمد بن حنبل ۵۶:۱

بحر عمدة القاری ۴۲:۱ بدرالدین عینی

شیوخ میں ابراہیم بن سعد، فضیل بن عیاض، سفیان بن عیینہ، امام شافعی وغیرہ ہیں۔ اور امام بخاری، محمد بن یونس، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو زرعة، بشر بن موسیٰ جیسے مشہور ائمہ حدیث کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

علم و فن میں امام حمیدی کا مقام بہت بلند ہے، حدیث اور فقہ میں آپ کو اس درجہ کمال حاصل تھا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو حمیدی کی روایت سے صرف اس لئے شروع کیا کہ وہ قریش میں سب سے بڑے فقیہ تھے۔^۱ حافظہ اس قدر مضبوط تھا کہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کسی باطنی مزاج شخص کو حمیدی سے زیادہ حافظہ والا نہیں دیکھا، انہیں صرف سفیان بن عیینہ سے دس ہزار حدیثیں یاد تھیں۔^۲

یعقوب فسوی کا بیان ہے کہ میری ملاقات کسی ایسے شخص سے نہیں ہوئی جو حمیدی سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہو۔^۳ عبدالرحمن نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابن عیینہ سے روایت کرنے میں حمیدی سب سے زیادہ معتبر ہیں، وہ اصحاب عیینہ کے سردار ہیں، ثقہ ہیں، امام ہیں۔^۴ جب امام بخاری کو کوئی حدیث ان سے مل جاتی تو پھر کسی دوسرے ثقہ راوی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ سمجھتے، بخاری نے ان سے ۷۵ حدیثیں روایت کی ہیں۔^۵

امام حمیدی کی سیرت کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ فقہائے عراق کے سلسلہ میں سخت گیر تھے، ان کے بارے میں سخت کلامی کیا کرتے، حمیدی کو جب غصہ آتا تو

۱۔ فتح الباری ۱۰: ۱ ابن حجر عسقلانی

۲۔ طبقات الشافعیہ ۳۶۴: ۱ ابن سبکی

۳۔ سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۶۱۷

۴۔ البحر والتمدیل ج: ۲، قسم ۲: ص ۵۷، عمدۃ القاری ۱: ۳۵۵، سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۶۱۷، تہذیب التہذیب ۵: ۱۹۳

۵۔ تہذیب التہذیب ۵: ۱۹۳ ابن حجر عسقلانی

از خود رفتہ ہو جاتے اور گفتگو میں درشتی اور سختی پر اتر آتے۔^۱

امام حمیدی کی جلالت علمی، فضل و کمال اور حدیث میں آپ کی امامت کو معاصرین نے فراخ دلی کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ اور آپ کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ امام صاحب کا مکہ مکرمہ میں ۲۱۹ھ میں انتقال ہوا۔^۲ امام حمیدی کی چند اہم تصانیف بھی ہیں۔ انکی تصنیفات میں کتاب الرد علی النعمان اور کتاب التفسیر عن الحمیدی کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ انکی سب سے مشہور تصنیف ”مسند“ ہے۔

مسند حمیدی کی خصوصیات | یہ امام حمیدی کی شہرہ آفاق حدیث کی کتاب ہے، اس میں ۱۲۹۳ حدیثیں ہیں، بیشتر مرفوع ہیں، صحابہ و تابعین کے کچھ آثار بھی منقول ہیں۔ پہلی حدیث حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بستان المحدثین میں مسند حمیدی کی جو پہلی حدیث نقل کی ہے وہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔^۳

لیکن یہ واقعہ کے بالکل برعکس ہے، مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اس بابت تحریر فرماتے ہیں:

”ولعله لم يقف على مسند الحميدي و كان عنده نقل عن بعض المصنفين واعتمده والواقع خلاف ذلك، فإن أول مسند الحميدي كما ترى حديث أبي بكر الصديق في صلوة التوبة..... وكيف يفتح الحميدي مسنده بحديث جابر..... وقد جرت عادة مصنفی المسانيد أنهم يفتحون

۱۔ مقدمہ مسند حمیدی

۲۔ کتاب الانساب ۹۲:۲ سمعانی

۳۔ بستان المحدثین ۹۴

مسانیدہم بأحادیث أبی بکر الصدیق۔^۱

(شاید شاہ صاحب کو مسند حمیدی کا (اصل) نسخہ نہ ملا ہو، اور انکے پاس کسی مصنف کا نقل کردہ نسخہ ہو اور اسی پر وہ اعتماد کر بیٹھے ہوں۔ یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے، کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت ابو بکر صدیقؓ سے نماز توبہ کے سلسلہ میں مروی ہے۔ اور ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ حمیدی اپنی مسند کو حضرت جابر کی حدیث سے شروع کریں جبکہ عام طور پر مصنفین اپنی مسانید کی ابتدا حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایات سے کرتے ہیں۔)

یہ مسند گیارہ اجزاء پر مشتمل ہے، یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ کتاب میں ”الجزء العاشر“ عنوان کے بعد حدیث نمبر ۱۲۴۶ پر ”تم الجزء“ لکھا ہوا ہے، حالانکہ اسکے بعد قاعدہ کی رو سے ”اول الجزء الحادی عشر“ لکھا جانا چاہئے، جو کہ نہیں لکھا ہوا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کتاب کا کوئی جز و ناقص رہ گیا ہو۔

اس کتاب کے گیارہ ہی اجزاء ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ ناخین کو کتاب کے اجزاء میں ایجاز و اطناب کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی وجہ سے ترتیب میں کمی یا زیادتی ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیث نمبر ۱۲۴۶ کے بعد ”الجزء الحادی عشر“ کا عنوان درج ہونے سے رہ گیا ہو۔^۲

مسند حمیدی کے رواقہ | حمیدی سے مسند کو ابو اسمعیل سلمی متوفی ۲۸۰ھ نے اور ابو اسمعیل سے قاسم بن اصغ نے روایت کیا ہے، دوسرے جلیل القدر راوی بشر بن موسیٰ اسدی متوفی ۲۸۸ھ ہیں، حافظ ابن حجر کے بقول حمیدی سے مسند کی روایت کرنے

والے اور بھی کئی راوی ہیں۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مسند حمیدی کا جو مخطوطہ محفوظ ہے وہ صرف بشر بن موسیٰ کی روایت کا ہے، مولانا الاعظمیٰ نے اسی نسخہ کو مرتب کیا ہے۔
تصحیح و تعلیق | قدیم مسانید کے بارے میں ہم قدیم زمانہ سے سنتے چلے آ رہے تھے لیکن ان سے استفادہ آسان تو کیا، ناممکن سا تھا۔ مخطوطات کی شکل میں یہ ذخیرہ حدیث دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی خال ہی خال پایا جاتا، یہ قیمتی سرمایہ حدیث ضائع ہی ہونے کو تھا، یہ تو دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کا امت مسلمہ پر دیگر احسانات میں سے ایک زبردست احسان ہے کہ 'مسند ابوداؤد طیالسی' کو پہلی مرتبہ ۱۳۲۱ھ میں طبع کر کے عام کیا اور ہم ایک فرض کفایہ سے عہدہ برآ ہو گئے۔ ایک عرصہ سے مولانا حبیب الرحمن الاعظمیٰ کے دل میں یہ خواہش تھی کہ کاش کوئی اللہ کا بندہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور بقیہ مسانید کی بھی دریافت کرتا! جس سے مستشرقین کی طرف سے صحاح پر ہونے والے ان اعتراضات کی بھی تردید ہو جاتی کہ تدوین احادیث میں مرور زمانہ کا اثر ضرور ہوا ہوگا، جس کے باعث یہ ذخیرے قابل اعتماد نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس نیک آرزو کی تکمیل کا شرف مولانا الاعظمیٰ کو ہی بخشا، مولانا کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں مسند حمیدی کا ایک مخطوطہ مل گیا۔ تلاش و جستجو نے آثار و معارف ص ۲۰۶ قاضی اطہر مبارکپوری

۲۔ مسند حمیدی کا یہ قلمی نسخہ بڑے سائز پر ہے، ۱۳ صفحات ہیں، ہر صفحہ پر ۲۵ سطریں ہیں، ہر دو ورق کے درمیان ایک سادہ ورق ہے، شروع میں فہرست بھی ہے، سنہ کتابت ۱۳۲۳ھ، کاتب کا نام درج نہیں۔ (تعارف مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند: ۱۲۵-۱۲۶ مفتی محمد ظفیر الدین) مسند حمیدی کے دیوبندی نسخہ کے دو کاتب ہیں ایک تو خود مالک مخطوطہ مولانا محی الدین الہادی ہیں اور دوسرے میاں نذیر حسین صاحب کے شاگرد مولوی حافظ نذیر حسین عرف زین العابدین ہیں۔ (راحۃ القلب والعینین باحادیث ترک رفع الیدین صفحہ ۱۱۰ مولانا احمد اللہ قاسمی)

کے بعد ۱۹۵۸ء میں مکتبہ سعیدیہ میں مسند حمیدی کا دوسرا نسخہ دستیاب ہوا، جو ۱۳۱۱ھ کا مکتوبہ تھا، ان دو نسخوں کے ہاتھ لگ جانے پر مولانا نے مسند حمیدی کی تحقیق و تحشیہ کا پختہ ارادہ کر لیا، اسی اثناء میں ۱۱۵۹ھ سے پہلے کے لکھے ہوئے ایک اور نسخہ کی اطلاع ملی جو کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں موجود تھا۔ عثمانیہ کا قلمی نسخہ نسبتاً زیادہ صحیح اور قدیم تھا۔

انہیں تین نسخوں کی مدد سے تحقیق کا کام شروع ہوا، مولانا نے دیوبند کے نسخہ کو بنیادی نسخہ قرار دیا اور اس کا مقابلہ مکتبہ سعیدیہ اور جامعہ عثمانیہ کے نسخوں سے کیا، ایک ایک حدیث کو ان تینوں نسخوں سے ملایا گیا اور ایک ایک لفظ و حرف کا پوری امانت و ذیانت کے ساتھ پاس و لحاظ رکھا گیا۔ جب مسند حمیدی کی طباعت کا کام شروع ہوا تو اسی دوران دارالکتب الظاہریہ دمشق سے مائیکروفلم کے ذریعہ تیار کردہ مسند حمیدی کا چوتھا نسخہ ملا، جس سے تصحیح و تحشیہ میں کافی کچھ مدد ملی۔

مولانا نے صرف تصحیح پر ہی اکتفاء نہیں کیا، بلکہ احادیث کی امہات کتب اور متداول کتابوں سے تخریج بھی کی کہ کن کن کتابوں میں، کہاں پر، اور کن طرق سے یہ احادیث آئی ہیں۔ زیادہ تر صحیحین اور سنن اربعہ کے حوالے پر اکتفاء کیا گیا ہے، جہاں ضرورت پڑی وہاں الفاظ غریبہ کی تشریح و توضیح بھی کی اور اختلاف نسخ کو بھی واضح کیا۔ مسند حمیدی کے اخیر میں اصول سنت سے متعلق حمیدی کا ایک مختصر رسالہ بھی ہے، یہ رسالہ چاروں مخطوطات میں تھا، مولانا نے اس کو اسی طرح سے مسند کے اخیر میں ملحق کر کے شائع کیا۔

اس کتاب میں مسانید کو جمع کیا گیا ہے یعنی درجات صحابہ کے اعتبار سے احادیث مرتب کی گئی ہیں، اس لئے اگر کسی صحابی کی حدیث کی تلاش ہو تو باسانی مل جائے گی، لیکن اگر فقہی مسئلہ سے متعلق حدیث تلاش کی جائے تو یقیناً یہ ایک دشوار گزار

امر ہوگا، اس وقت سے بچنے کے لئے مولانا الاعظمیٰ نے جدید اسلوب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند فہرستیں تیار کیں، فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق ایک فہرست، اعلام وامکنہ کی فہرست، اور ایک فہرست مسانید کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں صحابی کی حدیث فلاں صفحہ پر ہے، مسانید کی فہرست مولانا الاعظمیٰ کی تیار کردہ نہیں ہے بلکہ یہ فہرست مولانا محی الدین الہ آبادی نے مرتب کی تھی، جس کا تذکرہ خود مولانا الاعظمیٰ نے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ اشاریہ دیوبند کے نسخہ سے ملحق تھا، دیوبند کا نسخہ مولانا محی الدین الہ آبادی کی ہی ملک تھا، جسکو انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو وقف کر دیا تھا۔
مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ نے ۲۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب پر مقدمہ بھی لکھا، جس میں مسانید کی تاریخ، مسند حمیدی کا تعارف اور اس کے رواۃ کے مختصر حالات تحریر کئے۔ اس مسند کو کس طرح مرتب کیا گیا، تصحیح و تحشیہ میں کن امور کا لحاظ رکھا گیا، مولانا نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اخیر میں انہوں نے اپنے فرزند مولانا رشید احمد صاحب اور شاگرد عزیز مولانا عبدالستار صاحب کا ذکر کرتے ہوئے انہیں دعائیں دیں کہ انہوں نے مسند حمیدی کے نقل و تمییز اور نسخوں کے باہم مقابلہ میں تعاون کیا۔

مولانا نے تحقیق کے کام کو یہیں نہیں روک دیا، بلکہ پوری مسند کا غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا کہ کہیں کوئی غلطی نہ رہ جائے اور اپنی ہی تحریر میں جلد اول میں چوبیس صفحات پر استدراکات لکھے اور فروگزاشتوں کی اصلاح کی۔ اور جلد ثانی میں ”الاستدراک والتعقیب“ کا عنوان قائم کر کے تین صفحات میں اغلاط کی تصحیح کی۔

۱۔ مولانا محی الدین جعفری زبیدی بانی مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد مولانا حکیم فخر الدین صاحب کے والد ماجد تھے۔

۲۔ مقدمہ مسند حمیدی

مسند حمیدی پہلی مرتبہ ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں مجلس علمی
ڈابھیل سے شائع ہوئی۔ مسند حمیدی کی اشاعت میں جناب مولانا محمد بن موسیٰ میاں
صاحب مؤسس مجلس علمی (کراچی و سملک) کا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا الاعظمیٰ نے
مقدمہ میں ان کا نام بڑے ادب و احترام کے ساتھ لیا ہے۔

تحقیق میں خیانت کا الزام | ابوہشام اعظمیٰ نے مسند حمیدی کی تحقیق میں مولانا
لاعظمیٰ پر خیانت اور خرد برد کا الزام لگایا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں سخت انداز
نگارش اختیار کیا ہے۔ مناظرانہ رنگ مزاج تحقیق پر غالب ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے
کہ تنقید کے لئے نامناسب الفاظ کا استعمال کیا جائے، بلکہ ناشائستہ الفاظ سے تنقید
و تحقیق کا معیار پست ہو جاتا ہے۔ ابوہشام صاحب کا یہ مضمون ”مولانا ابوالماثر
حبیب الرحمن الاعظمیٰ کی حدیث رسولؐ میں ناروا خیانت اور جعل سازی“ کے عنوان سے
مجلہ ”محدث“ (مارچ ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ جس حدیث کو بنیاد بنا کر
اعتراضات کئے گئے ہیں، پہلے وہ حدیث نقل کی جاتی ہے تاکہ اعتراض کی نوعیت
بالکل واضح ہو جائے۔

حدیث نمبر ۶۱۳: حدثنا الحمیدي قال: ثنا الزهري قال: أخبرني
سالم بن عبد الله عن أبيه قال: رأيت رسول الله صلى الله
عليه وسلم إذا افتتح الصلوة رفع يديه حذو منكبيه، وإذا
أراد أن يركع وبعلمما يرفع رأسه من الركوع فلا يرفع ولا
بين السجدين.

(حمیدی نے کہا کہ ہم سے زہری نے بیان کیا، زہری نے کہا کہ ہم سے
سالم بن عبد اللہ نے اپنے والد کے حوالہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جس وقت آپ نماز شروع کرتے تو

اپنے ہاتھوں کو دونوں شانوں تک اٹھاتے۔ اور جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد تو ہاتھ نہیں اٹھاتے اور نہ ہی دونوں سجدوں کے درمیان۔)

اس حدیث میں کئی طرح سے قطع و برید کا الزام ہے، ایک تو یہ کہ مخطوط (مکتبہ ظاہریہ) میں 'حدثنا الحمیدی' کے بعد 'ثنا سفیان' ہے مگر مولانا نے سفیان کو سا قلم کر دیا، اسکے بعد 'نا الزہری' ہے مگر مولانا نے 'نا' کو گرا دیا اور 'الزہری' کو سفیان سے قبل والے 'نا' کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس طرح امام زہری کو امام حمیدی کا براہ راست استاذ بنادیا گیا، اور امام زہری سے امام حمیدی کا سماع بھی ثابت کر دیا گیا، حالانکہ امام زہری رمضان ۱۲۲ھ میں وفات پا چکے تھے اور امام حمیدی امام شافعی (پیدائش ۱۵۰ھ) کے شاگرد ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام حمیدی کو اپنی پیدائش سے پہلے ہی امام زہری سے ملاقات، شاگردی اور سماع کا شرف حاصل ہو گیا۔ تحریف کا دوسرا الزام یہ ہے کہ "وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع" کے بعد صرف ایک فقرہ ہے "ولا يرفع بين السجدين" لیکن مولانا نے 'ولا يرفع' کے 'واف' کو 'ف' سے بدل کر 'فلا يرفع' کر دیا اور اس تحریف سے پیدا ہونے والے معنی کو یقینی بنانے کے لئے مولانا نے جدید کتابت کا سہارا لیتے ہوئے 'خذوا منكبكم' کے بعد اور 'وإذا أراد' سے پہلے کا مالگادیا، اس کے نتیجہ میں 'بين السجدين' مہمل ہوا جاتا ہے۔ اس لئے اس تحریف کی آبرو سلامت رکھنے کے لئے موصوف نے ایک اور تحریف کی یعنی 'بين السجدين' سے پہلے لفظ 'ولا' بڑھا دیا۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا حدیث اثبات رفع یدین کی تھی۔ رد و بدل کر کے یہ

حدیث ترک رفع یدین کی حدیث بنا دی گئی۔

الزام تراشی کا جواب | دراصل حدیث کی نقل میں سہو ہو گیا ہے، معترض کو ۱۹۸۶ء میں یہ بات سوچھی جبکہ مولانا الاعظمیٰ نے ۱۹۶۵ء میں ہی راویان حدیث میں سے ایک کے چھوٹ جانے کا اعتراف کیا ہے، جب پاکستان کے ایک عالم نے اس مسئلہ پر وضاحت چاہی تھی۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان قال حدثنا الزهري الخ

مسند حمیدی کے نسخہ مکتبہ ظاہریہ اور اسکے ہندوستانی مخطوطات میں بھی یوں

ہی ہے، مطبوعہ نسخوں میں حرف جوڑنے والوں کی غلطی سے قال حدثنا

سفیان چھوٹ گیا ہے، اغلاط میں اسکو دینا چاہئے تھا مگر سہو ارہ گیا۔“

اس تحریر کے بعد مولانا پر خیانت کا الزام کیسے لگایا جاسکتا ہے؟ اور جہاں تک

الفاظ میں پھیر بدل کی بات ہے تو اس سلسلہ میں واضح رہے کہ مولانا الاعظمیٰ نے تین

نسخوں کی مدد سے تحقیق کا کام شروع کیا تھا، ان میں بھی دیوبند کے نسخہ کو اصل قرار دیا

تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ان تینوں مخطوطات میں حدیث کے بعینہ وہی

الفاظ موجود ہیں۔ مولانا الاعظمیٰ نے اس حدیث پر حاشیہ لگایا اور اختلاف روایت کی

وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

”أخرج البخاري أصل الحديث من طريق يونس عن

الزهري وأما رواية سفیان عنه فأخرجها أحمد في مسنده

وأبو داود عن أحمد في سننه لكن رواية أحمد عن سفیان

تخالف رواية المصنف عنه ففي مسنده أحمد رأيت رسول

في المآثر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۲ء ص ۳۳

حاشیے میں سفیان کی روایت کا حوالہ دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ متن میں سہو آچھوٹا ہے نہ کہ عمدہ۔

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا افتتح الصلاة رفع يديه حتى يحاذي منكبيه وإذا أراد أن يركع وبعدما يرفع رأسه من الركوع وقال سفيان مرة وإذا رفع رأسه وأكثر ما كان يقول وبعدما يرفع رأسه من الركوع ولا يرفع بين السجدين (ج ۲: ۸) ففيه كما ترى اثبات الرفع عند الركوع والرفع منه ونفيه بين السجدين، وفي رواية الحميدي نفيه في الركوع والرفع منه وفيما بين السجدين جميعاً۔^۱

(بخاری نے اصل حدیث کو یونس عن الزہری کے طریق سے روایت کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یہ حدیث سفيان عن الزہری کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں یہ حدیث امام احمد کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ لیکن سفيان سے احمد بن حنبل کی روایت کردہ حدیث حمیدی کی روایت سے مختلف ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو موٹدھوں تک اٹھاتے اور جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد سفيان کبھی کہتے کہ آپ ﷺ جب سر اٹھاتے اور اکثر یہ کہا کرتے کہ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ (جلد ۲: ۸) اس روایت میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رکوع کے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے اور سجدوں کے درمیان اس کی نفی ہے۔ اور حمیدی کی روایت میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے وقت اور

دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کی نفی ہے۔)

مولانا اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں: ”ولم یسعرض أحد من المحدثین لروایة الحمیدی هذه“ اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصولی طور پر اس حدیث کی روایت اور صحت پر کلام کی گنجائش نہیں۔

یہ خیانت کے بجائے علمی دیانت کا اعلیٰ معیار ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے حدیث کے متن کو حنفیہ کی دلیل بنانے کے بجائے اس حدیث کی تحقیق کی اور اسکی حیثیت بھی متعین کی۔ معترض نے اپنے اعتراض کی بنیاد مکتبہ ظاہریہ کے مخطوطہ پر رکھی ہے، عین ممکن ہے کہ اس نسخہ میں غلطی ہو؛ کیونکہ یہی روایت اسی سند و متن کے ساتھ مسند ابی عوانہ میں بھی ہے۔

مکتبہ ظاہریہ کے نسخہ میں خطا و لغزش کے امر کافی پہلو کی جانب مولانا اعجاز احمد صاحب نے متوجہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مسند ابی عوانہ کی حدیث پیش کی اور اس مسئلہ پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مولانا اعجاز احمد صاحب کی تحریر ملاحظہ ہو:

”حدثنا عبد الله بن أيوب المصحري وسعدان بن نصر

وشعيب بن عمرو في آخرین قالوا حدثنا سفیان بن عیینة

عن الزهري عن سالم عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ إذا

افتتح الصلاة يرفع يديه حتى يحاذي بهما وقال بعضهم

حدو منكبيه وإذا أراد أن يسركع بعد ما يرفع رأسه من

الركوع لا يرفعهما وقال بعضهم ولا يرفع بين السجدةتين.

ابو عوانہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہ بن ایوب مخرمی اور سعدان بن نصر

اور شعیب بن عمرو نے حدیث بیان کی ان سے سفیان بن عیینہ نے زہری کے واسطہ سے، انھوں نے سالم کے واسطہ سے، وہ اپنے والد کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے تھے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد نہیں اٹھاتے تھے اور بعض نے کہا کہ دونوں سجدوں کے درمیان نہیں اٹھاتے تھے۔ پھر اس کے بعد ہے کہ:

حدثنا الصائغ بمكة قال حدثني الحميدي قال حدثنا سفيان عن الزهري قال أخبرني سالم عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ مثله. مطلب یہ ہے کہ حمیدی نے بھی سابقہ سند کے ساتھ اسی کے مثل روایت کیا ہے جیسے پہلی روایت گزری۔

اب تو سفیان سے روایت کرنے والے تنہا حمیدی نہیں ہیں، تین راوی اور اسی طرح روایت کرتے ہیں، تو کیا اس کی بنیاد پر نہیں کہا جاسکتا کہ نسخہ ظاہریہ میں ممکن ہے کہ کاتب سے کچھ تصرف واقع ہو گیا ہو، اور صحیح نسخہ وہی ہو جو حضرت محدث کے پاس پہلے سے تھا؟..... بہر حال جب یہ حدیث اسی طرح اسی سند و متن کے ساتھ حافظ ابو عوانہ نے صائغ کے حوالہ سے امام حمیدی سے نقل کی ہے تو اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسند حمیدی کے مطبوعہ ایڈیشن میں جو متن درج کیا گیا ہے، اس کی نسبت امام حمیدی کی جانب درست ہے، اور مسند حمیدی کی روایت وہی ہے۔ کیونکہ اسی کی تائید مسند ابی عوانہ سے ہو رہی ہے، اور مکتبہ ظاہریہ کے نسخہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے حضرت سفیان بن عیینہ کے

دوسرے جلیل القدر تلامذہ مثلاً یونس اور امام احمد بن حنبل سے جو الفاظ منقول ہیں وہی لکھ دیئے ہیں، ورنہ حمیدی سے جو کچھ منقول ہے وہ وہی ہے جو مسند میں ہے۔^۱

جب مسند حمیدی منظر عام پر آئی تو علمی حلقوں میں حدیث کی اس خدمت کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ اسکو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کے مشہور علمی رسالوں میں اس پر تبصرے اور ریویو لکھے گئے۔ مشہور محدث اور فقیہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے مسند حمیدی کی جلد اول پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

”وقد صدر منه الجزء الأول محققاً عن أربع نسخ مخطوطة، في طباعة جيدة متقنة، وبتحقيق وتعليق العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد شاكر رحمه الله تعالى في تحقيقه لكتاب ”مسند أحمد“ وقد أتم حفظه الله تعالى صنيعة الجميل في إخراج هذا ”المسند“ أحسن إتمام.“^۲

(چار نسخوں کی مدد سے تحقیق و تصحیح کے بعد مسند حمیدی کی جلد اول عمدہ اور صاف ستھری طباعت کے ساتھ شائع ہوئی، تحقیق و تعلیق کا کارنامہ علامہ کبیر محقق محدث مولانا شیخ حبيب الرحمن الأعظمی نے انجام دیا، جنکو شام، مصر، مغرب وغیرہ ممالک کے علماء نے انکی تحقیقات اور ’مسند احمد‘ کی

۱۔ المآثر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۲ء ص ۴۵-۴۷

۲۔ مجلة الجمع العلمي العربي ج: ۳۸ جزء ۴ ص ۶۸۸

تحقیق میں علامہ شیخ احمد محمد شاہ پر ان کے قیمتی اور نادر دستدراکات کے حوالہ سے جانا۔ اللہ انکو حفظ و امان میں رکھے، اس 'مسند' کو منظر عام پر لانے میں انہوں نے اپنے کام کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔
جنیوا سے شائع ہونے والے عربی مجلہ 'المسلمون' نے مولانا الاعظمیٰ کو اس انداز میں داد تحسین دی:

"ولا يسعنا امام هذا العمل المبرور الذي قام به الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي والمجلس العلمي بكراتشي إلا أن نذكره قوله صلى الله عليه وسلم وكفى به تنويرها: "نضر الله امرأ سمع مقالتي فوعاها وأذاها كما سمعها." ۱
(اس مقبول عمل کو دیکھ کر، جس کو استاذ جلیل شیخ حبیب الرحمن الاعظمیٰ اور مجلس علمی کراچی نے انجام دیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد آ جاتا ہے اور اسکی تعریف میں اتنا ہی کافی ہے: "اللہ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے میرا کلام سنا پھر اسے محفوظ رکھا اور اسکو ویسا ہی پہنچایا جیسا کہ اس نے سنا تھا۔)

ڈاکٹر محمود طحان 'اصول التخریج ودراسة الأسانید' میں مسند حمیدی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"وحقه وعلق عليه فضيلة الأستاذ الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي جزاه الله خيراً، وقد عني بتحقيقه والتعليق عليه عناية جيدة..... وهو عمل يشكر عليه" ۲

۱. المسلمون ج: ۹ عدد ۷-۸: ۱۳۴-۱۳۵

۲. اصول التخریج ودراسة الأسانید ص ۳۲

(.....) اور اس کی تحقیق و تعلیق فضیلۃ الاستاذ شیخ حبیب الرحمن الاعظمی نے کی ہے، انہوں نے اسکی تحقیق و تعلیق میں غایت درجہ توجہ سے کام لیا ہے، اپنے اس کارنامہ پر وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔)

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۱ ص: ۲۰ ح: ۱- أخبرنا الحمیدی، أخبرنا سفیان بن عیینة أبو محمد،

ثنا مسعر بن کدام عن عثمان بن مغيرة إلخ

اصل نسخہ (دیوبند کے نسخہ) میں ”عثمان“ کے بجائے ”عمر“ رقم تھا، لیکن اسی نسخہ کے حاشیہ میں کاتب نے ”عثمان“ بھی لکھا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں بھی ”عمر“ ہی تھا، اور چونکہ دیوبند اور مکتبہ سعید یہ حیدرآباد کے نسخوں میں خال خال ہی اختلاف تھا اس لئے اس میں بھی ایسا ہی تھا، لیکن مولانا نے متن میں ”عثمان“ تحریر فرمایا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

چنانچہ اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ متن میں مولانا الاعظمی نے ”عمر“ اور ”عثمان“ میں ”عثمان“ کا انتخاب کیوں کیا؟ محقق علام نے حدیث اور رجال حدیث سے متعلق اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس تصحیح کے سلسلہ میں حوالے دیئے کہ امام احمد نے مسند احمد میں مسعر اور ثوری کے طریق سے عثمان بن مغیرہ سے نقل کیا ہے۔ (ج: ۱ ص: ۱۵۳) امام ترمذی نے بھی ابو عوانہ کے طریق سے عثمان بن مغیرہ سے ہی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ (ج: ۱ ص: ۳۱۳) اسی طرح مسند طیالسی، ابن سنی کی ”عمل الیوم واللیلۃ“ میں بھی عثمان بن مغیرہ ہی ہے۔

پھر اب مسئلہ یہ ہے کہ مخطوطوں میں ”عثمان“ کے بجائے ”عمر“ کیسے لکھ دیا گیا؟ مولانا الاعظمی اسکی توجیہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ کاتب نے ”عثمان“ کو ”عمر“ کے انداز میں لکھا ہوگا، اور اس پر نقطے نہیں لگائے، اب کسی

دوسرے کاتب نے دیکھا تو سمجھ لیا کہ ”عمر“ لکھا ہوا ہے، اس لئے ویسا ہی نقل کر دیا۔

۲۔ ج: ۱ ص: ۳۵ ح: ۶۴۔ حدثنا الحميدي، ثنا سفيان، ثنا عمرو بن دينار قال: سمعت بحالة إلخ

اصل نسخہ میں ”خالداً“ تھا، مولانا الاعظمیٰ کے نزدیک ”خالداً“ غلط ہے، انہوں نے اسکی جگہ پر ”بحالة“ تحریر فرمایا جیسا کہ ہم متن میں دیکھ رہے ہیں۔ مولانا نے اپنی تصحیح کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے کہ امام بخاری نے (ج ۶ ص ۱۶۳)، امام احمد نے (ج ۳ ص ۱۲۳) اور امام ترمذی نے (ج ۲ ص ۳۹۳) میں اس حدیث کو نقل کیا ہے، اور سبھی کے نزدیک ”بحالة“ ہی ہے۔

۳۔ ج: ۲ ص: ۲۹۰ ح: ۶۵۴۔ حدثنا الحميدي قال: ثنا سفيان قال ثنا ابن

جريح إلخ

ایک ایک حدیث کے سلسلہ میں مولانا الاعظمیٰ پوری طرح سے واقف و باخبر نظر آتے ہیں کہ بعینہ وہ حدیث یا اس مضمون کی حدیث کس کتاب میں کس واسطے سے موجود ہے اور کن راویوں نے اسکو روایت کیا ہے ان تمام چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے مالک اور لیث کے طریق سے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے (ج ۴ ص ۲۲۶، ۲۲۹)، امام بخاری نے مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح یحییٰ بن سعید کے طریق سے دوسرے لفظوں میں بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (ج ۴ ص ۲۲۵)۔

کتاب الزہد والرقائق

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”إِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ قَدْ
أَعْطِيَ زَهْدًا فِي الدُّنْيَا وَقَلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوا مِنْهُ فَإِنَّهُ يَلْقَى الْحِكْمَةَ“^۱
(جب تم ایسے شخص کو دیکھو جسکو زہد اور قلت گویائی عطا کی گئی ہو تو اس سے قربت پیدا
کرو کیونکہ اس پر حکمت القا کی جاتی ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مندرجہ بالا حدیث میں زہد کو حکمت کی علامت
قرار دیتے ہیں، زہد ایک ایسی نعمت ہے کہ جسکو نصیب ہوگئی تو بس زندگی کا مقصد اصلی
حاصل ہو گیا۔ دنیا کی رعنائیوں سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگ جانے کا
نام زہد ہے۔ امام غزالی زہد کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

”الزهد عبارة عن رغبته عن الدنيا عدولاً إلى الآخرة أو عن

غير الله تعالى عدولاً إلى الله تعالى“^۲

(زہد دنیا سے اعراض کر کے آخرت کی طرف یا اللہ کے ماسواء سے اللہ کی

طرف رجوع کرنے کا نام ہے۔)

رقائق رقتہ سے ہے، رقتہ کے معنی رحمت (نرمی) کے ہیں، اسکی ضد غلظہ

(تختی) ہے۔ اس باب میں آنے والی احادیث کو اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا

کہ ان احادیث میں وعظ و تنبیہ ہوتی ہے، جس سے دل میں نرمی اور رقتہ پیدا ہوتی

ہے۔^۳ زہد و رقائق کے موضوع پر بہت سی کتب حدیث تصنیف کی گئیں، اس موضوع

پر مستقل کتاب تصنیف کرنے والوں میں معانی بن عمران موصلی، وکیع بن جراح، اسد

^۱ سنن ابن ماجہ ص ۳۰۲

^۲ احیاء علوم الدین ۱۰۲:۴ امام غزالی

^۳ ارشاد الساری ۳۱۴:۱۳ شہاب الدین قسطلانی

ابن موسیٰ، امام احمد بن حنبل، امام ابو داؤد، ابن شاپین، بیہقی، نسائی اور عبد اللہ بن مبارک وغیرہ محدثین عظام کے نام قابل ذکر ہیں۔

عبد اللہ بن مبارک (۱۱۸ھ-۱۸۱ھ) حضرت عبد اللہ بن مبارک کے گونا گوں اوصاف و کمالات نے ان کی ذات کو مسلمانوں کا امام و مقتدی اور اصحاب علم و فن کے لئے چشمہ خضر بنا دیا تھا، ہر فن میں ممتاز حیثیت حاصل تھی، مگر فن حدیث سے آپ کو خاص شغف تھا، اسی بناء پر آپ کو ”امیر المؤمنین فی الحدیث“ کہا گیا۔ تابعین میں انہوں نے ہشام بن عروہ، اسماعیل بن ابی خالد، اعمش اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کو پایا، ثوری، شعبہ اور اوزاعی جیسے ائمہ کبار سے روایت کی۔ اور خود عبد اللہ بن مبارک سے کتب فیض کرنے والے بے شمار ہیں۔ ”حدث عنه خلق لا يحصون“ یعنی ان سے بے شمار لوگوں نے روایت کی۔

ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے صحابہ اور ابن مبارک کے معاملہ میں غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ صحابہ کو ابن مبارک پر اس وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ ان کو (صحابہ کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت حاصل ہے، اور غزوات میں آپ کے ساتھ شریک رہے۔ ۲ عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ: ”میں ابن مبارک پر کسی کو مقدم نہیں رکھتا ہوں۔“ ۳ زہد و رقائق کے موضوع پر آپ کی تصنیف ”کتاب الزہد و الرقاق“ ایک بے مثال کتاب ہے۔

کتاب الزہد کی خصوصیات | یہ کتاب دوسری صدی ہجری کی یادگار ہے، ۲۰۶۳ احادیث ہیں، یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کے آثار اور

۱ تذکرۃ الحفاظ ۲۵۳:۱ ذہبی

۲ صفحۃ الصفوۃ ۱۳۸:۳ ابن جوزی

۳ حلیۃ الاولیاء ۱۷۳:۸ ابو نعیم اصفہانی

تابعین وغیرہ کے فرمودات کا مجموعہ ہے۔ جب عبد اللہ بن مبارک ”کتاب الزہد“ کی قرأت فرماتے تو اس قدر رقت و خشیت طاری ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ کوئی نیل ذبح کیا گیا ہو، اس وقت آپ میں بولنے کی قدرت نہ رہتی۔!

یہ قدیم ترین کتاب ابھی تک خواص و عوام کی دسترس سے باہر تھی، اگر تھی بھی تو مخصوص ہاتھوں، لائبریریوں اور مخطوطات کے خزانوں میں تھی! افادہ و استفادہ بسہولت ممکن نہ تھا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اس عظیم خزانہ حدیث کی نشر و اشاعت کا عزم کیا اور اس کے مخطوطات کی جستجو شروع کی۔

مخطوطات | جب والی قطر شیخ علی بن عبد اللہ کو مولانا کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انہوں نے ”کتاب الزہد“ کا جو نسخہ انکے پاس تھا، اس کا عکس مولانا کے پاس ارسال کیا۔ مولانا نے اس نسخہ کو مجلس احیاء المعارف مالِیگاؤں بھیج دیا؛ تاکہ اس نسخہ کی ایک صاف ستھری نقل تیار کی جائے۔ مولانا محمد عثمان صاحب ناظم مجلس نے ”کتاب الزہد“ کے مزید تین نسخے مصر سے حاصل کئے۔ جب پہلے نسخے کی نقل تیار کر لی گئی اور بقیہ تین نسخوں سے اس کا مقابلہ کر کے اسکو طباعت کے لائق بنا دیا گیا، تو مجلس احیاء المعارف نے اس کتاب کو مزید مفید بنانے کے لئے مولانا الاعظمی سے درخواست کی کہ آپ اسکی تحقیق فرمادیں۔ مولانا الاعظمی فرماتے ہیں:

”ثم کلفنی المجلس أن أقوم بتحقیق الكتاب والتعلیق

علیه۔“ ۲

(مجلس نے مجھے مکلف بنایا کہ میں اس کتاب کی تحقیق کروں اور اس پر

تعلیقات لکھوں۔)

کتاب الزہد کی تحقیق میں مولانا کے سامنے تین نسخے تھے، ان مخطوطات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

۱۔ پہلا نسخہ جو مولانا کو والی قطر سے ملا تھا، دراصل وہ ولی الدین جارا اللہ کے مکتبہ استانبول کا تھا، جس کا عکس والی قطر کے پاس محفوظ تھا۔ اس نسخہ کے گیارہ اجزاء ہیں، جزء اول احمد بن حسن کی روایت سے ہے، اور ابوعلی حسین پورے گیارہ اجزاء کے راوی ہیں۔ اس مخطوطہ کا صفحہ اول خط رقی میں ہے، اور بقیہ پورا نسخہ خط نسخ میں ہے، اس میں ۱۳۵ اوراق ہیں، یہ نسخہ صاف ہے کہیں کہیں حروف مٹ گئے ہیں، اس پر ۶۰۰ھ کا تسماع درج ہے، مولانا نے اسی نسخہ کو اصل قرار دیا، یہ نسخہ نسخہ مروزی کہلاتا ہے۔

۲۔ دوسرا نسخہ اسکندریہ کی لائبریری کا ہے، ۲۶×۱۸ کے حجم میں ہے، مغربی خط میں ہے، اس نسخہ میں ۱۵۳ اوراق ہیں ۳۶۶ھ کا مکتوبہ ہے، یہ نعیم بن حماد کا نسخہ ہے، مولانا الاعظمی فرماتے ہیں:

”وتختلف الثانية عن الاولى تبويبا وترتيبا وزيادة ونقصا“
(دوسرا نسخہ پہلے نسخے سے تبویب، ترتیب اور زیادتی و کمی کے لحاظ سے مختلف ہے۔)

۳۔ تیسرا نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق کا ہے، خط نسخ میں ہے، اس میں ۷۰ اوراق ہیں، ۶۰۶ھ کا مکتوبہ ہے، یہ نسخہ عمر بن طبرزد بغدادی کی روایت سے ہے، یہ نسخہ اصل نسخہ (جزء اول) کے نویں جزو کے آخری ورق سے تیرہویں جزو کے ابتدا تک ہے۔

تحقیق و تعلیق | مولانا نے ان مخطوطات کی روشنی میں ”کتاب الزہد والرقائق“ کی تحقیق و تعلیق کا کارنامہ انجام دیا۔ مولانا نے اس کتاب کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الزہد والرقائق ص ۲۵

۱۔ سب سے پہلے مولانا نے مروزی کی روایت سے ایک نسخہ تیار کروایا، اس کا دوسرے نسخوں سے مقابلہ کیا، آیات کے مواقع اور ان کے نمبرات کا اندراج کیا، نسخہ میں اگر غلطی یا تصحیف ہے تو اس پر تنبیہ فرمائی، اور نعیم بن حماد کے زوائد کو مروزی کے نسخہ کے اخیر میں شامل کیا۔

۲۔ متداول کتابوں سے احادیث و آثار کی تخریج کی، لیکن تخریج اور حوالہ دینے میں زیادہ چھان بین نہیں کی گئی، کہیں پر مولانا نے حوالہ میں حدیث کے بعینہ وہی الفاظ نقل کر دیئے ہیں، جس سے متن میں پیدا ہونے والے ابہام کا ازالہ ہو جاتا ہے، مولانا نے رواد حدیث کی تعیین و تشخیص کی اور بعض مقامات پر ان رواد کے تراجم کی نشاندہی بھی فرمادی، خصوصاً جب وہ صحاح ستہ کے نہ ہوں۔

۳۔ دقیق، مشکل اور غریب الفاظ کی تشریح و توضیح فرمائی۔

۴۔ مولانا الاعظمی نے اس کتاب سے استفادہ کو آسان سے آسان تر بنانے کے لئے مختلف پہلوؤں سے علیحدہ علیحدہ فہرستیں مرتب کیں، پہلی فہرست مرفوع احادیث کی ہے، صحابہ میں سے اسماء رواد کو حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب فرمایا اور کتاب کے صفحات کی نشاندہی کی، دوسری فہرست مراسل کی ہے، تیسری آثار صحابہ کی اور چوتھی فہرست تابعین و تبع تابعین کے موقوفات اور فرمودات کی ہے۔

مولانا الاعظمی نے ہی اس کتاب کا مقدمہ بھی تحریر فرمایا، جس میں زہد کی اہمیت و افادیت، اقسام، درجات اور ہماری زندگی میں زہد کی کیا ضرورت ہے، ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو کی۔ اسی طرح عبداللہ بن مبارک کا تعارف و تذکرہ، منظومات کا پورا تعارف، تحقیق میں کن مناجات کو اختیار کیا گیا ہے، یہ سبھی چیزیں اس مقدمہ میں آگئی ہیں۔

مولانا الاعظمی کے ساتھ معاون کے طور پر اس تحقیقی سفر میں آپ کے شاگرد

مولانا عبد الجبار صاحب مکی^۱ (جو اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم منو میں تفسیر و ادب کے استاذ تھے۔) اور فرزند عزیز جناب مولانا رشید احمد صاحب موجودہ ناظم مراقبہ العلوم شریک رہے۔ اس کتاب پر مشہور محقق مولانا ابوالوفا افغانی نے تقریظ لکھی ہے۔ کتاب الزہد والرقائق ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۶ء میں مجلس احیاء المعارف مالہ کاؤں سے پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سلسلہ میں مولانا اعظمی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم تحریر فرماتے ہیں کہ:

”کتاب الزہد والرقائق..... قد بذل المحقق جهداً مشكوراً

حتى أخرجہ فی صورة دقیقة وفي طبعة أنيقة.“^۲

(کتاب الزہد والرقائق..... محقق (مولانا اعظمی) کی سعی و کوشش قابل شکر

ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو عمدہ اور صاف ستھری شکل میں شائع کیا۔)

مولانا ابوالوفا افغانی نے تقریظ میں مولانا کے اس کام کی خوب تعریف و توصیف کی ہے، خاص طور سے مولانا کے مقدمہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”وقدمہ بمقدمة مفيدة تدل علی سعة اطلاعه وطول باعه،

قل له نظیر فی علماء زماننا.“^۳

(اور انہوں نے (مولانا اعظمی) ایک مفید مقدمہ تحریر فرمایا، جس سے

انکی وسعت معلومات اور مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، انکی نظیر ہمارے زمانہ

کے علماء میں کم ملے گی۔)

کتاب الزہد پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی رقمطراز ہیں کہ:

۱۔ مولانا کے حالات زندگی کے لئے دیکھئے ’ہیکر مہر و وفا‘ مصنفہ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

۲۔ الامام الزاہد عبد اللہ بن مبارک ص ۱۲۰ ڈاکٹر عبد الحلیم محمود

۳۔ کتاب الزہد والرقائق ص ۶۴

”مولانا حبیب الرحمن الاعظمی..... نے اس پر جو محنت کی ہے وہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جو خود اس میدان کے مرد ہوں۔“

مولانا عبد الماجد دریابادی نے ’کتاب الزہد‘ کو اس طرح خراج تحسین

پیش کی:

”محرمث وقت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی خدمات فن حدیث میں یوں بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنیت و تبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی تدوین کی سعادت انہیں کے حصہ میں آئی۔“

تعلیقات کے نمونے:

۱- ص ۵۲: ح ۱۶۳..... حدثني أبو عمران التجيبي..... اصل نسخہ کے حاشیہ میں استدراک کی علامت بنی ہوئی تھی، اور اس پر لکھا ہوا تھا ”اسمہ سالم وهو مولاہم“ یعنی ابو عمران تجیبی کا نام سالم ہے اور وہ آزاد کردہ غلام ہیں۔ مولانا الاعظمی نے تنبیہ کی کہ ان کا نام سالم نہیں بلکہ صحیح نام اسلم ہے۔

۲- ص ۹۴: ح ۳۲۸- (باب صفة النار) اس روایت میں ’کلمة قذعة‘ آیا ہے، مولانا اسکی تشریح کرتے ہیں ”القدع في الكلام الخنا والفحش“ یعنی بدزبانی یا فحش بات کو ’کلمة قذعة‘ کہا جاتا ہے۔

۳- ص ۲۰۷: ح ۵۸۴- قال: اخبرنا ابن المبارك قال: اخبرنا سفيان بن عيينة عن أيوب إلخ.

اصل نسخہ (مکتبہ ولی الدین جارا اللہ کے مخطوطہ) میں ’عن أبي أيوب‘ اور

اسکندر یہ کہ نسخہ میں 'عن ایوب' لکھا ہوا تھا، مولانا الاعظمیٰ نے اصل نسخہ کی عبارت کو غلط ٹھہرایا اور اسکندر یہ والے نسخہ کی عبارت کو صحیح قرار دیا اور اسی کے مطابق متن میں 'عن ایوب' تحریر فرمایا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ یہ ایوب بن عاکذ ہیں جن کا تذکرہ تہذیب میں ہے۔

سنن سعید بن منصور

فقہی ترتیب پر کتاب الطہارۃ سے کتاب الوصایا تک مرتب کردہ مجموعہ احادیث کو "سنن" کہا جاتا ہے۔ سنن کو پہلے ابواب کہا جاتا تھا، "الابواب" مصنفہ امام شعبی (ولادت ۱۹ھ) اس طرز کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ۲ کثیر تعداد میں سنن مرتب کی گئی ہیں، جن میں سنن ابو داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، سنن ابن حبان، سنن ابو مسلم الکشی، سنن ابوقرہ، سنن ابوعلی بن السکن، سنن حافظ سعید بن منصور خراسانی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

سعید بن منصور خراسانی | حافظ سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی، ابو عثمان مروزی، طالقانی، ایک بلند پایہ محدث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جوزجان میں پیدا ہوئے، بلخ میں نشو و نما پائی اور حصول علم کی خاطر شہر شہر پھرے، آخر میں مکہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ من ولادت کے بارے میں اصحاب سیر خاموش ہیں، البتہ آپ کی وفات اصح اور مشہور قول کے مطابق ۲۲ھ میں ہوئی۔ ۳

آپ نے جن محدثین عظام سے کسب فیض کیا ان کی ایک لمبی فہرست ہے،

۱ ابو داؤد ۳:۱

۲ تجت حدیث ص ۱۳۶ مولانا محمد تقی عثمانی

۳ تہذیب الجہد ص ۷۹:۴

۴ ایضاً ص ۸۰

اسی طرح آپ سے جن ائمہ حدیث نے روایتیں کی ہیں، انکی بھی کثیر تعداد ہے۔ مشہور شیوخ میں امام مالک، لیث، فلیح، ابو عوانہ، ابن عیینہ، حماد بن زید وغیرہ ہیں اور روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، امام مسلم، ابو داؤد، ابو ثور، ابو بکر الاثرم، الکدیمی، ابوحاتم، ابو زرعہ، وغیرہ ہیں۔ امام بخاری نے بھی ایک واسطہ سے حافظ سعید بن منصور سے روایت کی ہے۔^۱

عیسیٰ بن بشیر کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن عبد اللہ بن نمیر سے سعید بن منصور کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ”ثقة“ ہیں۔^۲ سلمہ بن شبيب فرماتے ہیں: ”ذکرته لأحمد فأحسن الشاء عليه وفختم أمره“^۳ (میں نے سعید بن منصور کا ذکر احمد بن حنبل سے کیا تو انہوں نے انکی اچھے انداز میں تعریف کی اور ان کے کام کی عظمت بیان فرمائی۔) حافظ کا عالم یہ تھا کہ حرب فرماتے ہیں: ”أملی علينا نحواً من عشرة آلاف حديث من حفظه“^۴ (ہم کو انہوں نے تقریباً دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں۔)

ابوحاتم کے بیان ”ممن جمع و صنف“^۵ (سعید بن منصور احادیث کو جمع اور انہیں تصنیف کرنے والے ائمہ میں سے ہیں۔) اور حاکم کی تصریح ”ولہ مصنفات“^۶ کے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔
”کتاب السنن“ بھی سعید بن منصور کی علمی یادگار ہے، یہ حدیث کا ایک

^۱ طبقات الحفاظ ص ۱۸۲ جلال الدین سیوطی

^۲ شذرات الذہب ۶۴:۲ ابن عداد حنبلی

^۳ الجرح والتعديل ج: ۲ قسم: ۱ ص ۶۸

^۴ تہذیب المعجم ص ۸۰:۴ ایضاً

^۵ طبقات الحفاظ ص ۱۸۲

^۶ تہذیب المعجم ص ۸۰:۴

عظیم ذخیرہ ہے، جس کو انہوں نے تصنیف کیا۔ ہمارا موضوع اس کتاب کی دریافت اور تحقیق و تعلق سے متعلق امور کے سلسلہ میں گفتگو کرنا ہے۔

کتاب السنن کی خصوصیات | اس کتاب کو حافظ سعید بن منصور نے آخری عمر میں مکہ مکرمہ میں مرتب فرمایا۔ اس کی تائید حرب کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے ۲۱۹ھ میں سعید بن منصور سے حدیثیں لکھیں، اسکے بعد امام صاحب تصنیفی امور میں مصروف ہوئے اور ۲۲۲ھ میں سعید بن منصور کا انتقال بھی ہو جاتا ہے، تو ظاہری بات ہے کہ کتاب السنن کی تصنیف عمر کے آخری حصہ میں ہوئی۔ ابن کثیر سعید ابن منصور کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”صاحب السنن المشہورۃ التي لا يشارك فيها إلا القليل“
(اس مشہور سنن کے مصنف ہیں کہ جس میں چند ہی لوگ ان کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں۔)

کتاب السنن احکام کے سلسلہ میں سب سے جلیل القدر کتاب ہے، صحیحین اور سنن اربعہ سے قدیم ترین بھی ہے، اس کتاب میں احادیث و آثار کے علاوہ صحابہ کی روزمرہ اجتماعی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و حادثات، شرعی امور میں صحابہ کے فتاویٰ اور انکی آراء، گویا کہ اس وقت کے پورے معاشرے کی تصویر ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اسی طرح سے اس دور میں بین الاقوامی پالیسی کیسی تھی، خاص طور پر ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ خلافت راشدہ کے رشتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جن کا ذکر تاریخ کی دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتا۔ محمد بن علی بن زید الصائغ اور احمد نجدہ بن عریان نے سعید بن منصور سے کتاب السنن کی روایت کی ہے۔

۱۔ الرسالة المستطرفة ص ۲۷

۲۔ البدایہ والنہایہ ۱۰: ۲۱۵ ابن کثیر

اگرچہ اس کتاب کا ذکر ابن سعد، امام بخاری، اور رازی نے نہیں کیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کتاب کو شہرت حاصل نہیں تھی، بہت سے علماء حدیث نے اس کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری تحریر فرماتے ہیں:

”ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث حافظ ابوالعباس احمد بن عبد اللہ محب الدین، طبری، مکی متوفی ۶۷۲ھ نے حج و مناسک کی مشہور کتاب ”القریٰ لقاصد ام القریٰ“ میں سنن سعید بن منصور سے بہت زیادہ احادیث و آثار نقل کئے ہیں، اس کا شاید ہی کوئی صفحہ اس کی احادیث و آثار سے خالی ہو۔“

مخطوطہ کی بازیافت | احادیث و آثار اور اسلامی تاریخ کا یہ قیمتی خزانہ قریب قریب مفقود ہی تھا، اسکے مخطوطات کے بارے میں محققین کو کوئی علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، بعض تحقیقی ضروریات کے لئے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ کا ۱۳۸۰ھ میں استانبول کا سفر ہوا۔ ۲ وہاں کی ایک بڑی لائبریری ”محمد پاشا کوپرلی لائبریری“ نے مخطوطات کے سمندر میں غوطہ لگانے والے اس نامور محقق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ اس کتب خانے کی انتظامیہ نے ڈاکٹر حمید اللہ کو مخطوطات کی ترتیب، تہذیب اور تمیز کی ذمہ داری سونپی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور مخطوطات کی جانچ پرکھ شروع کی، انکو ایک مخطوطہ ملا جسکی پیشانی پر ”مصنف ابن ابی شیبہ“ لکھا ہوا تھا، لیکن اسکے

۱۔ آثار و معارف ص ۲۱۹ قاضی اطہر مبارکپوری

۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ مولانا الاعظمی کے نام ۸ رمضان ۱۳۹۰ھ کے ایک مکتوب میں ترکی کے مخطوطات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ”ترکی میں تقریباً دس لاکھ قلمی کتابیں سرکاری کتب خانہ میں ہیں، صرف استانبول ہی میں کچھ نہیں تو ڈھائی لاکھ مخطوطے ہوں گے اور الحمد للہ اچھی حالت میں ہیں۔“

(المآثر ج ۱۲ ش ۲ ص ۸۶)

مشمولات کو دیکھ کر شک ہوا کہ یہ مصنف ابن ابی شیبہ ہے یا کوئی اور کتاب؟
چنانچہ ’کوپروڈ‘ کے اس نسخہ کا مقابلہ مصنف کے دوسرے نسخوں سے کیا، ایک
نسخہ ’توپ قاپی‘ کا اور دوسرا ’نور عثمانیہ‘ کا تھا۔ ’کوپروڈ‘ کے نسخے اور ’توپ قاپی‘ و ’نور عثمانیہ‘
کے نسخوں میں واضح فرق تھا۔ چند ایسے قرائن بھی دیکھنے کو ملے جس سے انکشاف ہوا
کہ یہ ”مصنف ابن ابی شیبہ“ کا مخطوطہ نہیں بلکہ ”سعید بن منصور“ کا ہے۔

اس مخطوطہ میں ایک جگہ آٹھ سطروں میں سعید بن منصور کا ترجمہ بھی لکھا ہوا
ملا۔ تین سطروں میں ابواب و کتب کا بھی تذکرہ تھا: باب الحث علی تعلیم الفرائض، من
کتاب الفرائض، کتاب ولایۃ العصبۃ، کتاب الوصایا، کتاب الزکاح، کتاب الطلاق،
کتاب الجہاد۔

مخطوطہ کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے:

”أخبرنا... الأنصاطی قال أنبا..... الکرجی رحمہ اللہ، قال

أنبا أبو علی..... بن شادان قراءة عليه وأنا أسمع، قال أنا.....

السجستانی. أنا محمد بن علی بن الصائغ، قال حدثنا سعید

بن منصور. ۱

مندرجہ بالا عبارت ملاحظہ ہو، اس میں کہیں بھی ابتدا سے آخری سند تک
ابوبکر بن ابی شیبہ کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے ہے کہ کتاب کے سرورق پر
”مصنف ابن ابی شیبہ“ کا ذکر محض کتابت کی خطا ہے، یا اس مخطوطہ کے مالک سے نام
لکھنے میں سہو ہو گیا ہے۔ ”ومن المحتمل أن الذي كتبه التيس عنده ابن
شعبة (أي سعيد بن منصور بن شعبة) بابن أبي شيبه“ ۲ (یعنی یہ بھی احتمال

۱۔ کتاب السنن ص ۶

۲۔ ایضاً

ہے کہ کاتب کو ابن شعبہ (سعید بن منصور بن شعبہ) اور ابن شیبہ میں التباس ہو گیا ہو۔ خلاصہ کلام یہ کہ ڈاکٹر حمید اللہ اندرونی اندراجات اور پختہ شہادتوں کی بنیاد پر اسی نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مخطوطہ سعید بن منصور کی سنن کا ہے۔ دمشق کے مضافات میں ”عبادیہ“ گاؤں میں ربیع الاول ۲۵۷ھ میں اس نسخہ کی کتابت مکمل ہوئی، اس کے کاتب محمد بن احمد بن علی خطیب ہیں۔ بلاشبہ ایک جانب بے پناہ خوشی کا احساس کہ ”کتاب السنن“ کی بازیافت ہوئی، تو دوسری طرف افسوس بھی کہ اس ذخیرہ حدیث کی دریافت بھی ہوئی تو تیسری جلد کی شکل میں! یہ ایک ضخیم کتاب تھی جس کے تمام حصوں تک رسائی نہ ہو سکی۔

تصحیح و تعلیق | اس مخطوطہ کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مولانا محمد میاں سملکی کو ہدیہ کیا۔ مولانا نے اس ذخیرہ حدیث کی قدر و قیمت اور قدامت کو دیکھتے ہوئے اسکی طباعت و اشاعت کا فیصلہ فرمایا، اور مولانا حبیب الرحمن صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کو اپنی تحقیقات و تعلیقات سے آراستہ کر کے طباعت کے لائق بنائیں۔

مولانا نے اس ذمہ داری کو بھی قبول فرمایا، لیکن واقعہ یہ تھا کہ سنن سعید بن منصور کی تحقیق آسان نہ تھی، کیونکہ صرف اور صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہو سکا تھا، اور کسی نسخہ کی تحقیق خود اسی نسخہ سے کیسے ممکن تھی؟ لیکن اس کام کے سپرد کرنے والوں کی نظر بھی خوب تھی! شاید انہیں یقین کی حد تک اعتماد تھا کہ مولانا الاعظمی بحر تحقیق میں غواصی کر کے اور موتی چن چن کر ”عقد فرید“ تیار کر لیں گے۔ مولانا اعظمی سنن سعید ابن منصور کے سلسلہ میں اپنی جدوجہد کے بارے میں خود رقمطراز ہیں کہ:

”إنا حملنا في تحقيق الكتاب وتصحيح نصوصه عناءً

كثيراً لأن النسخة كانت وحيدة فلم نجد بداً من أن

نتصفح ألوف الصفحات ونفتش عن أحاديث هذا الكتاب

فی غیرہ من جوامع الحدیث۔“ ۱

(اس کتاب کی تحقیق اور نصوص کی تصحیح میں ہم نے بہت مشقتیں برداشت کیں، کیونکہ نسخہ ایک ہی تھا، چنانچہ ہمارے پاس اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا کہ ہم ہزاروں صفحات کی چھان بین کریں اور اس کتاب کی احادیث کی تلاش دوسرے مجموعہائے حدیث میں کریں۔)

سنن سعید بن منصور کے سلسلہ میں مولانا الاعظمی نے مندرجہ ذیل خدمات

انجام دیں:

۱۔ احادیث کی تخریج کی، کیونکہ حدیث جب دوسرے ماخذ میں ہو اور اسلوب مختلف ہو تو حدیث کے معنی و مفہوم سمجھنے میں یہ چیز معاون ثابت ہوگی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس دوسرے ماخذ میں تشریح و تعلیق بھی ہوتی ہے، جس سے اس کتاب کے مطالعہ کے وقت پیش آنے والے اشکالات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ احادیث کے مبہم اور غریب الفاظ کی تشریح و توضیح کی۔

۳۔ بہت سے مقامات پر حنفی مسلک کی وضاحت بھی کی۔

۴۔ صاحب مخطوطہ سے مصنف تک کے رواۃ کے تراجم مختصر آ تحریر فرمائے۔

سنن سعید بن منصور کی تحقیق میں مولانا الاعظمی کی کاوشوں کو دیکھ کر ڈاکٹر

حمید اللہ مولانا ابراہیم کے نام ایک مکتوب میں اسکا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ:

”مولانا الاعظمی سنن سعید بن منصور کی تحقیق کیا کر رہے ہیں، کتاب کو چار

چاند لگا رہے ہیں۔“ ۲

جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اس کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں

۱۔ کتاب السنن۔ کلمۃ المحقق

۲۔ حیات ابوالرأثر ص ۳۰۹

مخطوطے کے انکشاف، سعید بن منصور کا تذکرہ اور کتاب کی اہمیت و افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دو جلدوں میں یہ کتاب ۱۳۸ھ مطابق ۱۹۶۷ء اور ۱۳۸۸ھ ۱۹۶۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ”سنن سعید بن منصور“ کی کسوٹی مولانا اعظمی کی تحقیقی صلاحیت اور فن حدیث میں گیرائی و گہرائی کی جانچ پرکھ کے لئے کافی ہے، اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پوری تحقیق کا محور مولانا کی یادداشت اور وسعت مطالعہ ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے اس کتاب کے طرز تحقیق پر حیرت و استعجاب کا اظہار اس انداز میں کیا:

”کتاب کی تہذیب و تدوین اور تحشیہ وغیرہ کا کام مولانا اعظمی کا کیا ہوا ہے، اور حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے ہوئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہو گئی ہے۔“
مولانا شاہ معین الدین ندوی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
”..... سنن سعید بن منصور التوفی ۲۲ھ مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی ہے..... مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اسکو ایڈٹ کیا ہے، ان کا نام تصحیح و تحشیہ اور ترتیب و تہذیب وغیرہ کی صحت و خوبی کی پوری ضمانت ہے..... ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوا جسکے لئے فاضل مرتب اور مجلس علمی دونوں اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔“

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج ۸۱ ص ۳۱۰- سعید قال: ناہشیم عن یونس عن الحسن قال:

۱۔ صدق جدید ۲/ اگست ۱۹۶۸ء

۲۔ معارف ج: ۱۰۲ ش: ۴ ص: ۴

تعلیقات و حواشی میں مولانا الاعظمی بعض اہم مسائل میں فقہاء وائمہ کی آراء و مسلک بھی مختصر بیان کرتے چلتے ہیں، جب کوئی مرتد حالت ارتداد میں مرجائے، یا قتل کر دیا گیا ہو یا دارالحرب چلا گیا ہو اور قاضی نے بھی اسکے دارالحرب جاننے کا فیصلہ کر دیا ہو تو ایسی صورت میں اسکے مال کا وارث کون ہوگا؟ مولانا اعظمی نے اس روایت کے ذیل میں مرتد کی میراث سے متعلق فقہاء کے مذاہب بیان کئے ہیں، فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو مال اس شخص نے حالت اسلام میں کمایا ہے اسکے وارث مسلم ورثاء ہوں گے اور جو مال حالت ارتداد میں کمایا ہے اسکو بیت المال میں ڈال دیا جائے گا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اسکی تمام کمائی کے مالک اسکے مسلم ورثاء ہونگے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اسلام و ارتداد دونوں حالتوں میں کمائے ہوئے مال کو بیت المال میں ڈال دیا جائے گا۔ مولانا الاعظمی ”سراجیہ“ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جو مال مرتد نے دارالحرب کوچ کر جانے کے بعد کمایا ہے تو اس مال کی حیثیت بالاجماع ”فحی“ کی ہوگی۔

۲- ج: ۱ ص: ۲۸۲ ح: ۱۱۷۶- حدثنا سعید قال: نا هشیم قال: أنا یونس عن الحسن..... قال: تطلق التي نوى، أو اراد أو اراد إلخ.

”أو اراد أو اراد“ پر حاشیہ لگا کر مولانا رقمطراز ہیں: ”أرى أن النسخ أعاده سهواً يدل عليه ما في عب، وقد أخرجه بهذا الإسناد سواء (۱۵۶/۳)“ یعنی میرا خیال ہے کہ کاتب نے بھول سے دو مرتبہ لکھ دیا ہے، مصنف عبد الرزاق کی حدیث اسکی دلیل ہے، عبد الرزاق نے اس روایت کو بعینہ اسی سند سے نقل کیا ہے۔ (۱۵۶/۳)

۳- ج: ۲ ص: ۲۷۸ ح: ۲۶۹۲- حدثنا سعید قال: نا أبو الأحوص عن

الأسود بن قیس عن شبر بن علقمة الخ.

اصل نسخہ میں ”بشبر“ لکھا ہوا تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے، صحیح ”شبر بن علقمة“ ہے جیسا کہ متن میں مذکور ہے، مولانا نے دلیل دی کہ شبر بن علقمة کا تذکرہ ”المرح والتعدیل“ میں موجود ہے، ابن شاکر مصری نے اپنی تصنیف ”المختل“ (۳۳۶/۷) میں شبر بن علقمة لکھا ہے، مولانا الاعظمیٰ انکے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ”ولم یتنبہ أنه خطأ“ یعنی ابن شاکر کو تنبیہ نہیں ہوا کہ شبر بن علقمة لکھنا غلط ہے۔

مجمع بحار الانوار

شیخ محمد طاہر پٹنی | خدام حدیث میں ایک عظیم نام حضرت شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا آتما ہے۔ اکبری دور کے اس محدث نے حدیث کی اشاعت و ترقی اور شرک و بدعت کی تردید میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ شیخ پٹنی کا نام محمد تھا لقب مجد الدین لیا جیسا کہ ”تذکرۃ الموضوعات“ اور ”النور السافر“ وغیرہ میں مذکور ہے، جمال الدین تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ”اخبار الاخیار“ میں ”میاں محمد طاہر“ لکھا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ”محمد“ شیخ کا نام ہے اور ”طاہر“ انکے والد کا نام ہے۔ بالکل اسی قاعدہ کے تحت جس کی ”ابوالفضل“ کے فاضل محشی محمد ہادی علی نے تصریح کی ہے کہ: ”حذف لفظ ابن از میان دو نام در فارسی شائع است“ چنانچہ یہاں اضافت اپنی ہے۔

۱۔ مقدمہ مجمع بحار الانوار ۱۹:۱

ج۔ تذکرۃ الموضوعات بحوالہ مجمع بحار ۵: ۴۳، النور السافر ص ۳۶۱ عبد القادر حضری

ج۔ ابوالفضل ص ۳ ابوالفضل علای مطبوعہ نول کشور

شیخ پٹنی ۹۱۳ھ میں گجرات کی قدیم ترین آبادی پٹن میں پیدا ہوئے۔^۱ ہند و عرب کے کبار علماء کے زیر سایہ آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی جن میں شیخ ناگوری، عبد اللہ سورتی، شیخ برہان الدین سمودی، استاذ الزماں ملا مٹھ، ابو عبید اللہ زبیدی، شیخ عبد اللہ حضری، شیخ جبار اللہ بن فہد کی، شیخ ابوالحسن بکری کی، شیخ علی بن عراقی مدنی، شیخ ابن حجر عسقلانی، شیخ علی متقی معروف اور قابل ذکر اساتذہ ہیں۔

شیخ محمد بن طاہر شیخ علی متقی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کی متابعت میں مخالفت بدعت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔^۲ مہدویت کا فتنہ آپ کے ہی دور میں اٹھا تھا جسکی سرکوبی کے لئے آپ نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ احادیث کی تحقیق اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کے لئے دور دراز علاقوں سے طالبانِ علوم شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے، انکے درس کو زبردست شہرت و مقبولیت حاصل تھی۔ غریب اور نادار طلبہ کی آپ کفالت بھی فرماتے، سخاوت آپ کی سرشت میں تھی، شیخ کے اس وصف نے علوم و فنون کے ماہرین کی ایک بڑی جماعت تیار کر دی تھی۔^۳

شیخ پٹنی کو علم حدیث سے خاص شغف تھا، حدیث میں آپ کی ایسی عظیم اور انوکھی خدمات ہیں جن کو دیکھ کر برجستہ دنیا کی زبان سے آپ کے لئے ”رئيس المحدثين“، ”ملك المحدثين“ جیسے پر عظمت القاب و آداب نکلے۔ عربی ادب اور حل لغات میں شیخ کو دسترس حاصل تھی، اسی وجہ سے آپ کو ”اللغوي“ بھی کہا گیا۔ مولانا آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں شیخ کی تو صیف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”خادم حدیث نبوی و ناصر سنن مصطفوی است۔“^۴

۱۔ النور السافر ص ۳۶۱

۲۔ مشائخ احمد آباد ص ۳۸۵ مولانا محمد یوسف ابن سلیمان متالا

۳۔ النور السافر ص ۳۶۲، شذرات ۸: ۴۱۰

۴۔ مآثر الکرام ۱۹۳: ۱ مولانا آزاد بلگرامی

اجین اور سارنگ پور کے بیچ میں ۶۷ سوال ۹۸۶ء کو ایک مہدوی نے آپ کو شہید کر دیا۔ شیخ کے ساتھی نعش مبارک پٹن لے کر آئے اور آبائی قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔

محدث محمد بن طاہر پٹنی کی پوری زندگی درس و تدریس، تبلیغ دین اور ترویج بدعت میں گزری۔ اسی کے ساتھ آپ نے اہم اور پیچیدہ مسائل پر بھی قلم اٹھایا اور بہترین علمی کتب کی تصنیف کا سہرا آپ کے سر رہا۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ شیخ کی بہت سی تصنیفات پردہ خفا میں رہ گئیں! آپ نے چھوٹی بڑی ۳۱ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان تصنیفات میں ’تذکرۃ الموضوعات‘، ’قانون الموضوعات‘، ’المغنی‘ اور ’مجمع بحار الانوار‘ کو آفاقی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

مجمع بحار الانوار کی خصوصیات | راقم الحروف کا اصل موضوع حدیث کی اس عظیم کتاب کا تعارف اور نئی تعلیقات و حواشی سے آراستہ اسکی از سر نو اشاعت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔ ”مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل والاخبار“ میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی نے قرآن مجید و حدیث شریف میں آنے والے مشکل الفاظ و تراکیب کی بڑی شرح و بسط کے ساتھ تحقیق کی ہے، اس لحاظ سے ”مجمع بحار الانوار“ غریب الفاظ کی ایک لغت ہو گئی، یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ جس حدیث میں وہ مشکل الفاظ آئے ہیں تو بجائے اسکے کہ صرف ان الفاظ کی محدث چینی تحقیق کرتے پوری حدیث کو نقل کیا اور پھر الفاظ پر لغوی بحث کی؛ چنانچہ اس طرح سے اس کتاب کی حیثیت حدیث کی شرح کی بھی ہو گئی۔

اس کتاب میں تکرار سے اجتناب اور اختصار پر زور دیا گیا ہے، اس فن سے متعلق تمام کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے، اس موضوع پر ابن اثیر کی

”انتہائی“ کو شیخ نے اصل قرار دیا اور اپنی کتاب ”مجمع بحار الانوار“ میں اس کے تمام مباحث کو نقل کیا ہے، شاذ و نادر ہی کوئی چیز نقل ہونے سے رہ گئی ہو یا وہ بحث پہلے سے ہی مشہور ہو۔

شیخ نے ”مجمع بحار الانوار“ میں بہت سی مفید باتوں کا اضافہ کیا ہے جو دوسری کتابوں میں نہیں ہیں، اور تحقیق کے دوران جو دریافتیں ہوئیں انکو بھی شامل فرمایا۔ کتاب کے اخیر میں مکملہ بھی لکھا جس سے کتاب کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

”وهو كتاب جمع فيه كل غريب الحديث وما ألف فيه فجاء كالشرح للصحاح الستة، فإن لم يكن عند أحد شرح لكتاب من الأمهات الست فهذا الكتاب يكفيه لحل المعاني وكشف المباني، وهو كتاب متفق على قبوله متداول بين أهل العلم منذ ظهر في الوجود.“

(اس کتاب میں حدیث کے تمام غریب الفاظ اور اس موضوع پر تالیف کردہ کتابوں کے مباحث جمع کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اسکی حیثیت صحاح ستہ کی شرح کی ہو گئی ہے، اگر کسی کے پاس صحاح ستہ میں سے کسی کتاب کی شرح نہ ہو تو یہ کتاب اسکے الفاظ و معانی کے حل کے لئے کافی ہوگی۔ اس کتاب کی مقبولیت پر سبھی کا اتفاق ہے، جب سے منظر عام پر آئی ہے علماء کے درمیان متداول ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

”در علم حدیث توالیف مفیدہ جمع کردہ از آنجملہ کتابیست کہ متکفل شرح

صحاح است مسمیٰ بمجمع بحار الانوار۔^۱

(علم حدیث میں آپ کی مفید تالیفات ہیں انہیں میں ایک کتاب مجمع

بحار الانوار کے نام سے ہے جو صحاح ستہ کی شرح کی ضامن ہے۔)

مجمع بحار الانوار کو زیور طبع سے آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا سہرا

منشی نول کشور کے سر جاتا ہے۔ جب منشی جی کو اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا علم ہوا تو

ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اسکے چھ نسخے حاصل کئے جن کی تصحیح کا کام حضرت

مولانا محمد مظہر نانوتوی صدر المدرسین مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے انجام دیا تھا۔

ان نسخوں میں ۱۰۱۹ھ کا مکتوبہ شیخ عبدالحق دہلوی کا بھی نسخہ تھا، اسی نسخہ کو بنیاد

بنا کر منشی نول کشور پریس لکھنؤ نے ’مجمع بحار الانوار‘ کو پہلی دفعہ ۱۲۸۳ھ میں شائع کیا۔

۱۳۱۲ھ میں اسی مطبع سے یہ کتاب دوبارہ طبع ہوئی اسکے چار ایڈیشن اس پریس سے

نکلے۔ لیکن جب مطبع نول کشور بند ہو گیا اور مطبوعہ کتابیں ضائع ہونے لگیں تو انہیں

میں سے ایک کتاب ’مجمع بحار الانوار‘ بھی تھی جو نایاب یا عنقاء ہو کر رہ گئی تھی۔

مجمع بحار الانوار کی جدید اشاعت | حجاز میں مقیم شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے وطن

کے لوگوں کو اس جوہر نایاب کی فکر ہوئی اور اس عظیم کتاب کی اشاعت و طباعت کا

ارادہ کر لیا۔ ان میں سب سے اہم نام ”عبد القادر نورولی“ کا ہے۔ ان لوگوں نے

حضرت مولانا علی میاں صاحب سے درخواست کی کہ تصحیح وغیرہ سے متعلق جملہ امور کی

ذمہ داری سنبھال لیں۔

تصحیح و تعلیق کے لئے مولانا علی میاں صاحب جیسے بالغ نظر عالم کی نگہ

۱۔ اخبار الاخبار ص ۲۷۳ شیخ عبدالحق دہلوی

۲۔ مطبع نول کشور ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ میں قائم ہوا، اس مطبع کی سب سے پہلی کتاب پنوار یوں

کی پیمائش کی کتاب تھی۔ (تحقیقی مقالات ص ۲۲۵ ظفر احمد صدیقی)

۳۔ مقدمہ مجمع بحار الانوار

انتخاب مولانا حبیب الرحمن الاعظمی پر پڑی، علامہ ندوی نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا الاعظمی اس کام کو اپنی نگرانی میں کرائیں، دوسری جانب مولانا عبدالحفیظ صاحب مرتب مصباح اللغات کو مولانا کی معاونت کے لئے آمادہ کیا۔ مولانا علی میاں ندوی مولانا الاعظمی کو اس بابت ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”بڑے اصرار و خواہش سے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ ”مجمع بحار الانوار“ کی اشاعت ثانیہ اور تصحیح کا کام اپنی نگرانی اور ماتحتی میں کروائیں، آپ نے اسکو قبول فرمایا اور اسکا وعدہ فرمایا کہ آپ کسی صاحب علم سے اپنی نگرانی میں یہ کام لیں گے..... یقیناً اس کتاب کے شایان شان اور موجودہ تحقیقی معیار اور طرز کے مطابق وہی نسخہ ہوگا جو آپ کے پیش نظر ہے، اور اسکی اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت آپ کو عطا فرمائی ہے۔“

مخطوطات | اب ایک بار پھر مجمع بحار الانوار کے نسخوں کی تلاش شروع ہوئی، مطبوعہ نسخوں کے علاوہ دو قلمی نسخے بھی دستیاب ہوئے۔ ایک نسخہ حیدرآباد سے شاہ پیر محمد کے کتب خانہ سے حاصل کیا گیا اور دوسرا قدیم نسخہ پٹن سے منگایا گیا۔ شیخ کی زندگی میں تیار کردہ اس کتاب کے دو نسخوں کا مولانا الاعظمی نے لکھنؤ اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں مشاہدہ کیا۔^۱

تصحیح و تعلیق | مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اور انکے معاون مولانا عبدالحفیظ صاحب نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے موجودہ نسخوں کا باہم مقابلہ و موازنہ کر کے تصحیح و تحشیہ کا کام انجام دیا۔ مولانا الاعظمی نے الفاظ کی تشریح کی، حدیث کی کن متداول کتابوں میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کا حوالہ بھی دیا اور مطبوعہ نسخوں میں ہونے والی

۱۔ المآثر نمبر ۲ تا جنوری ۲۰۰۱ء ص ۹۱-۹۲

۲۔ مقدمہ مجمع بحار الانوار

لغزشوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ مولانا لکھتے ہیں:

”وقد عن لي اثناء إعادة النظر في المبيضة أشياء فعلقها
أيضاً وأوهام فنبهت عليها وختمت أكثرها برمز ”ح“ أو
بلفظ ”الأعظمي“ وتركت بعضها غفلاً“۔

(مسودہ پر نظر ثانی کے دوران بہت سی اشیاء اور اوہام نظر سے گزرے جن
پر میں نے حواشی لکھے اور متنبہ کیا، ان میں سے بیشتر کے اخیر میں ”ح“ یا
”الأعظمي“ کی علامت بنی ہوئی ہے اور بعض جگہوں کو میں نے بے
علامت چھوڑ دیا ہے۔)

کم و بیش ۹۲ مقامات ایسے ہیں جہاں مولانا الأعظمی نے حواشی لکھے یا تصحیح کی۔
اور جن جگہوں پر مولانا نے شناختی علامت نہیں بنائی ہے ان کو شامل کر لیں تو تعلیقات
وحواشی کی تعداد مزید بڑھ جاتی ہے۔ پٹن سے دستیاب نسخہ میں جگہ جگہ مفید تعلیقات
تھیں، جن کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ مؤلف کے ہی قلم سے ہیں، مولانا
نے ان تعلیقات کو بھی صفحات کے نیچے نقل کر دیا ہے۔

مولانا نے ”مجمع بحار الانوار“ پر مقدمہ بھی تحریر فرمایا، اس مقدمہ میں قرآن
وحدیث کے الفاظ غریبہ کی جمع و تدوین کی تاریخ، اس فن کی ضرورت و افادیت اور اس
موضوع پر اہم تصنیفات کا مختصر جائزہ لیا، اور ”مجمع بحار الانوار“ کی خصوصیت و امتیاز
پر روشنی ڈالی۔ مولانا علی میاں صاحب ندوی اس مقدمہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

”ما شاء اللہ بڑا فاضلانہ مقدمہ ہے، اس فن کے ارتقاء اور عہد بعہد
تالیفات کا جائزہ لے لیا ہے، کتاب کے خصائص مبصرانہ ہیں، انہیں
تحقیقات و خصوصیات کی بناء پر میرے دل میں آپ کی جو قدر و منزلت

ہے اس کو خدا جانتا ہے۔“۱

قاضی اطہر مبارکپوری ”مجمع بحار الانوار“ کے سلسلہ میں مولانا الاعظمیٰ کی خدمات کو اس انداز میں سراہتے ہیں:

”مولانا نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دیا، کہنا چاہئے کہ

اس عظیم لغت حدیث کی تحقیق بھی آپ نے ہی کی ہے۔“۲

یہ کتاب مولانا اعظمیٰ کی لغت وادب پر گرفت اور انکے علمی کمالات کی عکاس ہے۔ نئی تعلیقات سے آراستہ پانچ جلدوں پر مشتمل ”مجمع بحار الانوار“ ڈاکٹر عبدالمعید خاں کے زیر نگرانی دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۹۶۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۳۳ ص ۱ پر ایک لفظ ’ماتۃ‘ آیا ہے، مولانا اس لفظ کی تشریح و توضیح کرتے ہیں کہ ’الماتۃ‘ کی جمع ’موات‘ ہے، ’المت‘ کا اسم ہے، اس کے معنی تقرب حاصل کرنے یا وسیلہ اختیار کرنے کے ہیں، مطبوعہ ایڈیشن اور پٹنی نسخہ میں ایسا ہی واقع ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ مکتبہ پیر جھنڈو پاکستان کے نسخہ میں ’ماتۃ‘ کے بجائے ’ماتۃ‘ آیا ہے اور وہ غلط ہے۔

۲- ج: ۳۷ ص ۷ پر ’بشور‘ آیا ہے، مولانا اس کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں کہ جلد کی سطح جس پر بال اگتا ہے، کو چھیلنے کو ’بشور الجلد‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳- ج: ۲ ص ۲۰۶ پر ایک لفظ ہے ’سب‘، مولانا حاشیہ میں اس کی وضاحت فرماتے ہیں: ’بالکسر ثوب رفیق‘ یعنی ’سب‘ کی سین مکسور ہے، یہ ایک بار یک کپڑا ہوتا ہے۔

مصنف عبدالرزاق

احادیث کی کتابوں کی ترتیب میں مختلف اسالیب اور طریقے اختیار کئے گئے۔ خاص طور پر مرتب کردہ کتابوں کے خاص اصطلاحی نام بھی رکھے گئے۔ موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے ان کتب احادیث کی چھ قسمیں ہیں:

(۱) جوامع (۲) مسانید (۳) معاجم (۴) اجزاء (۵) رساکنل (۶) اربعینات جامع حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں آٹھ طرح کے مضامین جمع کئے گئے ہوں:

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) رقائق (۴) آداب (۵) تفسیر (۶) تاریخ (۷) فتن (۸) مناقب

کثیر تعداد میں جوامع لکھی گئیں۔ مشہور جوامع میں سے ایک جامع عبدالرزاق ہے، جو مصنف عبدالرزاق کے نام سے مشہور ہوئی۔ علماء کی ایک رائے یہ ہے کہ مصنف وہ کتاب ہے جو فقہی ابواب پر مرتب کی گئی ہو، حالانکہ یہ تعریف سنن کی ہے۔ ابتداء سنن کو مصنف ہی کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر محمود طحان مصنف کی تعریف میں لکھتے ہیں:

”هو الكتاب المرتب على الأبواب الفقهية و المشتمل

على الأحادیث المرفوعة والموقوفة والمقطوعة.....“ ۲

(مصنف وہ کتاب ہے جو فقہی ابواب پر مرتب ہو اور مرفوع، موقوف و مقطوع حدیثوں پر مشتمل ہو۔)

ڈاکٹر محمود طحان نے آگے چل کر ”مصنف“ اور ”سنن“ کے فرق کو بھی واضح

۱۔ لامع الدراری ۱: ۴۳-۴۴ شیخ محمد زکریا کاندھلوی

۲۔ اصول التخریج ودراسة الأسانید ص ۱۳۴ ڈاکٹر محمود طحان

کیا کہ مصنف میں احادیث مرفوعہ، موقوفہ اور مقطوعہ سبھی پائی جاتی ہیں، جبکہ سنن میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ احادیث مرفوعہ کے علاوہ کوئی حدیث پائی جاتی ہو۔ چنانچہ اسی لئے احادیث موقوفہ و مقطوعہ کو اصطلاح میں ”سنن“ نہیں کہا جاتا ہے۔

امام عبد الرزاق | عبد الرزاق بن ہمام بن نافع صنعانی (۱۲۶ھ-۲۱۱ھ) جلیل القدر امام حدیث ہیں، اپنے زمانہ کے منبع العلوم سمجھے جاتے ہیں، علم و کمال کا دور دور تک شہرہ تھا۔ آدم بن موسیٰ امام بخاری کا قول نقل کرتے ہیں کہ عبد الرزاق نے اپنی کتاب سے جو بھی بیان کیا ہے وہ اصح ہے۔^۱ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مجھے معمر سے روایت کرنے میں، عبد الرزاق کی حدیث، بصریوں کی روایت کردہ حدیث سے زیادہ محبوب ہے۔^۲ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انکے علاوہ کسی شخص کے پاس اس قدر لوگوں نے سفر نہیں کیا۔^۳ حافظہ کا حال یہ تھا کہ سترہ ہزار حدیثیں ان کو یاد تھیں۔^۴ امام عبد الرزاق کو ابن جریج، ثور بن یزید، معمر، اوزاعی اور سفیان ثوری کے علاوہ بہت سے علماء و مشائخ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔^۵ سفیان بن عیینہ، احمد بن حنبل، ابن راہویہ، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی وغیرہ ائمہ حدیث آپ کے شاگردوں میں ہیں۔

امام عبد الرزاق پر الزام ہے کہ ماکل بہ تشیع تھے۔ اس سلسلہ میں خود

۱۔ اصول التخریج ودراسة الأسانید ص ۱۳۳

۲۔ تاریخ الکبیر ق ۲: ج ۳ ص ۱۳۰ امام بخاری

۳۔ تہذیب التہذیب ۲: ۳۱۲

۴۔ وفیات الاعیان ۲: ۱۰۳ ابن خلکان

۵۔ الاعلام ۳: ۲۵۳

۶۔ تذکرۃ الحفاظ ۱: ۳۳۱

۷۔ سیر اعلام النبلاء ۹: ۱۳۰

عبدالرزاق کے ہی ایک قول کو نقل کیا جاتا ہے اور اسی کو ہم کافی سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے کبھی بھی شرح صدر نہ ہوا کہ میں حضرت علیؑ کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ پر ترجیح دوں۔ اللہ حضرات شیخین اور عثمانؓ و علیؓ پر رحمت نازل کرے، جو ان سے محبت نہ کرے وہ مومن نہیں۔

مصنف عبدالرزاق کی خصوصیات | مصنف عبدالرزاق مصنف ابن ابی شیبہ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اسکی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں، اس میں اکیس ہزار تینتیس حدیثیں ہیں۔ احادیث و آثار کا یہ ایک قیمتی ذخیرہ تھا، جس سے بہت سے فقہاء و محدثین نے استفادہ کیا، جس کے وجود سے دوسری تیسری صدی ہجری سے پہلے تک تدوین احادیث کے انقطاع کے دعویٰ کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں تصنیف کردہ کتب احادیث کی ایک اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ اکثر موضوعات اور عنوانات کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مصنف عبدالرزاق کا شمار کتب احادیث میں تیسرے طبقہ میں کیا ہے۔^۲

مصنف کی تحقیق | محدث العصر علامہ انور شاہ صاحبؒ کی خواہش تھی کہ کاش کوئی اس ضخیم تراث اسلامی (مصنف) کو شائع کر کے اسے پھر سے حیات نو بخشا لائق شاگرد مولانا محمد میاں سملکی مدیر مجلس علمی نے استاذ کی اس آرزو پر لبیک کہا اور اسکو پورا کرنے کا عزم کر لیا۔ مختلف مقامات سے مصنف کے نسخے حاصل کئے اور شاہ صاحب کے ہی شاگرد مولانا حبیب الرحمن الاعظمی سے درخواست کی کہ اس کی تحقیق فرمائیں۔

۱۔ تہذیب الکمال بحوالہ سیر اعلام النبلاء، ۵۷۴: ۹

۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ۳۸۹: ۱ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۳۔ مصنف عبدالرزاق - مقدمہ الناشر

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے بھی استاد گرامی کی اس خواہش کو سرا آنکھوں سے لگایا اور مصنف پر کام شروع کیا، مصنف کے اجزاء مختلف ممالک میں منتشر تھے، جہاں تک رسائی ہوئی انکو حاصل کیا گیا۔ افسوس کہ مولانا الاعظمی مصنف پر مقدمہ نہ لکھ سکے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور نہ مصنف کے سلسلہ میں ہمارے سامنے پوری تفصیلات ہوتیں کہ کہاں سے مخطوطات حاصل کئے، کس کو اصل قرار دیا اور اسکی تحقیق میں کن طریقوں کو اپنایا گیا۔

مختصر عرض ہے کہ مولانا کو جتنے بھی نسخے ملے سبھی ناقص تھے، سوائے ”مراد ملا“ آستانہ کے نسخہ کے کہ وہ کامل تھا، البتہ اسکی بھی جلد اول اور پانچویں جلد کے شروع میں کچھ نقص تھا۔^۱ مصنف کے شروع میں مکتبہ اسلامی دمشق اور مراد ملا آستانہ کے جن دو مخطوطوں کے عکس دیئے گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ان دونوں نسخوں سے ایڈیٹنگ میں خاص طور سے مدد لی ہے، انکے علاوہ حیدر آباد کا بھی نسخہ آپ کے سامنے تھا اور تحقیق کے دوران ڈاکٹر حمید اللہ کے والد کا نسخہ بھی ملا، جس سے مولانا نے استفادہ کیا۔

مولانا الاعظمی نے مصنف عبدالرزاق کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل خدمات

انجام دیں:

۱۔ ۵ فروری ۱۹۷۹ء کے ایک مکتوب میں جو شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے نام ہے۔ مولانا نے مقدمہ نہ لکھ سکنے کے اسباب تحریر فرمائے ہیں کہ: ”مصنف عبدالرزاق کے مقدمہ کا بہت کثرت سے اور نہایت شدید تقاضہ ہے، لیکن کچھ تو میری طبیعت ٹوٹ گئی، کچھ دوسرے اہم کاموں میں انہماک، پھر برسوں تک شدید ترین علالت کا سلسلہ، ان اسباب کی بناء پر اب تک کچھ نہ لکھ سکا، حافظہ میں مواد فراہم ہے، انکو اوراق پر منتقل کرنے کی نوبت نہیں آرہی ہے۔ (المآثر اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء)۔

۲۔ مصنف عبدالرزاق - تنبیہ

۱۔ مخطوطات میں جو اغلاط تھے، خواہ وہ غلطی راوی کے نام میں ہو، یا حدیث کے الفاظ میں، ان سب کی حوالہ سے تصحیح کی۔

۲۔ مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کی۔

۳۔ اختلاف نسخ کو بیان کیا اور ترجیح کی صورت میں کسی ایک کو ترجیح دی۔

۴۔ احادیث کی تخریج کی اور کن دوسرے مجموعہ ہائے حدیث اور متداول کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے ان کا حوالہ دیا، سند پر جرح کرتے ہوئے اس حدیث کا درجہ متعین فرمایا۔

۵۔ حدیث کے کسی شارح و محشی سے کوئی چوک ہو گئی ہے تو اس پر تنبیہ فرمائی اور مصنف میں اسکی تصحیح کی۔

۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ کا جو قلمی یا مطبوعہ نسخہ مولانا کے پاس تھا، وہ پورے کا پورا مصنف کے ذیل میں لے لیا گیا ہے۔

۷۔ مسند حمیدی کی تحقیق میں مولانا نے کتب اصلیہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ لیکن مصنف عبد الرزاق میں کتب شبہ الاصلیہ اور کتب غیر اصلیہ پر زیادہ اعتماد ہے۔

مولانا الاعظمیٰ کی مسلسل دس سال تک جانفشانی اور جانسوزی کے بعد ”مصنف عبد الرزاق“ پایہ تکمیل تک پہنچی، بیروت سے مصنف کے پہلے ایڈیشن کی عمدہ طباعت بھی مولانا کی ہی رہن منت ہے، انہوں نے اسکی طباعت اپنی ہی نگرانی میں کرائی، ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء (۱۳۹۰ھ - ۱۳۹۲ھ) کے دوران یہ کتاب گیارہ جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

جامع عبد الرزاق یا جامع معمر؟ | کتاب الجامع مصنف کی حدیث نمبر ۱۹۴۱۹

۱۔ معلم الامۃ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور انکی فقہ ص ۲۱۶ ڈاکٹر حنیفہ رضی

۲۔ المآثر نومبر تا جنوری ۹۸-۱۹۹۷ء ص ۳۵

جلد دس سے شروع ہوتی ہے۔ اور حدیث نمبر ۲۱۰۳۳ جلد گیارہ پر ختم ہوتی ہے۔
 ’’مصنف‘‘ کے اس حصہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ انا حصہ (جامع) عبدالرزاق کی تصنیف ہے یا انکے استاذ معمر بن راشد کی؟ اس مسئلہ کو سب سے پہلے زیر بحث لانے والے مشہور محقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ہیں۔ مولانا الاعظمی کی تحقیق ہے کہ کتاب الجامع عبدالرزاق کی تصنیف ہے معمر بن راشد کی نہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ مولانا الاعظمی کی تحقیق پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

’’مصنف عبدالرزاق کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے، اور اسکے آڈیٹر مولانا اعظمی (مولانا حبیب الرحمن صاحب) کو انتخاب نہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے۔‘‘
 مولانا الاعظمی نے ڈاکٹر حمید اللہ کے اس نقد کے جواب میں ایک مختصر مضمون تحریر فرمایا، لکھتے ہیں کہ:

’’ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی خام مسلم مستشرق کی باتوں میں آگئے..... مصنف عبدالرزاق کی آخری کتاب، کتاب الجامع کو جامع معمر قرار دینے والوں نے اس کی اکثر حدیثوں کو بروایت معمر پا کر اپنے استشرق کے زور سے اس کو جامع معمر یقین کر لیا، وہ اور کچھ نہیں پوری کتاب الجامع کو حرفاً حرفاً پڑھ لیتے تو یہ دعوی کرتے ہوئے ان کو خود شرم محسوس ہوتی۔‘‘^۱

مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اپنے موقف کے دفاع میں مندرجہ ذیل

۱۔ الرشاد ج: ۳ ش: ۲۷ ص ۵۷

۲۔ الرشاد مئی ۱۹۸۳ء ص ۴۵-۴۶، الفرقان جون جولائی ۱۹۸۳ء ص ۷۳-۷۵

شواہد پیش کئے:

۱- کتاب الاوائل میں شیخ محمد سعید بن سنبل مکی نے مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث ”کان شعر رسول اللہ ﷺ إلى أنصاف أذنيه“ نقل فرمایا اور اسکے بعد تحریر فرمایا ”وهو آخر مصنفه“ یعنی یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جامع جو مصنف میں ہے جامع عبدالرزاق ہی ہے۔

۲- شاہ عبدالعزیز صاحب ”بستان المحدثین“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف شاکل پر ختم کی اور شاکل کو حضور اکرم ﷺ کے موئے مبارک کے ذکر پر ختم فرمایا۔ یعنی شاہ صاحب بھی اسی کے قائل ہیں کہ یہ مصنف کا آخری حصہ ہے۔

۳- داخلی شہادت کے طور پر مولانا نے جلد دس سے سات اور گیارہ سے اٹھائیس حدیثوں کی نشاندہی فرمائی جن کا کوئی تعلق معمر سے نہیں ہے، بلکہ ان کو عبدالرزاق نے دوسرے شیوخ سے روایت کیا ہے۔

۴- صاحب کشف الظنون نے امام عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا ہے، اور فوائد سید نیز شیخ البانی نے لکھا ہے کہ الجامع لعبدالرزاق کا ایک نسخہ مکتبہ طاہریہ دمشق میں محفوظ ہے، اس نسخہ پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع بھی درج ہے۔

مولانا الاعظمی نے دلیل کے طور پر سب سے پہلے شیخ محمد سعید بن سنبل کی تحریر پیش کی اور لکھا: ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ محمد اسحق کے شیخ الشیخ کے شیخ کو بھی انتباہ نہیں ہوا“ دوسری دلیل میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تحریر پیش کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں: ”لیجئے شیخ المشائخ کو بھی انتباہ نہیں ہوا۔“

مندرجہ بالا شواہد کی حیثیت تائیدی تو ہو سکتی ہے، داخلی شہادات اور مخطوطات

سے براہ راست پیش کئے جانے والے دلائل کی نہیں۔ اور جہاں تک انجوابات کی بات ہے تو بہت سے متقدمین علماء کی رائے سے متاخرین نے دلائل کی بنیاد پر اختلاف کیا اور ان پر نقد کیا، عین ممکن ہے کہ پہلے کے محقق کی رسائی وہاں تک نہ ہو جہاں تک بعد کے محقق کی ہے، جیسا کہ خود مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی اس بات کو حقیقت سے دور بتایا کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ مولانا مسند حمیدی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ شاہ صاحب کو مسند حمیدی کا نسخہ نہ ملا ہو، اور انہوں نے کسی مصنف سے نقل کیا ہو اور اسی پر اعتماد کر بیٹھے ہوں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی ہے، تفصیل مسند حمیدی کے تذکرہ میں ملاحظہ ہو۔ بالکل یہی احتمال یہاں بھی ہے کیونکہ یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عبدالرزاق کی جامع ہے معمر کی نہیں، یہ بھی امکان ہے کہ مصنف میں پائے جانے کی وجہ سے اسکو مصنف کا ہی جزو سمجھ لیا ہو، البتہ وہ حدیثیں جن کی مولانا نے نشاندہی فرمائی ہے اپنی جگہ ایک مضبوط دلیل ہے۔

مخطوطات کی غواصی کرنے والے اور تحقیق کے غوامض و رموز سے واقف و باخبر ڈاکٹر حمید اللہ کو مولانا الاعظمی کے ان جوابات نے مطمئن نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مفصل ایک جوابی مضمون تحریر فرمایا جو ماہنامہ ”الرشاد“ (جون - جولائی ۱۹۸۳ء) میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا الاعظمی کے ہر جواب کا دلائل سے رد کیا اور بالآخر ان کا اصرار اسی پر رہا کہ جامع ”مصنف“ کا جزو نہیں بلکہ جامع معمر ہے۔

جن وجوہ و اسباب کی بنیاد پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی تحقیق پیش کی ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) ترکی میں ڈاکٹر صاحب کو جامع معمر بن راشد کے دو مخطوطے ملے، جن پر نام بھی صرف جامع معمر کا تھا اور جن کے مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے تھے، ایک

۳۶۳ھ کا تحریر کردہ ہے، انقرہ میں تھا۔ دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مصنف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو انھیں ہو بہو ایک ہی چیز پایا۔

(۲) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بقول مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں ”کتاب الجامع“ کتاب کے آخر میں ہے۔ اگر ایسا ہی نسخہ شیخ سعید بن سنبلی یا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی نظر سے گزرا ہو اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ممکن ہے۔ اگر کسی نے انھیں توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی۔

(۳) اگر جامع معمر میں جو مصنف عبدالرزاق کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے روایت کی ہوں تو اس سے بھی ڈاکٹر صاحب کے مطابق کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (۹ جلدیں) ان میں کثرت سے حدیثیں ”عبدالرزاق عن معمر“ ملتی ہیں۔ اس سے وہ جامع معمر کا جزو نہیں بن جاتیں۔ ایسا بار بار ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے۔ ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سگری کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔

(۴) دمشق کے مخطوطے کو مصر کے فواد سید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ فواد سید انقرہ اور استانبول کے مخطوطوں سے واقف نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ترکی کے مسٹر گبن جامع معمر کو اشاعت کے لئے تیار کرنے کے بعد دمشق اور رباط گئے، ان دونوں جگہوں کے مخطوطوں کو بھی دیکھا۔ مسٹر گبن اپنی جرمن کتاب تاریخ تالیفات عربی میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی

عبدالرزاق ہیں اور انہوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصحاب ابن حجر جلد ۳: ص ۳۱۱، ص ۳۰۶ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

(۵) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ معمر بہت قدیم مؤلف ہیں، ان کے استاد ہمام بن منبہ کے وقت حدیث کے مجموعوں میں کوئی تبویب نہیں ہوتی تھی۔ معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں، پھر ان کے شاگرد تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں صرف مصنف میں ہی ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں۔ اس کا سچ بالکل علیحدہ ہے اور تبویب نسبتاً ابتدائی حالت میں ہے۔ مصنف میں کتاب الاثر ہے اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر (یعنی جامع معمر میں) نہ ہوتیں۔ اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی حال مصنف میں حضرت عمرؓ کی وصیت کا ہے جو مصنف میں بھی ہے اور جامع معمر میں بھی ہے اور دیگر تفصیلات پر مشتمل ہے۔

مولانا الاعظمی نے، جنہوں نے مصنف عبدالرزاق کے ایک ایک حرف پر بڑی بالغ نظری سے تحقیق کی تھی، ڈاکٹر حمید اللہ کے جوابی مضمون پر ایک مفصل جواب تحریر فرمایا، جو عربی مجلہ ”البعث الاسلامی“ میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس مضمون میں مخطوطات پر بحث کی، مخطوطات کے ناقلین کے اندراجات پیش کر کے بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ یہ مصنف کا ہی جزو ہے، معمر بن راشد کی جامع نہیں۔ مولانا نے اس مضمون میں بڑی محققانہ بحث کی ہے۔ ہم اس بحث کی تلخیص یہاں پیش کرتے ہیں۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ احمد بن منصور رمادی نے امام عبدالرزاق سے مصنف کے اس حصہ (جامع) کی سماعت الگ سے کی ہے۔ یہ طریقہ اجازت حدیث لینے دینے کے لئے متداول اور رائج رہا ہے۔ رمادی کی روایت کردہ جامع کے جزء اول کا ایک نسخہ اور ایک دوسرے نسخہ کے جزء اول کا کچھ حصہ میری نظر سے گزرا ہے۔ جس نسخہ میں جزء اول کا پورا حصہ ہے وہ دوسرے والے نسخہ سے قدیم ہے، اور حافظ ابوالفتح نصر بن ابوالفرج حصری متوفی ۶۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا نے مخطوطات میں درج سماعات یا رواۃ کے جن اندراجات کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل میں نہ جا کر اختصار کے ساتھ ان کے پیش کردہ دلائل نقل کئے جاتے ہیں:

۱- حافظ نصر بن ابوالفرج کے مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت رقم ہے: ”الجزء الأول من کتاب الجامع عن عبدالرزاق بن ہمام أبي بكر الصنعاني“ اس نسخہ میں سماع کی تفصیل بھی درج ہے، جس سے اس مخطوطہ کی صحت وثقاہت کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

۲- حافظ نصر اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ جامع عبدالرزاق کے جزء اول کو اس نسخہ سے نقل کیا ہے، جس میں حافظ ابوالحسن القرشی کی تحریر میں یہ صراحت ہے: ”جامع عبدالرزاق کے اس جزء کی ایک جماعت نے شیخ حسین ابن طلحہ سے سماعت کی ہے، ان سماعت کرنے والوں میں قرأت و سماع کا یہ واقعہ ۴۹۲ھ کا ہے۔“ امام نصر بن ابوالفرج نے ابن اخضر کی تحریر سے نقل کیا کہ: ”جامع عبدالرزاق کے جزء اول کی سماعت ابن طلحہ سے ۴۹۰ھ میں ایک جماعت نے کی جن میں قابل ذکر مشہور کا تبہ شہدہ بنت ابی نصر ہیں۔“

۳- حافظ عمر بن حاجب متوفی ۶۳۰ھ کا بھی یہی ماننا ہے کہ یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے۔ انہوں نے نصر کا تحریر کردہ نسخہ حاصل کیا اور اس کے سرورق پر تحریر فرمایا کہ

انہوں نے حافظ تقی الدین بن انماطی کا تحریر کردہ نسخہ دیکھا ہے۔ نصر کے نسخہ پر انماطی کے نسخہ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا کہ جامع عبد الرزاق کے جزء اول اور آخری جزء کو جب مال کے باب تک جمادی الاولیٰ ۵۵ھ میں فلاں فلاں نے عبد الرزاق سے روایت کیا ہے۔ انماطی نے اپنی تحریر میں ابوالموہب مصری کی تحریر کا حوالہ دیا ہے۔
۴۔ مولانا الاعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ ابوالموہب مصری، حافظ تقی الدین انماطی، علامہ علی بن ہبۃ اللہ مصری اور انکے والد ابوالفضائل ہبۃ اللہ سبھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جزء جامع عبد الرزاق کا جزء اول ہے، جامع معمر کا نہیں۔

۵۔ نصر کے نسخہ کے اخیر میں حافظ عبد الغنی مقدسی متوفی ۶۰۰ھ کی ایک سماعت درج ہے کہ امام عبد الرزاق کی جامع کے اس جزء اول کی سماعت شیخ عالمہ شہدہ سے فلاں فلاں راویوں نے کی ہے۔ امام عبد القادر رہاوی نے بھی اس جزء کی شیخ شہدہ سے ۵۶۶ھ میں سماعت کی ہے اور اس جزء کو عبد الرزاق کی جامع کا جزء اول قرار دینے پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

نصر کا نسخہ حافظ احمد بن محمود جوہری تک پہنچتا ہے، انہوں نے اس نسخہ کو ۶۲۳ھ میں ابن الجیمیزی سے پڑھا، ابن جوہری اپنی سماعت کے بارے میں رقمطراز ہیں: "قرأت هذا الجزء الأول من جامع عبد الرزاق..... علی الشیخ الفقیہ المعروف بابن الجیمیزی."

ابن جوہری نے جامع کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ بھی حاصل کیا اور ان کو نقل کر کے جزء اول کے ساتھ ملحق کر دیا اور ان چاروں اجزاء کو مسندۃ الشام کریمہ بنت عبد الوہاب سے پڑھ کر اجازت حاصل کی۔ ابن جوہری نصر بن ابوالفرج کے نسخہ کے آخری صفحہ پر اس مکمل جامع کی سماعت کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ:

"قرأت جميع هذا الجزء الأول وما بعده من الأجزاء"

الأربعة وهو جميع كتاب الجامع لعبد الرزاق بن همام على
الحرّة الأصلية أم الفضل كريمة ابنة عبد الوهاب.

(میں نے اس جزء اول اور اس کے بعد والے اجزاء یعنی چاروں اجزاء
جو عبد الرزاق بن ہمام کی مکمل کتاب الجامع ہے، کی کریمہ بنت
عبد الوہاب کے سامنے قرأت کی۔)

یہ پوری بحث تو ایک نسخہ کی ہوئی، مولانا الاعظمیٰ کی نظر سے جو دوسرا نسخہ گزرا
تھا اسکے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تقی الدین
قلقشنندی کا نسخہ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ انہیں کا مکتوبہ ہے۔ اس مخطوطہ کے بھی پہلے
ورق پر یہ عبارت رقم ہے: "الجزء الاول من كتاب الجامع تالیف الامام
عبد الرزاق بن همام الصنعانی" اس مخطوطہ پر بھی سند درج ہے۔

مولانا نے البعث الاسلامی کے اسی شمارہ میں ذاتی نسخہ میں ضمیمہ کے طور پر
ایک اور دلیل پیش کی جسکو المآثر نے شائع کیا ہے لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر بھی کتاب
الجامع کو جامع عبد الرزاق ہی مانتے ہیں، امام بخاری نے افشاء السلام من
الاسلام کے باب میں حضرت عمارؓ سے ایک موقوف حدیث نقل فرمائی ہے۔ اس
حدیث پر کلام کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: "معمر نے بھی اسکو اپنی جامع
میں موقوف ہی روایت کیا ہے، عبد الرزاق نے اسکو معمر سے اپنی مصنف میں روایت
کیا ہے۔" جب اس حدیث کی تلاش ہوئی تو مصنف عبد الرزاق کے آخری حصہ میں
ملی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حجر بھی اسی کے قائل ہیں کہ اتنا حصہ جامع
عبد الرزاق کا ہے جامع معمر بن راشد کا نہیں۔ ۲

۱۔ البعث الاسلامی عدد ۱۰ ج: ۲۹ ص ۶۶-۷۵

۲۔ المآثر ج: ۱۲ ش: ۳ ص ۸۲

مولانا نے بڑی ہی دقت نظری، وسعت مطالعہ اور مضبوط تحقیقی شواہد کے ساتھ اس پوری بحث کا جائزہ لیا اور اپنے موقف کے سلسلہ میں دلائل کے انبار لگا دیے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس کے جواب میں کوئی مضمون نہیں دیکھا گیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ڈاکٹر حمید اللہ کو مولانا الاعظمی کے ان دلائل نے تحقیقی طور پر مطمئن کر دیا؛ کیونکہ ڈاکٹر حمید اللہ جیسے محقق سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر جو تحقیقی طور پر ناقابل قبول ہو، محض اس لئے خاموش ہو جائیں کہ بحث کو طول نہ دیا جائے۔

مولانا الاعظمی کے پروفیسر عبدالرحمن مومن کے نام ایک خط مکتوبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ، کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو بھی ڈاکٹر حمید اللہ کے جواب کا انتظار تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

”آپ نے البعث الاسلامی والے مضمون کی نسبت ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے بھی نہیں دریافت کی؟“

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے مصنف عبدالرزاق کی دریافت اور تحقیق کر کے حدیث اور تدوین حدیث کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے شک وارتیاب کا سد باب کر دیا۔ اور دنیا کو ایک بار پھر یہ پیغام دیا کہ ہم نے جو کچھ بھی قرآن و حدیث سے سنا محمد اللہ من وعن ویسے ہی محفوظ رکھا جیسا کہ سنا تھا۔ مصنف ابھی زیر طبع ہی تھی کہ مولانا الاعظمی کی ملاقات شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سے حرم شریف میں ہوئی، حضرت شیخ مولانا سے لپٹ کر رونے لگے اور فرمایا کہ آپ نے بہت بڑا کام انجام دیا اور اسلاف کا قرض اتار دیا۔

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۱ ص: ۱۹۷ ح: ۷۶۳- عبد الرزاق عن معمر عن أيوب عن يزيد بن

سفيان الخ

مولانا الاعظمیٰ "سفيان" پر حاشیہ لگا کر لکھتے ہیں کہ اصل نسخہ میں "یزید بن سفيان" کے بجائے "یزید بن فلان" رقم تھا۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ: ۱: ۱۲۲ میں عبد الوارث کے طریق سے "عن أيوب عن يزيد بن سفيان" ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر کتابوں نے کوئی تصرف نہ کیا ہو تو میرے خیال میں "یزید بن سفيان" ابوالمہرم بصری ہیں، جنکا ذکر ابن ابی حاتم وغیرہ نے کیا ہے، ورنہ تو میرے نزدیک صحیح "یزید أبو العلاء" ہے۔ اور وہ یزید ابن عبد اللہ بن اشخیر مطرف کے بھائی ہیں، جن کی کنیت "أبو العلاء" ہے، مطرف سے روایت کرتے ہیں، تہذیب میں ان کا تذکرہ ہے۔

۲- ج: ۲ ص: ۲۸۷- عبد الرزاق عن معمر عن الزهري عن ابن المسيب عن أبي هريرة الخ.

مولانا اس حدیث کی تخریج فرماتے ہیں کہ اسکو مسلم نے ابن عیینہ کے طریق سے عن الزهري عن سعيد و ابن ابراهيم بن سعد کے طریق سے عن الزهري عن سعيد و ابی سلمة (۲۲۰:۱) اور بخاری نے ابن ابی ذئب کے طریق سے عن الزهري عن سعيد و ابی سلمة روایت کیا ہے۔ (فتح: ۲: ۷۹)

۳- اس حدیث میں ایک لفظ "عطاش" آیا ہے۔ اس لفظ کی تشریح مولانا ان الفاظ میں کرتے ہیں: "داء يصيب الانسان فيشرب الماء فلا يروى" یعنی عطاش ایک ایسا مرض ہے جو اگر کسی کو لگ جائے تو پانی پیتا رہے گا لیکن اسے سیرابی نہیں ہوتی اور پیاس نہیں بجھتی۔

۱۔ مصنف عبد الرزاق پر رقم سطور کا مضمون مجلہ معارف (دارالمصنفین) ستمبر ۲۰۰۶ء میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانيہ

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے کلام کی حفاظت کی ضمانت لی ”وَأَنَّا لَنَحَافِظُونَ“، اسی طرح اس پاک کلام کے شارح اپنے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک سے بکھرے ہوئے یا قوت و مرجان کی بھی حفاظت فرمائی۔ اور محدثین عظام کے ذہن و دماغ کو ایسا روشن اور منجلی کر دیا کہ وہ احادیث مبارکہ کی حفاظت کی خاطر نئے نئے طریقے اپناتے اور احادیث کی تدوین مختلف حیثیتوں سے کرتے رہتے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان ہی میں سے ایک طریقہ ”زوائد“ کی ترتیب کا بھی ہے۔

”زوائد“ ان احادیث کو کہتے ہیں جو صحاح ستہ میں نہ ہوں لیکن دوسری کتب حدیث میں موجود ہوں۔ اولاً حافظ نور الدین بیہقی مصری (متوفی ۸۰۷ھ) نے مسند احمد، مسند ابویعلیٰ، مسند بزار اور طبرانی کی معجم کبیر، معجم صغیر اور معجم اوسط کے زوائد کو منتخب فرمایا، اور ان زوائد کو مع انکی اسانید کے ایک جگہ جمع کر دیا۔ بعد میں بیہقی نے اپنے استاذ زین الدین عراقی کی خواہش پر زوائد میں سے اسانید حذف کر دیں۔ اس مجموعہ حدیث کا نام ”مجمع الزوائد و منبع الفوائد“ ہے۔

المطالب العالیہ کی خصوصیات | علامہ بیہقی کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسی طریق پر چلتے ہوئے آٹھ مسانید مکمل: مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمر، مسند مسدد، مسند احمد بن منیع، مسند ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند ابن ابی اسامہ کے زوائد کا انتخاب فرمایا، اسکے ساتھ ساتھ مسند ابویعلیٰ کے ان زوائد کو جو مجمع الزوائد میں آنے سے رہ گئے تھے اور مسند اسحاق بن راہویہ کا جو ناقص نسخہ حافظ ابن حجر

کے پاس تھا اسکے زوائد کو بھی یکجا کیا۔

علامہ ابن حجر کا ارادہ ہوا کہ جتنی بھی احادیث ان کے حصار علم میں ہے، ان کو ایک جگہ جمع کر دیں تاکہ استفادہ آسان ہو، لیکن پھر یہ ارادہ بدل گیا جیسا کہ خود ابن حجر کی تحریر سے واضح ہوتا ہے:

”فرأيت جمع جميع ما وقفت عليه من ذلك في كتاب واحد يسهل الكشف منه على أولى الرغبات، ثم عدلت إلى جمع الأحاديث الزائدة على الكتب المشهورة في الكتب المسندات“

(میرا خیال ہوا کہ وہ تمام احادیث جن سے میں واقف ہوں ایک کتاب میں جمع کر دوں؛ تاکہ اول وہلہ میں ہی استفادہ آسان ہو، پھر میرا ارادہ ہوا کہ مشہور کتابوں کے زوائد جو مسانید میں ہیں انہیں یکجا کر دوں۔)

ابن حجر عسقلانی کے نزدیک کتب مشہورہ سے مراد صحاح ستہ اور مسند احمد ہیں، یعنی جو حدیثیں ان سات کتابوں میں نہیں ہیں اور دوسری مسانید میں ہیں انکو ابن حجر نے جمع کیا۔ دس مسانید (جن میں سے اکثر اب نایاب ہیں) کی احادیث کو ایک مجموعہ حدیث میں یکجا کر کے حافظ ابن حجر نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا۔ اس مجموعہ کی ترتیب فقہی ابواب کی ترتیب پر ہے۔ اس مجموعہ حدیث کو ”المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانيہ“ کا نام دیا گیا۔ اس میں ابن حجر نے کہیں کہیں حدیثوں پر حکم لگا کر ان کا درجہ بھی متعین کیا ہے، اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کہ اس ایک کتاب میں حدیث کی اکثر کتابوں کے زوائد نقل کئے گئے ہیں۔

مخطوطات کی تلاش | اس اہم سرمایہ حدیث، جو کئی مجموعہ ہائے حدیث کا مجموعہ تھا،

کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے اس کے مخطوطات کی تلاش شروع کی۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ اس ذخیرہ حدیث کے ناچید ہو جانے پر، ان مجموعہ ہائے حدیث تک رسائی تقریباً ناممکن ہو جائے گی جو پہلے سے ہی نایاب ہیں۔ مولانا نے ملک و بیرون ملک ”مطالب عالیہ“ کے نسخوں کا پتہ لگایا، لیکن کہیں سراغ نہ لگ سکا۔ کسی طرح سے ۱۹۵۸ء میں مکتبہ سعیدیہ حیدرآباد میں ایک ناقص نسخہ ملا جس میں صرف نصف اول حصہ ہی تھا۔

مولانا نے دسمبر ۱۹۲۶ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ایک مقالہ میں پڑھا تھا کہ اسکا ایک نسخہ مکتبہ محمودیہ مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ جب مولانا کا ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۵ء میں مدینہ کا سفر ہوا اور اس نسخہ کے لئے مکتبہ محمودیہ تشریف لے گئے، تو وہاں کتب خانہ کی فہرست میں اس کتاب کے سامنے مفقود کی علامت ”م“ بنی ہوئی پایا۔ پھر جب شیخ سلطان نمزکانی کو معلوم ہوا کہ مولانا الاعظمی کو مطالب عالیہ کے نسخوں کی تلاش ہے تو انہوں نے ترکی کے دو مخطوطوں کا عکس ارسال کیا، ایک مسندہ (مذکور الاسانید) اور دوسرا مجردہ (مخدوف الاسانید) تھا۔

مسندہ ۱۱۱۱ھ کا نسخہ تھا، مشرقی خط میں ملا محمد بن ملا محمد فرید بن ملا محمد عثمان سلیمان افغانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں ۸۴ صفحات تھے، خط باریک تھا، اغلاط، تصحیفات اور تحریفات سے پر تھا، استفادہ دشوار تھا۔

مجردہ ۱۱۱۲ھ کا نسخہ تھا، اس میں ۲۵ صفحات تھے، مشرقی خط تھا، احمد بن عبد القادر رفاہی کی نسخ ہیں، اس مخطوطہ میں بھی اغلاط و اوہام ہیں مگر یہ نسخہ نسبتاً صاف ہے، دونوں نسخوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ مؤخر الذکر میں اسناد مذکور نہیں۔

تحقیق و تعلیق | اب مسئلہ یہ پیش آیا کہ تحقیق کے لئے دونوں نسخوں میں کس کو اصل قرار دیا جائے: مسندہ یا مجردہ کو؟ چونکہ نسخہ مجردہ ذرا صاف تھا اور شعبہ ”تراث اسلامی“

کویت کا بھی مشورہ تھا، اس لئے مولانا الاعظمی نے نسخہ مجرّدہ کو اصل قرار دیا۔ دونوں نسخوں میں تقابل سخت دشواری کا کام تھا خاص کر ایک نسخہ کا مقابلہ دوسرے ایک ایسے نسخہ سے جسکی تحریر و تصویر واضح نہ ہو۔ مسندہ گنجلک مخطوطہ تھا اس سے مقابلہ جوئے شیر لانے کے مرادف تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

”فاجتهدت فی المقابلة بينها وبين المسندة رغم عسر الافادة منها، فاصلحت الفاسد واستدرکت الساقط ورددت الخطأ إلى الصواب ونهيت على الوهم ما أمكن بالرجوع إلى المصادر الأخرى“۔

(میں نے مجرّدہ کا مقابلہ مسندہ سے کیا، باوجودیکہ مسندہ سے استفادہ آسان نہ تھا، اور جہاں تک ممکن ہوا دوسرے مصادر سے رجوع کر کے منقطعات و اوہام پر تنبیہ، اور اخلاط کی تصحیح کی۔)

مولانا نے مطالب عالیہ کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلے نسخہ مجرّدہ کا کتابت کے جدید رموز و اشارات کے مطابق ایک مبیضہ تیار کیا اور جو اضافے کئے انکو قوسین میں رکھا تا کہ امتیاز رہے، ابتدائاً انتہا ہر حدیث پر نمبر شمار ڈالے گئے۔ موضوع اور نسخہ میں یکسانیت کے سبب حافظ شہاب بوضیری کی کتاب ”مختصر اتحاف السادة المهرة في زوائد المسانيد العشرة“ سے بھی مولانا نے اس کتاب کا مقابلہ کیا، ان دونوں کتابوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو اسے ذکر کیا۔ مخطوطہ کی تنقیح میں بھی اس سے مدد لی گئی ہے۔

احادیث کے درجات کی تعلیم میں مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے گئے:

۱۔ حافظ ابن حجر نے احادیث پر جو جرح کی ہے اور وہ جرح اگر مجرّدہ میں نہیں ہے تو

مسدود سے اس کو نقل کیا گیا۔

- ۲۔ بوسیری نے ”الاتحاف“ میں اس سلسلہ میں جو بحث کی ہے اس کو شامل کیا گیا۔
- ۳۔ یثمی نے ”مجمع الزوائد“ میں حدیث کے صحت و سقم پر جو کلام کیا ہے اس کو نقل کیا گیا۔
- ۴۔ جن احادیث پر محدثین یا ان کے علاوہ کسی نے بھی کوئی کلام نہیں کیا ہے، تو ان احادیث کے موقوف، مرفوع، مرسل یا موصول ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا، اور ان کے راویوں پر اسماء رجال کی کتابوں کے مطابق حکم لگایا گیا، لیکن ہر جگہ اس کا التزام نہیں برتا گیا ہے۔

احادیث کی تحقیق و ترتیب میں کچھ رموز اور مخففات کا بھی سہارا لیا گیا ہے، مثلاً اگر کسی حدیث کے شروع میں (☆) کی علامت بنی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور لائق اعتماد ہے، لیکن اسی کے ساتھ مولانا الاعظمی نے یہ بھی وضاحت کر دی کہ: ”ولیس فقدان الأمانة دالاً على أن الحديث مردود“۔ یعنی جس حدیث پر یہ علامت نہ بنی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قابل اعتماد نہیں، بلکہ (☆) نہ ہونے کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اس حدیث کی مزید تحقیق کر لی جائے۔

حدیث کے آخر میں یہ علامت (=) اگر آپ دیکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کا تعلق آگے آنے والی حدیث سے ہے، چنانچہ اس کا حوالہ دوسری یا تیسری حدیث کے ساتھ ہوگا جب ماخذ ایک ہی ہو۔ کہیں کہیں حافظ ابن حجر کی شرط ملحوظ نہیں رہی ہے اور صحاح ستہ اور مسند احمد میں سے کوئی حدیث آگئی ہے تو اس کی بھی نشاندہی کی گئی۔

مولانا الاعظمی مطالب عالیہ کے سلسلہ میں اپنی خدمات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

”علقت على الكتاب تعليقات وجيزة فسرت فيها غريبه“

واوضحت غامضه وعرفت من رجال الأسانيد من رايت

الضرورة داعية الى التعريف له^۱

(میں نے اس کتاب پر مختصر تعلیقات لکھیں، غریب اور مغلق الفاظ کی

تشریح و توضیح کی اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی رِوَاۃ کا تعارف کرایا۔)

مولانا نے اس کتاب پر ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا، جس میں حافظ ابن حجر کا تذکرہ ہے، اور مخطوطات کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے۔ اور تحقیق میں جو طریقے اختیار کئے گئے ان کی پوری تفصیلات مذکور ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء میں پہلی بار وزارت الاوقاف کویت سے شائع ہوئی۔

مولانا الاعظمیٰ نے مطالب عالیہ کی خدمات کے سلسلہ میں جو طریقے اختیار کئے ہیں، ان سے ان کی دیدہ ریزی، جانفشانی اور علمی صداقت کے ساتھ ساتھ تحقیق کے بلند معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی رقمطراز ہیں:

”یہ تعلیقات..... تاریخی، ادبی، اور فن حدیث و علم اسانید و رجال سے

متعلق معلومات کا بیش بہا گنجینہ ہیں، جس کے باعث کتاب کی افادیت

دوچند ہو گئی ہے، اور جو مولانا کے غزارت علم اور وسعت ودقت نظر کی

شاہد عدل ہیں۔“^۲

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۱ ص ۱۲۶ ح: ۳۶۱- أبو مجلزو قال: قلت لابن عمر وابن عباس.....

اصل نسخہ میں ”لابی عمرو“ تھا، مولانا الاعظمیٰ نے اسکی تغلیط کی اور

”لابی عمرو“ کی جگہ ”لابن عمرو“ تحریر فرمایا اور دلیل میں طبرانی کی روایت پیش کی، اسی طرح ’زوائد‘ ۲: ۱۲۷ کا بھی حوالہ دیا جہاں ابن عمر ہی ہے۔

۲۔ ج: ۱ ص ۲۳۵ ح: ۸۴۹۔ بیہمی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک راوی عبید بن نطاس مولیٰ کثیر بن الصلت ہیں، مجھے ان کا تذکرہ نہیں ملا، البتہ اسکے بقیہ رواۃ ثقہ ہیں۔ مولانا الاعظمیٰ نے بتایا کہ ابن حجر نے تہذیب میں کثیر بن الصلت کا تذکرہ کیا ہے اور ”تقریب“ میں انہوں نے انکو مقبول کہا ہے۔ نسخہ مستندہ میں ”عبد ربہ بن نطاس“ ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے صحیح عبید بن نطاس ہے۔

۳۔ ج: ۴ ص ۶۳ ح: ۳۹۶۹۔ بوسیری نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے کہا کہ اسکے رواۃ ثقہ ہیں۔ بیہمی نے تنبیہ کی کہ اسکے تمام رواۃ ثقہ نہیں ہیں بلکہ اس میں ایک راوی زکریا الاصبہانی ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔ (۱۲۸/۹)

مولانا الاعظمیٰ نے بیہمی کی اس تنبیہ پر تنبیہ کی کہ اس ضعیف راوی کا نام زکریا الاصبہانی نہیں، بلکہ صحیح نام زکریا الصبہانی ہے۔ ازدی نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے، ابن ابی حاتم نے ان کا ذکر کیا ہے لیکن جرح و تعدیل سے خاموش ہیں۔

فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث

زین الدین عراقی (۷۲۵ھ-۸۰۶ھ) ایک بلند پایہ امام حدیث گزرے ہیں۔ اصول حدیث پر انکی ایک گراند قدر کتاب ’الفیۃ الحدیث‘ ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہے۔ اس منظوم کتاب ’الفیۃ الحدیث‘ کی نثری شروحات بھی لکھی گئیں، جن میں مشہور اور قابل ذکر شروح: شرح قاضی زکریا بن محمد انصاری، شرح سیوطی، شرح شیخ ابراہیم بن محمد الحلی، شرح زین الدین العینی، شرح ابی الفداء الکفانی، شرح شیخ قطب الدین الحیضری اور شرح شمس الدین السخاوی ہیں۔

امام سخاوی | محمد بن عبدالرحمن بن محمد شمس الدین سخاوی (۸۳۱ھ-۹۰۲ھ) کو ایک مؤرخ، محدث، مفسر اور ادیب کی حیثیت سے آفاقی شہرت حاصل ہے، مصر کے ایک گھاؤں 'سخا' سے آپ کی اصل ہے، قاہرہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں وفات پائی۔ بے شمار ائمہ فن سے کسب فیض کیا جن کی تعداد چار سو کے عدد کو بھی پار کر جاتی ہے، مختلف ائمہ سے آپ کو افتاء، تدریس اور املاء کی اجازت حاصل ہوئی، حافظ ابن حجر عسقلانی سے سب سے زیادہ وابستہ رہے اور ان سے کثرت سے سماع حدیث کیا۔

فتح المغیث کی خصوصیات | سخاوی نے دو سو کتابیں تصنیف فرمائیں۔^۱ انہیں میں ایک 'الفیۃ الحدیث' کی نثری شرح 'فتح المغیث' ہے۔ شروحات تو بہت لکھی گئی ہیں، لیکن 'فتح المغیث' کی حیثیت ان سب سے منفرد ہے، حافظ سخاوی نے 'فتح المغیث' میں 'الفیۃ الحدیث' کے متن کی تہذیب و ترتیب ایسے انوکھے انداز سے کی ہے کہ اس فن میں اس سے زیادہ جامع اور تحقیقی شرح کا علم نہیں۔^۲ نواب صدیق حسن خاں کے لفظوں میں "شاید کہ اس شرح احسن الشروح ست۔"^۳

'فتح المغیث' ہند و بیرون ہند سے شائع بھی ہو چکی تھی، لیکن کتابت و طباعت میں غلطیاں و سقطات اس قدر تھیں کہ قاری کے لئے اس جیسی اہم ترین کتاب سے استفادہ دشوار تھا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے افادہ و استفادہ کی راہ میں رخنہ ڈالنے والے ان عیوب سے 'فتح المغیث' کو پاک کر کے ایک جدید نسخہ تیار کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اسکے مطبوعہ نسخوں میں تقابل کر کے کتابت و طباعت کی لغزشوں کی تصحیح کی۔ اس

۱۔ الاعلام ۶: ۱۹۳

۲۔ شذرات الذہب ۸: ۱۵

۳۔ الاعلام ۶: ۱۹۳

۴۔ الضوء اللامع ۸: ۱۶

۵۔ اتحاف النبلاء ص ۲۳

کتاب میں مولانا اعظمی کی تعلیقات کہیں کہیں نظر آئیں گی، اس میں تصحیح پر زیادہ زور ہے۔
 مولانا کی اس قابل قدر کاوش سے اغلاط سے پاک 'فتح المصیبت' کے ایک
 جدید نسخہ کی تہذیب و ترتیب عمل میں آئی۔ اس تصحیح شدہ نسخہ کی پہلی جلد کو مطبعۃ الاعظمی
 ممبئی، اعظم گڑھ نے شائع کیا، لیکن افسوس کہ اس کی دو جلدیں اب بھی طباعت
 و اشاعت کا مرحلہ طے نہ کر سکیں؛ طالبین حدیث کے لئے بقیہ حصہ سے استفادہ میں
 اب بھی وہی دشواریاں برقرار ہیں جو اس سے پہلے تھیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا اعظمی کے تصحیح
 کردہ نسخہ کی مکمل طباعت کا مرحلہ طے کرادے! آمین
 تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۱ ص ۱۰۳-..... أو إلى مالك و نحو ذلك.

اصل نسخہ میں "و نحو ذلك" کی جگہ پر "و نحو قلت" رقم تھا۔ مولانا نے
 اسے تحریف قرار دیا اور متن میں اسکی تصحیح کی: "و نحو ذلك" اپنی اس تصحیح کے لئے
 مولانا نے تدریب الراوی کا حوالہ دیا۔

۲- ج: ۱ ص ۱۰۴-..... وشذ الحاکم فاشترط عدم الانقطاع، واختلف
 فیہ هل یسمی خبراً أم لا؟ إلخ.

ہندوستانی نسخہ میں "واختلفہ" اور مصری نسخہ میں "اختلفہ" تھا۔ مولانا
 نے صاف لفظوں میں کہا: "کلاهما تحریف" یعنی دونوں تحریف ہے، تصحیح اور سیاق
 عبارت کا تقاضا "اختلف" ہے، چنانچہ متن میں "اختلف" ہی نقل فرمایا۔

۳- ج: ۱ ص ۳۹۹-..... عن أبي القاسم الأنبدوني إلخ.

مولانا الاعظمی اس پر وضاحتی حاشیہ لگاتے ہیں کہ انبدون جر جان کا ایک گاؤں
 ہے، جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ میں ہے، ذہبی نے اس ابوالقاسم راوی کا تذکرہ کیا ہے،
 سمعانی نے اس نسبت کو نظر انداز کیا ہے اور معلمی نے اس پر کوئی استدراک نہیں کیا ہے۔

تلخیص خواتم جامع الاصول

ابو السعادات مبارک معروف بہ ابن الاثیر جزری (۵۴۳ھ-۶۰۶ھ) کی تصنیفات میں سے ایک مشہور ترین تصنیف ”جامع الاصول من احادیث الرسول“ ہے۔ ابن الاثیر نے اس کتاب میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کیا، غریب الفاظ کی تشریح کی اور مشکلات کو بھی ضبط کیا ہے۔ راویان حدیث کے ناموں اور دوسرے متعلقات فن بھی بیان فرمائے، اس لحاظ سے یہ گویا صحاح ستہ کی شرح ہے۔^۱ اس کتاب کے تین رکن ہیں، پہلا مبادی، دوسرا مقاصد اور تیسرا رکن خواتم ہے۔ پہلا رکن پانچ ابواب پر منقسم ہے۔^۲ اور تیسرا رکن ”خواتم“ تین فنون پر مشتمل ہے، فن اول احادیث مجہولہ کے سلسلہ میں ہے، اس رکن میں صحاح ستہ کے راویوں کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

اس مفصل و مطول مجموعہ حدیث کے انتقاء اور اختصار بھی لکھے گئے، مطبوعات نول کشور کی فہرست میں ”جامع الاصول“ کی دو جلدوں میں تلخیص ”تیسیر الوصول الی احادیث جامع الاصول“ کے نام سے ملتی ہے۔ یہ تلخیص علامہ ابن الدبیج الشیبانی متوفی ۹۴۴ھ نے کی ہے۔^۳

ہندوستان کے مایہ ناز محدث اور قاطع بدعت علامہ محدث محمد طاہر پٹنی، متوفی ۹۸۶ھ جن کا تذکرہ ”مجمع بحار الانوار“ کے ذیل میں آچکا ہے، نے جامع الاصول کے رکن ”خواتم“ کے اس حصہ کی تلخیص کی ہے جس میں صحاح ستہ کے

۱۔ عجلۃ نافعہ ص ۶ شاہ عبدالعزیز

۲۔ جامع الاصول ۱۱:۱ ابن الاثیر جزری

۳۔ تحقیقی مقالات ص ۲۴۲ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

راویوں کا تذکرہ ہے۔ ابن اشیر نے اس حصہ میں صحاح ستہ میں آنے والے اسماء، کنیت، اہناء، القاب اور انساب وغیرہ سے بحث کی ہے۔

طاہر پٹنی نے اس حصہ کا انتقاء اور تکمیل کر کے اس کو مفید سے مفید تر بنا دیا، خاص کر اس طالب علم کے لئے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے جو طوالت سے اکتا جائے اور تفصیل سے گھبرا جائے۔ رجال پر یہ ایک نادر کتاب تھی، لیکن اب تک صرف ذخیرہ مخطوطات کی ہی زینت بنی ہوئی تھی، اس کی طباعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ اہل علم اس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے۔

۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء میں مولانا الاعظمی کا سفر حج ہوا، وہاں مولانا کی ملاقات جناب محمد نور ولی سے ہوئی جو محدث پٹنی کے خاندان کے تھے۔ جناب محمد نور ولی نے مولانا الاعظمی سے طاہر پٹنی کی اس کتاب کا تذکرہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کی تحقیق فرمادیں تاکہ اس کو منظر عام پر لایا جائے۔ مولانا کی بھی دلی خواہش تھی کہ محدث پٹنی کی اس کتاب کی طباعت ہو جاتی تو اسماء رجال پر ایک اور عمدہ کتاب کا اضافہ ہو جاتا! چنانچہ مولانا اس کام کو کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

مخطوطات | وطن واپسی پر مولانا نے اس کتاب کی تحقیق شروع کی، مختلف کتب خانوں سے اسکے نسخے حاصل کئے۔ تحقیق و تعلیق کے وقت مولانا الاعظمی کے سامنے رضا لائبریری رام پور کا نسخہ تھا۔^۱ اس کے علاوہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، دارالعلوم الشیخ محمد عبدالقادر نور ولی ابھی حال ہی میں ۲۱ رذیقہ ۱۴۲۳ھ کو انتقال کر گئے، بہت علم دوست آدمی تھے، مجمع بحار الانوار اور مندرجہ بالا کتاب تلخیص خواتم جامع الاصول اپنے نفقہ پر شائع کرائیں۔ (المآثر ج: ۱۲، ص: ۸۶)

۲۔ اس کتب خانہ کا آغاز رام پور والی ریاست نواب فیض اللہ خاں کی ذاتی لائبریری سے ہوا، نواب رضا علی خاں کی حیات میں جو ۱۳۰۰ء میں حاکم ہوئے تھے، رام پور کی لائبریری کتابوں اور خصوصاً مخطوطے سے پٹ گئی، اس میں تقریباً پندرہ ہزار مخطوطے ہیں جن میں سب سے بڑی تعداد عربی =

ندوة العلماء کی لائبریری اور طاہر پٹنی کے وطن پٹن کے مخطوطے بھی تھے۔ خدا بخش لائبریری سے جزری کی جامع الاصول کے تیسرے رکن "خواتم" کے فن اول اور فن ثانی کے نسخے کا بھی عکس دستیاب ہو گیا تھا۔ اس نسخہ کو آپ نے قیمت حاصل کیا تھا۔

تحقیق و تعلیق | مولانا الاعظمیٰ نے سب سے پہلے خدا بخش لائبریری اور ندوة العلماء کے نسخوں سے جن میں اخلاط کی کثرت تھی ایک پاکیزہ نسخہ تیار کیا، مصادر و مراجع سے رجوع کیا اور بڑی باریک بینی سے تصحیح کی، تصحیح، تشریح یا اسماء سے متعلق تمام امور کو حاشیہ پر درج فرمایا، کچھ اہم علمی نکات کے اضافے بھی کئے۔

مولانا الاعظمیٰ کو جامع الاصول کے اس حصہ سے جو ان کو خدا بخش لائبریری سے دستیاب ہوا تھا کافی مدد ملی۔ اگرچہ اس سے استفادہ آسان نہ تھا کیونکہ اس کے حروف باریک اور کہیں کہیں پر مئے ہوئے تھے۔ مولانا نے اس نسخہ کی اہمیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا:

"لو لم ارجع الیه لم یکن تصحیح الكتاب۔"

(اگر میں اسکی طرف رجوع نہ کرتا تو کتاب کی تصحیح نہ ہو پاتی۔)

مؤلف نے کتاب کے نام کی تصریح نہیں کی تھی کیونکہ بعض کاہنوں نے

اپنے نسخے میں "تم کتاب التوسل" لکھا ہے تو دوسری جانب خدا بخش لائبریری کی ہے یعنی تقریباً چھ ہزار مخطوطات۔ یہاں چمڑے پر لکھا ہوا قرآن کا ایک مخطوطہ ہے، جسکے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت علیؑ کے دست مبارک کا نقل کردہ ہے۔ خط نسخ کا موجد ابن مقلہ بغدادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید بھی محفوظ ہے۔ (کتب خانہ ص ۳۹-۵۱ رضا علی عابدی)

رضا لائبریری کی افادیت اور اسکے خدو خال کے لئے جہاں رضا علی خاں کا نام ضروری ہے، وہیں اردو زبان کے محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام نامی ناگزیر حیثیت رکھتا ہے، احسان ناشناسی ہوگی اگر انکا ذکر نہ کیا جائے۔

۱۔ تلخیص خواتم جامع الاصول (ج)

کے ایک نسخہ میں "ہذہ النسخة في أسماء جامع الصحاح" رقم تھا۔ اب ان دونوں میں کتاب کا اصل نام کیا ہے؟ اسکا فیصلہ کرنا دشوار گزار تھا۔ لیکن آخر کار مولانا الاعظمیٰ نے ہی اس کتاب کا نام بھی تجویز فرمایا، لکھتے ہیں:

"ولعل المؤلف لم يستقر رأيه على اسم يختار ويسميه به كتابه فبقي الكتاب بلا اسم فلا أستحسن أن أسميه من عند نفسي كما لا ينبغي أن أتركه غفلاً فأعنوانه بعنوان "تلخيص خواتم جامع الأصول".

(ممکن ہے کہ اس کتاب کے نام کے انتخاب میں مؤلف کی کوئی رائے قائم نہ ہو سکی ہو اور یہ کتاب یونہی بغیر نام کے رہ گئی ہو، لہذا جس طرح یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اس کتاب کو بغیر نام کے چھوڑ دوں، بالکل اسی طرح یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اپنی طرف سے اسکا کوئی نام رکھ دوں، اس لئے اس کتاب کو تلخیص خواتم جامع الاصول کا عنوان دیتا ہوں۔)

تلخیص خواتم جامع الاصول کی تشخیص و تحقیق میں مولانا الاعظمیٰ کی ان کے صاحبزادے جناب مولانا رشید احمد صاحب نے بھی معاونت کی۔ یہ کتاب علمی پریس اور ہدم پریس مالیکاؤں ناسک سے ۱۳۹۵ھ میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔ لیکن افسوس کہ اسماء الرجال کی اتنی اہم کتاب، کہ ذرا سی ہیر پھیر سے راوی کی حیثیت بدل جائے اور قوی راوی ضعیف ہو جائے، حدیث درجہ ستم سے درجہ صحت پر پہنچ جائے، کی طباعت جس اہتمام سے ہونی چاہئے اس اہتمام سے نہ ہو سکی۔ مولانا الاعظمیٰ نے افلاطون کی فہرست بھی اس میں ملحق کی ہے۔ اس کتاب کی طباعت میں ہوئی لا پرواہی کا عالم یہ ہے کہ ناسٹل پر مؤلف علام کا سن وفات تک صحیح نہیں لکھا ہوا ہے۔ سن وفات

تلخیص خواتم جامع الاصول (د)

۸۸۹ھ درج ہے جبکہ صحیح ۹۸۶ھ ہے۔ اسی طرح اور بھی فحش غلطیاں ہیں۔
تعلیقات کے نمونے:

۱- ص ۳۲-..... و کتب عنه شیخه أبو القاسم الأزري و شیخه أبو بکر الخوارزمي البرقاني..... إلخ.

اصل نسخہ اور عکسی نسخہ میں 'ابو عمرو' تھا، مولانا الاعظمیٰ یہاں چونکے کہ برقانی کی کنیت تو ابو بکر ہے، ان نسخوں میں 'ابو عمرو' کیسے لکھ دیا گیا؟ تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں ابو بکر ہی ہے، اور خود آگے چل کر مؤلف علام بھی برقانی کی کنیت ابو بکر ہی ذکر کرتے ہیں، چنانچہ مولانا نے اس کی تصحیح کی اور 'شیخہ أبو بکر' تحریر فرمایا، اور پھر جب جامع الاصول میں دیکھا تو ویسا ہی پایا جیسا کہ اصلاح کی تھی۔

۲- مولانا نے اس کتاب کے متن میں تشریحی و توضیحی یا تعارفی اضافے بھی کئے ہیں، مثال کے طور پر ص ۷۷ پر ایک جگہ متن میں "هو أبو عبد الرحمن جبیر بن نفیر الحضرمي" آیا ہے۔

مولانا اس پر اضافہ کرتے ہیں (من كبار تابعي أهل الشام، ذكره الطبري في طبقات الفقهاء) یعنی ابو عبد الرحمن جبیر بن نفیر الحضرمی شام کے اجلہ تابعین میں سے ہیں، طبری نے طبقات الفقہاء میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا نے اپنی عبارت کو بین القوسین رکھا ہے تاکہ ان کی عبارت اور متن میں امتیاز و فرق ہو جائے۔

۳- ص ۱۲۸- هو زياد بن أبي الجعد رافع الأشجعي، وهو أخو سالم وعبيد وعبد الله، روى عن وابصة بن معبد وعمرو بن الحارث، روى عنه [ابنه] رافع الخ.

اصل نسخوں میں روى عنه اور رافع کے درمیان کی عبارت مٹئی ہوئی تھی

مولانا الاعظمی نے تہذیب الہندیہ اور جامع الاصول کے حوالہ سے 'روی عنہ' اور 'رافع' کے درمیان [ابنہ] کا اضافہ فرمایا۔ مولانا نے نسخوں کے عیب سے اپنی تحقیق و تعلق پر کوئی آنچ نہ آنے دی، بلکہ دوسرے مراجع سے اس نقص کو دور کیا۔

کشف الاستار عن زوائد البزار علی الکتب الستہ

گزشتہ صفحات میں مطالب عالیہ کے ذیل میں زوائد کی اور اس سلسلہ کی کتب کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ ہم یہاں صرف "کشف الاستار عن زوائد البزار" کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ امام بیہقی نے جن چھ کتب کے زوائد جمع کئے تھے ان میں سے ایک مسند بزار بھی ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ ابو بکر احمد ابن عبد الحلق بزار بصری متوفی ۲۹۲ھ کے تعارف میں دارقطنی فرماتے ہیں کہ:

"كان ثقةً بخطي كثيرًا ويتكل على حفظه." ۱

(بزار ثقہ راوی ہیں البتہ ان سے غلطیاں بھی بہت ہوتی ہیں، انہیں اپنے حافظہ پر اعتماد درہتا ہے۔)

امام بیہقی | نور الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر سلیمان ۳۵۷ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ شیخ زین الدین عراقی کے شاگرد تھے۔ بیہقی شیخ عراقی کے ساتھ چمٹے رہتے تھے جہاں جہاں سماع حدیث کے لئے شیخ عراقی جاتے وہاں وہاں بیہقی بھی جاتے۔ احادیث کے متون کثرت سے یاد کیا کرتے تھے۔ ۲

ابن حجر فرماتے ہیں:

"كان خيراً أساكناً، ليناً، سليم الفطرة شديد الإنكار للمنكر،

۱ کتاب الانساب ۲۳۷:۱

۲ طبقات الحفاظ ص ۵۳۵

کثیر الاحتمال لشیخنا ولا ولادہ محباً للحديث واهله۔“
(پیشگی صاحب خیر، پرسکون، نرم خو، سلیم الطبع، منکرات پر شدت سے نکیر کرنے والے، اپنے شیخ اور ان کی اولاد کے لئے بہت زیادہ صبر اور برداشت سے کام لینے والے، حدیث اور محدثین سے محبت کرنے والے تھے۔)

آپ کے اساتذہ میں شیخ عراقی کے علاوہ خطیب ابوالفتح میدومی، محمد بن اسمعیل، احمد بن محمد بن عبد الرحمن بن عبد البہادی، محمد بن عبد اللہ نعمانی وغیرہ ہیں۔ شاگردوں کی بھی لمبی فہرست ہے، انہیں میں سے ایک ابن حجر جیسے حافظ حدیث اور امام وقت بھی ہیں جو اس سرچشمہ فیضان سے مستفیض ہوئے۔ آپ کی مشہور تصنیفات میں مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ترتیب اشقات لابن حبان، ترتیب البغیہ فی ترتیب احادیث التخلیہ، موارد النظم آن الی زوائد ابن حبان وغیرہ ہیں۔^۱ پیشگی کی تصانیف میں بغیۃ الباحث بزوائد مسند الحارث بھی ہے، اس کا مطبوعہ نسخہ محدث اعظمی لاہوری میں موجود ہے۔ نویں رمضان کی شب کو ۸۰ھ میں امام پیشگی کا انتقال ہوا۔^۲

کشف الاستار کی خصوصیات | ابو بکر بزار کی مسند جس کا نام ”بحر زخار“ تھا، بے انتہا فوائد کا مجموعہ تھی۔ لیکن اتنی مطبوعہ تھی کہ ان فوائد سے استفادہ اور افادہ بہت ہی دشوار تھا۔ پیشگی نے اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے ایک انوکھا طریقہ اپنایا، وہ یہ کہ اس مجموعہ سے ان احادیث کو جمع کرنا شروع کیا جو صحاح ستہ میں نہ تھیں۔ انہوں نے ایک ایک حدیث کی چھان بین کر کے زوائد جمع کئے، اسی کے ساتھ انہوں نے تعلیقات بھی لکھیں، جہاں کہیں بزار نے رواد پر بحث کرتے ہوئے کلام طویل کر دیا

۱۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد ۱۰: ۱

۲۔ الاعلام ۳: ۲۶۶

۳۔ شذرات الذہب ۷: ۷۰

ہے بیشمی نے اسکے مفہوم کو مختصراً اپنے الفاظ میں ذکر کیا۔ اگر کہیں بزار نے مختصر کلام کیا ہے تو اسکو ہو بہو نقل کر دیا ہے۔ بیشمی نے بخاری وغیرہ کی تعلیقات کو بھی ذکر کیا ہے۔

یہ کتاب فقہی ترتیب پر کتاب الایمان سے شروع ہو کر کتاب الزہد پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں ۳۶۹۸ احادیث ہیں۔ زوائد بزار کی تصنیف بیشمی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ انہوں نے ”بحر زخار“ کو اپنی محنت اور مہارت علمی کے بل پر سہل الاستفادہ بنا دیا۔ بیشمی اپنے اس مجموعہ کا کیا نام رکھتے ہیں؟ خود بیان فرماتے ہیں:

”والله أسأل أن ينفع به، إنه قريب مجيب وقد سميت

”كشف الأستار عن زوائد البزار“۔“۱

(اس کتاب کے نافع اور مفید ہونے کے لئے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا

ہوں، بیشک وہ قریب ہے، دعا کو سننے والا ہے۔ میں نے اس کتاب کا نام

”كشف الأستار عن زوائد البزار“ رکھا ہے۔)

مخطوطہ | اب ہم ”كشف الأستار“ کی دریافت اور اسکی تحقیق و تعلق کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کی خدمات کا جائزہ لیں گے۔ مولانا کو اتفاقاً ایک جگہ ”كشف الأستار“ کا ایک نسخہ دیکھنے کو مل گیا۔ مولانا نے اس مخطوطہ کی قدر و قیمت کو بھانپ لیا اور اسے قیمت دے کر حاصل کر لیا۔ اسکا دوسرا نسخہ خدا بخش لاہوری میں ملا لیکن مولانا اس سے استفادہ نہ کر سکے۔۲

پہلا نسخہ جس کی بنیاد پر مولانا نے تحقیق کی تھی، اسکی ایک سے زائد مرتبہ قرأت کی گئی ہے۔ کیونکہ اس پر مختلف لوگوں کے سماع درج ہیں۔ مولانا الاعظمیٰ اس

۱۔ كشف الأستار عن زوائد البزار ۵:۱

۲۔ خدا بخش نام کے ایک صاحب نے ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو اپنا ذاتی کتب خانہ وقف کیا تھا۔ اسکا نام ”اورینٹل پبلک لائبریری“ رکھا گیا۔ لیکن خدا بخش کے نام سے ہی اسے شہرت ملی، اس کتب خانے میں اردو، فارسی اور عربی کے پندرہ ہزار قلمی نسخے ہیں۔ (کتب خانہ ص ۵۶ رضا علی عابدی)

مخطوطہ پر اندراجات کا ذکر کرتے ہوئے حاشیہ پر درج ایک سماع کو نقل کرتے ہیں کہ:

”ثم بلغ الشيخ شمس الدين الحنفي قراءة والجماعة

سماعاً على عثمان بن محمد الديلمي.“^۱

(عثمان بن محمد دیلمی کے سامنے شیخ شمس الدین حنفی کی قرأت پر ایک

جماعت نے سماع کیا۔)

اسی طرح ایک سماع مؤلف یا کاتب کی تقسیم کے مطابق کتاب کے نصف اول کے آخر میں اور ایک سماع کتاب کے بالکل اخیر میں بھی درج ہے۔

یہ مخطوطہ ۱۹ سینٹی میٹر چوڑا اور ۲۶ ½ سینٹی میٹر لمبا تھا۔ ۸۳۶ اوراق تھے، مشرقی خط نسخ میں ایک خوبصورت مخطوطہ تھا۔ زیادہ تر کلمات پر نقطے وغیرہ کا اہتمام رہا گیا تھا، اس نسخہ کی پیشی کے سامنے قرأت بھی کی گئی تھی، گویا یہ ایک تصحیح شدہ نسخہ تھا۔ اس نسخہ کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ نسخہ حافظ ابن حجر کے مطالعہ میں بھی رہا ہے۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں:

”وقد حلّی طررہا فی مواضع عدیدة بنفائس تعلیقاتہ النبی

أغلبہا تعقیبات علی المؤلف الہیثمی رحمہ اللہ.“^۲

(کئی جگہ اس نسخے کے حاشیے کو ان کی (ابن حجر کی) عمدہ تعلیقات، جن

میں زیادہ تر مؤلف ہیثمی پر تعقیبات ہیں، نے زینت بخشی ہے۔)

اس مخطوطہ کو عالم فاضل علی بن احمد بن علی حلبی نے مؤلف کی حیات میں

۸۰ھ میں تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس نسخہ کو تیار کرنے میں اتنی احتیاط برتی تھی کہ

کہیں کوئی اضافہ یا کمی نہ ہونے پائے اصل نسخہ کو من و عن نقل کر دیا۔ یہاں تک کہ

^۱ کشف الاستار جلد اول۔ کلمۃ المحقق

^۲ ایضاً

جن احادیث و ابواب کو پیشی نے کاٹ دیا تھا، انہوں نے بھی ان احادیث و ابواب کو لکھ کر کاٹ دیا۔ اسی طرح سے مؤلف نے متن کی جو عبارت حاشیہ میں لکھی تھی اسے بھی انہوں نے حاشیہ میں ہی رکھا۔ اس با کمال کاتب کے فضل و کمال کا حال یہ تھا کہ بعض مواقع پر الفاظ غریبہ کی تشریح بھی کی اور جہاں وضاحت کی ضرورت تھی وہاں توضیح بھی فرمائی۔

تصحیح و تعلیق | مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے کشف الاستار کی تحقیق و تعلیق میں مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

۱۔ مولانا نے سب سے پہلے حاصل شدہ نسخہ کی اپنے صاحبزادے جناب مولانا رشید احمد الاعظمی سے نقل تیار کرائی۔

۲۔ پھر مولانا نے اپنے عزیز شاگرد مولانا عبدالجبار مٹوی سے مجمع الزوائد میں زوائد بزار کی احادیث کو تلاش کرنے اور جس جس حدیث پر پیشی نے تعلیقات لکھیں یا کلام کیا ہے، ان سب کو نقل کرنے کو کہا۔

۳۔ مولانا الاعظمی نے اول سے آخر تک اس نسخہ کا مطالعہ کیا اور کاتب کی غلطیوں کی نشاندہی فرمائی۔

۴۔ جہاں تشریح و توضیح کی ضرورت تھی وہاں وضاحت کی۔

۵۔ اگر کہیں پیشی کے کلام میں تشنگی رہ گئی ہے تو اس کو مولانا نے دور کیا، اسی طرح اگر کہیں ثولیدگی ہے تو اسکی بھی توضیح فرمائی۔

۶۔ بعض مصنفین کی غلطیوں پر بھی تنبیہ فرمائی گئی ہے۔

۷۔ ابن حجر نے جو تعلیقات لکھی ہیں ان کو بھی اپنی تعلیقات کے ساتھ ہی کتاب میں نقل فرمایا۔

۸۔ پیشی کی فروگزاشتوں کی بھی نشاندہی فرمائی اور بعض مقامات پر مولانا نے ابن حجر

پر بھی نقد کیا۔

مولانا الاعظمی نے اس کتاب میں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے تحقیقی امور انجام دیئے ہیں۔ اسکا اندازہ ان کی تعلیقات کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا ایک بے باک نقاد اور صاحب بصیرت محقق کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ یہ کتاب دو اجزاء میں تھی لیکن ضخیم ہونے کی وجہ سے اسے چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ کشف الاستار چار جلدوں میں موسستہ الرسالہ (دمشق) سے ۱۳۹۹ھ م ۱۹۷۹ء اور ۱۴۰۵ھ م ۱۹۸۵ء کے عرصہ کے درمیان طبع ہو کر شائع ہوئی۔

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۱ ص: ۲۵۷ ح: ۵۲۸- حدیث میں آنے والے مشکل الفاظ کی مولانا الاعظمی تشریح کرتے چلتے ہیں، اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے ”الدندنہ“ مولانا اس لفظ کی توضیح و تشریح فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اس طرح گفتگو کرتا ہے کہ صرف اس کی گنگناہٹ یا بھن بھن کی آواز سنائی دے اور وہ بات سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت کو ”دندنہ“ کہا جاتا ہے۔

۲- کشف الاستار کی تحقیق و تعلیق کے دوران مولانا اعظمی نے مخطوطہ کے پہلے اور آخری ورق کا غلصہ لینے کے لئے ہمارے بھیجا، اس وقت زیر اکس کی سہولت مٹو میں نہ تھی، جب زیر اکس کا پیاں آگئیں تو ان میں سے آخر سے دوسرا صفحہ کاغذات کے انبار میں کہیں دب گیا، اور جب مخطوطہ کے ناقل مخطوطہ نقل کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے تو اس صفحہ کو نہیں پایا، بہت تلاش ہوئی اسکے باوجود وہ صفحہ نہ مل سکا، چنانچہ مولانا اعظمی نے دیا یہ اس صفحہ پر ”.....“ کی علامت لگا کر ذیل میں وضاحتی حاشیہ تحریر فرمایا کہ یہ صفحہ گم ہو گیا ہے! اس لئے اسکی تحقیق نہیں ہو سکی اور پھر آخری صفحہ کی تحقیق کر کے ہاشر کے پاس ارسال فرمادیا۔ لیکن ہاشر نے اس علمی دیانت کا پاس نہ کیا اور اس پر جو حاشیہ تھا اسکو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب شائع کر دی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں جو آخری صفحہ ہے اس سے پہلے کہیں کچھ بھی نہیں چھوٹا ہے، اور کتاب کی تحقیق مکمل ہے۔ راقم الحروف کو یہ تفصیل محدث اعظمی کے صاحبزادے جناب مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی کے توسط سے معلوم ہوئی۔

۲- ج: ۲ ص ۱۲۶ ح: ۱۳۵۷- عن أبي مالك قال: ثنا أبو لبابة الأسلمي أن ناقة له من تلالده..... إلخ.

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے ”تلالد“ مولانا اس کی تشریح کرتے ہیں ”التالد: المال القديم، ضد الطارف، وكذا التلالد“ تالد صیغہ مصفت ہے اس کی ضد طارف ہے اور اسی سے ”تلاذ“ ہے، یعنی خاندان میں قدیم زمانہ سے مال کا ہونا۔

۳- ج: ۲ ص ۵۶ ح: ۱۱۹۵- اس حدیث کے سلسلہ میں بیٹھی فرماتے ہیں کہ اس کو بزار اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے، اس کے سارے راوی ثقہ ہیں (۹:۳) مولانا الاعظمی فرماتے ہیں ”کلا“ یعنی قطعاً نہیں بلکہ اس حدیث میں ایک راوی اسحاق بن محمد الفرووی ہیں جو کہ ثقہ نہیں ہیں اگرچہ بخاری نے ان کی حدیث لی ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ

امام ابو بکر بن ابی شیبہ | عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان، ابو بکر عیسیٰ معروف بہ ابن ابی شیبہ، اہل کوفہ میں سے ہیں، ۵۹ھ میں پیدا ہوئے آپ کی عظمت شان، علمی کمالات کا تمام ائمہ فن، ارباب سیر، تذکرہ نگاروں اور معاصرین نے اعتراف کیا ہے۔ ایک طرف جلیل القدر اساتذہ جلوہ افروز ہیں تو دوسری جانب نامور محدثین عظام کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ہم ان میں سے کچھ حضرات کے اسماء کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں۔

شیوخ میں شریک، ہشیم، ابن المبارک، ابن عیینہ اور غندر وغیرہ ہیں۔
تلامذہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابو زرعة، ابو حاتم اور ابو یعلیٰ جیسے
۱۰۶:۱۰۶

ائمہ فہن ہیں۔ امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے پندرہ سواحدیث کی روایت کی ہے۔

ابو عبید فرماتے ہیں:

”انتهی علم الحديث إلى أربعة أبي بكر بن أبي شيبة وهو
أسردهم له وابن معين وهو أجمعهم له، وابن المديني وهو
أعلمهم به وأحمد بن حنبل وهو أفقههم فيه.“ ۱
(علم حدیث چار آدمیوں پر تمام ہو گیا: ابو بکر بن ابی شیبہ حسن بیان اور
سلیقہ روایت میں، ابن معین کثرت روایت میں، ابن مدینی حدیث کے
صحت و سقم سے واقفیت میں اور احمد بن حنبل حدیث کے اسرار و رموز سے
باخبری میں سب پر فائق تھے۔)

ابوزرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابو بکر بن ابی شیبہ سے بڑا حافظ حدیث نہیں
دیکھا۔ ۲ ابن ناصر الدین فرماتے ہیں کہ: ”كان ثقةً عديم النظير“ ۳ مسجد رصافہ
میں، جہاں آپ بیٹھ کر فرقہ معززہ اور جہمیہ کا رد کرتے تھے لوگوں کا زبردست مجمع ہوتا
تھا جس کی تعداد تقریباً تیس ہزار سے زائد ہو جاتی ہے ۴ محرم الحرام ۲۳۵ھ میں آپ کی
وفات ہوئی۔ ۵

۱ طبقات الحفاظ ص ۱۹۲

۲ تہذیب الذہب ۶:۶

۳ شذرات الذہب ۸۵:۲

۴ سیر اعلام النبلاء ۱۲۵:۱۱

۵ شذرات الذہب ۸۵:۲

۶ تاریخ بغداد ۶۸:۱۰

۷ طبقات الحفاظ ص ۱۹۲

امام ابو بکر بن ابی شیبہ صاحب تصانیف محدث تھے۔ ابن خطیب نے تین کتابوں: مسند، احکام اور التفسیر کا ذکر کیا ہے^۱۔ ابن ندیم نے ان کی تصنیفات میں کتاب السنن فی الفقہ، کتاب التفسیر، کتاب التاريخ، کتاب الفتن، کتاب صفین، کتاب الجمل، کتاب الفتوح اور کتاب المسند کا تذکرہ کیا ہے^۲۔ اگرچہ ابن خطیب اور ابن ندیم دونوں نے ابن ابی شیبہ کی ”مصنف“ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن دوسرے تذکرہ نگاروں نے مصنف کا ذکر کیا ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیات | امام ابو بکر بن ابی شیبہ کی یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس نے انکو شہرت دوام عطا کی، اس کتاب کا شمار حدیث کے اہم مصادر و مراجع میں ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مصنف ابن ابی شیبہ کو تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے^۳۔ اس کی طرز تالیف مصنف عبدالرزاق کی طرح ہے، فقہی ترتیب پر احادیث مرتب کی گئی ہیں۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں مرفوع متصل، مرسل مقطوع اور موقوف احادیث کے علاوہ اس دور میں پیش آنے والے مسائل کے بارے میں تابعین اور اہل علم کے فتاوے اور آراء بھی منقول ہیں جن سے کسی علمی مسئلہ پر اسلاف کی آراء اور ائمہ کے اس مسئلہ کے بارے میں اتفاق و اختلاف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ہر مسلک کے متدلات کو جمع کیا ہے، اہل عراق کے مسلک کو خاص طور پر ذکر کیا ہے، اسی بناء پر اس کتاب میں حنفیہ کے متدلات کثرت سے ہیں۔ انہیں خوبیوں کی بناء پر ابن کثیر ابن ابی شیبہ کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے کرتے ہیں:

۱۔ تاریخ بغداد ۱۰: ۶۷۱

۲۔ التلمیذ ص ۳۷۸ ابن ندیم

۳۔ بحوالہ اللہ البالغہ ۱: ۳۸۹

”ابوبکر بن ابی شیبہ أحد الأعلام وأئمة الإسلام وصاحب
المصنّف الذي لم يصنف أحد مثله قبله ولا بعده.“^۱
(ابوبکر بن ابی شیبہ مشاہیر اور ائمہ اسلام میں سے ایک ہیں اور ایک ایسی
”مصنّف“ کے مرتب ہیں کہ اس جیسی کتاب کسی نے نہیں لکھی، نہ ان سے
پہلے اور نہ ان کے بعد۔)

ابن ابی شیبہ سے مصنّف کی روایت حافظ یحییٰ بن مخلد قرطبی متوفی ۶۷۱ھ نے
کی ہے۔ اور ان سے روایت کرنے والے شیخ صالح حسن بن سعد ابوعلی متوفی ۳۳۱ھ
ہیں۔ بقول علامہ زاہد الکوثری مصنّف ابن ابی شیبہ احکام سے متعلق حدیث کی کتابوں
میں سب سے جامع کتاب ہے۔^۲

اس کتاب میں امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے ایک باب: ”هذا ما خالف به
أبو حنيفة الأثر الذي جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم“ قائم کیا
ہے، اس باب میں جیسا کہ عنوان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے ۱۲۵
مقامات کی نشاندہی کر کے یہ دعویٰ کیا کہ ان جگہوں پر امام ابوحنیفہؒ نے احادیث و آثار
سے ثابت ہونے والے مسائل سے ہٹ کر اپنی علیحدہ رائے قائم کی اور حدیث کو نظر
انداز کیا۔ اس باب کا پہلا مسئلہ جہاں بقول ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہؒ نے الگ رائے
قائم کی ”رجم اليهود واليهودية“ اور آخری مسئلہ ”هل فيما دون خمسة
أوسق صدقة؟“ ہے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ کے اس دعویٰ کے رد میں کئی لوگوں نے لکھا، ان میں قابل
ذکر نام حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی، شیخ محی الدین قریشی، علامہ قاسم بن قطلوبغا

۱۔ البدایہ والنہایہ ۱۰: ۲۲۷ ابن کثیر

۲۔ التلک الطریفہ ص ۳ زاہد الکوثری

کے ہیں۔ بعد کے لوگوں میں مشہور حنفی فقیہ علامہ زاہد الکوثری نے اس جانب توجہ کی، انہوں نے ۲۷۶ صفحات پر مشتمل ایک کتاب تحریر فرمائی، علامہ کوثری نے محققانہ انداز سے اس پوری بحث کا جائزہ لیا اور امام ابو حنیفہ کا دفاع کیا۔ اس کتاب کا نام ہی انہوں نے "النکت الطریفة فی التحدیث عن ردود ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفة" رکھا۔

مخطوطہ | مصنف ابن ابی شیبہ کا نسخہ آٹھ جلدوں میں مکتبہ محمد مراد بخاری معروف بہ مراد ملاستانبول میں (۵۹۳-۶۰۱) نمبر پر موجود ہے۔ مصنف کے نسخے مکتبہ صاحب اللوایہ جھنڈو پاکستان ۲، مکتبہ عمومہ دمشق اور کتب خانہ سعید یہ حیدر آباد دکن ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ۳

مصنف کی اشاعت و طباعت | مصنف ابن ابی شیبہ چودھویں صدی ہجری میں سب سے پہلے ملتان سے شائع ہوئی۔ ابوتراب عبد الوہاب نے اس کتاب کو پندرہ جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اسکی صرف پہلی اور چوتھی جلد ہی زیور طبع سے آراستہ ہو سکی۔ تیسری مرتبہ بمبئی سے مکمل پندرہ جلدوں میں طبع ہوئی، پانچ جلدیں حیدر آبادی نسخے کا عکس لے کر شائع کی گئیں اور بقیہ جلدیں تعلیق و تحقیق کے ساتھ شائع کی گئیں۔

تصحیح و تعلیق | بعض اہل علم حضرات کی خواہش تھی کہ کاش مصنف ابن ابی شیبہ کی جدید تصحیح و تعلیق کے ساتھ از سر نو اشاعت ہو جاتی! کیونکہ بمبئی کی مطبوعہ مصنف ابن ابی شیبہ | النکت الطریفة ص ۷

۱۔ یہ کتب خانہ صوبہ سندھ کے ایک گاؤں پیر جھنڈو شریف میں تھا، یہاں برطانیہ، ترکی اور مصر کے کتب خانوں سے نایاب کتابوں کی نقلیں منگا کر جمع کی گئی تھیں، اب یہ کتب خانہ نیشنل میوزیم کو دے دیا گیا ہے۔ (کتب خانہ ص ۲۵ رضا علی عابدی)

۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۳۰: ۱-۳۱

کی تحقیق و تعلیق کتاب کے شایان شان نہیں ہوئی تھی اور تحقیق سے متعلق تمام امور کا اہتمام کامل طور پر نہیں برتا گیا تھا۔ شیخ عبدالحفیظ ملک عبدالحق مکی بمبئی کی مطبوعہ مصنف کا تذکرہ کرتے ہوئے اسکی تحقیق پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”..... بدون تعلیق او تحقیق جدیر بشأن مثل هذا المصنف

العظیم.....“ ۱

(اس عظیم مصنف کے شایان شان تعلیق یا تحقیق کے بغیر)

بعض علم دوست حضرات کی خواہش تھی کہ مولانا الاعظمی اس کام کو انجام دیں! حسن اتفاق ایسا کہ ۱۳۹۸ھ میں مولانا کا سفر حج ہوا، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے سامنے علامہ مفتی عاشق الہی برنی نے یہ تجویز رکھی اور درخواست کی کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی تحقیق فرمادیں۔ مولانا اس عظیم کتاب کی خدمت سے انکار نہ کر سکے اور بلا تردد اس کام کو منظوری دیتے ہوئے پیرائہ سالی اور ضعف کے باوجود مصنف کی تحقیق کا بیڑا اٹھالیا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”فنهضت به على كبر سني وتراكم العوائق من الأسقام
والأشغال لالاحاح المفتي محمد عاشق النهي البرني ثم
المدني أصالة عن نفسه، وو كالة عن ملك عبد الحفيظ
حفظهما الله.“ ۲

(مفتی محمد عاشق الہی برنی ثم مدنی کے اصالة اور ملک عبدالحفیظ حفظہما اللہ کے وکالة اصرار پر کبر سنی، بیماریوں، مشغولیات اور تمام طرح کی رکاوٹوں کے باوجود میں نے اس کام کو اٹھالیا۔)

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۳: ۱

۲۔ ایضاً ص ۳۳

مولانا نے کتب خانہ سعید یہ حیدر آباد سے مصنف ابن ابی شیبہ کا نسخہ حاصل کیا۔ کویت سے ایک نسخہ استاذ ڈاکٹر عبدالستار ابو غدہ نے مولانا کے پاس ارسال کیا، لبنان اور حیدر آباد سے شائع ہونے والے مطبوعہ نسخے بھی آپ کے سامنے تھے۔ ان چاروں نسخوں کی مدد سے تعلیق و تحقیق کا کام شروع کیا، ان مخطوطوں میں کتب خانہ سعید یہ سے حاصل شدہ مخطوطہ کو بنیادی نسخہ قرار دیا، ابھی مولانا نے کتاب الصلوٰۃ تک کی ہی تحقیق کی تھی کہ اسی اثناء میں پیر جھنڈ و پاکستان کا نسخہ دستیاب ہوا، اس سے بھی انہوں نے استفادہ فرمایا۔

مصنف ابن ابی شیبہ کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

- ۱۔ کتابت و طباعت میں اغلاط کی تصحیح فرمائی اور مصنف کا ایک صحیح کامل نسخہ تیار کیا، اصل نسخہ میں اگر کوئی چیز چھوٹ گئی ہے تو دوسرے نسخوں کی مدد سے اس میں اضافہ کیا۔ اسی طرح سے دوسرے نسخوں میں بھی سقطات کی نشاندہی فرمائی۔
- ۲۔ احادیث کی تخریج کی اور کتب ستہ میں وہ احادیث کہاں آئی ہیں، ان کا حوالہ دیا۔
- ۳۔ غیر معروف راویان حدیث پر کلام کرتے ہوئے ان کے اسماء اور کنیت وغیرہ کو بھی ذکر کیا۔

۴۔ نامائوس اور مغلق الفاظ کی بھی تشریح و توضیح کی۔

۵۔ بعض علمی مباحث اور فقہی مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔

۶۔ مؤلفین کی فروگزاشتوں پر بھی تنبیہ فرمائی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کا یہ کارنامہ مصنف عبدالرزاق کی ہی طرح عظیم الشان کارنامہ ہے۔ مولانا نے اس کی پندرہ جلدوں پر تحقیق و تحشیہ کا کام انجام دیا، مگر افسوس کہ ابھی تک مکمل طور پر طباعت کا مرحلہ طے نہ ہو سکا۔ ان کی حیات

میں اس کی کچھ ہی جلدیں طبع ہو سکی تھیں۔ ابوعلی آصفی کے نام ایک مکتوب میں مولانا الاعظمی لکھتے ہیں کہ:

”مدینہ منورہ سے اسکی تین جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں، باقی کا مسودہ کچھ مدینہ منورہ میں ہے اور کچھ میرے پاس ہے۔“

پروفیسر عبدالرحمن مومن کے نام ایک خط میں مصنف ابن ابی شیبہ کی طباعت کے بابت رقمطراز ہیں:

”مصنف ابن ابی شیبہ کی چار جلدیں طبع ہو کر آگئی ہیں، پانچویں جلد کی نسبت لکھا کہ وہ بھی طبع ہو گئی ہے، مگر میرے پاس ابھی تک نہیں آئی ہے۔“

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی زندگی میں مصنف ابن ابی شیبہ کی صرف پانچ جلدیں ہی طبع ہو سکی تھیں۔ پہلی جلد ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء میں اور تین جلدیں ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۴ء میں طبع ہوئیں۔ اس کے بعد کی جلدیں بھی ناشر کے پاس بھیجی جا چکی ہیں، لیکن افسوس کہ بقیہ جلدیں ابھی تک منظر عام پر نہ آ سکیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ کے تحقیقی امور میں مولانا کے صاحبزادے جناب مولانا رشید احمد الاعظمی نے بھی معاونت کی۔

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج: ۱ ص ۱۹۳ ح: ۱۱۹۷- حدثنا وکیع عن ابراہیم قال: کرہہ ابن سیرین۔ اس حدیث میں بظاہر کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا، لیکن مولانا الاعظمی کی نگہ تحقیق نے اس لغزش کو پکڑ لیا جو سند میں واقع ہوئی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ وکیع نے ابراہیم کو پایا ہی نہیں، ملتان کے نسخہ میں جو

سند مذکور ہے شاید وہی صحیح ہے، وہ سند یہ ہے (حدثنا وکیع عن ربیع قال کرہہ ابن سیرین) چنانچہ یہاں ابراہیم کا ذکر کرنا ایک بھول ہے۔

۲- ج: ۲ ص ۲۹۶ ح: ۳۵۷۷- بخاری نے اس حدیث کو شعبہ عن محارب کے طریق سے ذکر کیا ہے، اور پھر کہا کہ سعید بن مسروق نے اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متابعت کی ہے، ابن حجر فرماتے ہیں کہ سعید بن مسروق کی متابعت کو ابو عوانہ نے موصولاً ذکر کیا ہے۔

مولانا الاعظمیٰ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر حافظ ابن حجر کو ذہول ہو گیا کہ مصنف (ابن ابی شیبہ) نے بھی اس حدیث کو موصولاً ذکر کیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ابن ابی شیبہ کا حوالہ ضرور دیتے کیونکہ وہ ابو عوانہ سے جلیل القدر اور بلند مرتبہ امام حدیث ہیں۔

۳- ج: ۳ ص ۹۴ ح: ۴۹۹۲- حدثنا عفان قال: أنا همام عن قتادة عن الحسن عن سمرة الخ.

مکتبہ سعید یہ حیدرآباد کے نسخہ میں اسناد میں (عن سمرة) پہلے اور (عن الحسن) بعد میں تھا، یعنی قتادہ نے سمرة سے اور سمرة نے حسن سے روایت کی، گویا یہ ایک طرح کی تحریف تھی۔

مولانا الاعظمیٰ نے اسکی تصحیح کی (عن قتادة عن الحسن عن سمرة) پیر جھنڈ و پاکستان کے نسخہ میں یہ سند صحیح مذکور تھی۔

حياة الصحابة

’حياة الصحابة‘ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی ایک بہت مقبول و معروف تصنیف ہے، مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی نے اس کی تحقیق کی اور تعلیقات وغیرہ لکھی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے بھی اس پر تحقیقی کام کئے ہیں۔ مولانا اعظمی نے حیات الصحابة میں جن تحقیقی امور کو انجام دیا ہے، مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی ان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

”التعليقات القيمة للشيخ الجليل حبيب الرحمن

الأعظمي: وقد عني الشيخ بتحقيق نصوصه والتعليق عليه

وتبيين معني غريبه والتحقيق بأسماء رجاله والتصحيح

لألفاظه المصحفة، وقد قام بتحقيق جميع النصوص

والتعليقات الأخرى على هذا الكتاب أيضاً، بإعان النظر

من أولها إلى آخرها حرفاً حرفاً، وقد تفضل ببذل جهوده

البالغة في هذا العمل لوجه الله تعالى مع كبر سنه وكثرة

مشاغله..... جزاه الله أحسن الجزاء وأطال بقائه ونفع

جميع الأمة بعلومه.“

(شیخ محدث جلیل حبیب الرحمن الاعظمی کی بیش قیمت تعلیقات: شیخ نے اس کے (حیۃ الصحابہ کے) نصوص کی تحقیق کی، تعلیقات لکھیں، غریب الفاظ کے معانی بیان کئے، اس کے اسماء رجال کی تحقیق کی اور جن الفاظ میں تصحیف ہو گئی تھی ان کی تصحیح کی، اس کے تمام نصوص کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کتاب پر دوسری تعلیقات کی بھی شروع سے آخر تک ایک ایک حرف کی دقت نظر کے ساتھ تحقیق کی ہے، یہ ان کی کرم فرمائی ہے کہ پیرانہ سالی اور کثرت مشاغل کے باوجود اللہ کی رضا کے لئے انہوں نے اس کام میں بے پناہ کوششیں صرف کیں۔ اللہ انہیں بہترین جزاء عطا فرمائے، ان کے سایہ کو باقی رکھے اور ان کے علوم سے تمام امت کو نفع پہونچائے۔)

اس کتاب پر مولانا اعظمی کی تعلیقات اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ مولانا کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ حیۃ الصحابہ کا یہ ایڈیشن ملت پریس دودھ پور علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا۔

استدراکات

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی جب بھی کسی تحقیق، تصنیف، کتاب یا کسی مضمون کا مطالعہ فرماتے تو دوران مطالعہ ان کا تحقیقی تجزیہ بھی کرتے چلتے، کتابوں کے اوراق پر سرسری نگاہ ڈالنا ان کی عادت نہ تھی، جہاں بھی انہیں محقق یا مصنف کی بات سے اتفاق نہیں ہوتا یا پھر کہیں تشریح و توضیح میں کوئی تشنگی رہ گئی ہو، تو مولانا وہیں رک کر کتاب پر حاشیہ لکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی ذاتی کتابوں اور رسالوں پر ان کی تحریریں کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہیں، جن کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ محققین یا مؤلفین، جن کو مولانا کی تحقیقی صلاحیت کا اندازہ بخوبی تھا، اپنی کتابیں نظر ثانی کے لئے مولانا کے پاس ارسال کرتے۔ مولانا جہاں تصحیح کی ضرورت محسوس کرتے وہاں تصحیح کر دیتے یا فروگزاشتوں کی نشاندہی فرمادیتے۔ مولانا کے استدراکات کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ نامور محققین نے ان استدراکات کو جگہ جگہ اپنی کتابوں میں تحسین اور شکریہ کے الفاظ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قلمی مسودات میں محفوظ، کتابوں میں درج، کاغذوں میں بکھرے ہوئے یہ جواہر پارے آہستہ آہستہ مجلہ ”الماثر“ کے واسطے سے ڈاکٹر مسعود احمد کی جمع و ترتیب کے ساتھ منظر عام پر لائے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعزیز مطر کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ سے چھپنے والی ابو حفص عمر بن خلف بن نمی کی کتاب ”تقیف اللسان و تنقیح الجنان“، تہذیب التہذیب - ابن حجر مطبوعہ حیدرآباد، شرح ترمذی تحفۃ الاحوذی - عبدالرحمن مبارکپوری، ”تجلیل المنفعة“ حافظ ابن حجر مطبوعہ حیدرآباد، ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہونے والی امام بخاری کے استاذ ابوالحسن علی بن عبد اللہ بن جعفر کی

تصنیف ”العلل“، شیخ ابو غندہ کی تحقیق کے ساتھ شائع ہونے والی علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب ”الرفع والکامل“، شیخ مرتضیٰ زبیدی بلکرامی کی مشہور کتاب ”تاج العروس من جواهر القاموس“، مطبوعہ کویت، شیخ ابو غندہ کی تحقیق سے شائع ہونے والی علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب ”الاجوبۃ الفاضلۃ للأسئله العشرۃ الکاملۃ“ جیسی اہم ترین تصنیفات و تالیفات پر جواہل علم کے لئے مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا اعظمی نے استدراکات اور حاشے تحریر کئے۔

مولانا کے ان استدراکات کو جو شرح مسند احمد پر ہیں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اسی طرح سے ”الالبانی شذوذہ و اخطاؤہ“ جو مولانا کی ایک مستقل تصنیف ہے، شیخ البانی کی گرفت اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی وجہ سے کافی مقبول ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ استدراکات و حواشی اس قدر ہیں کہ ان کا احصاء و احاطہ اس محدود الصفحات مقالہ میں ممکن نظر نہیں آتا اور ان سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھنا مقالہ کے نقص کو مشیر ہوگا، اس لئے اب ہم کچھ کتابوں سے مولانا کے چند استدراکات کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

شرح مسند امام احمد بن حنبل

حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴ھ - ۲۴۱ھ) ایسے جلیل القدر محدث، فقیہ اور امام ہیں جنکی عظمت اور جلالت علمی کے سامنے دنیا سرنگوں ہے۔ آپ کی وہ حیثیت ہے کہ اگر اسلامی تاریخ میں آپ کے کارناموں کا تذکرہ جلی حروف میں نہ ہو تو اسے استدراک علیہ القول: اصلح خطاہ، أو اکمل نقصہ، أو ازال عنه لہسا (المعجم الوسیط) یعنی استدراک کے معنی خطا کی اصلاح، کمی کو پورا کرنے، یا اشتباہ کے ازالہ کے ہیں۔

ناکمل اور ناقابل اعتبار تصور کیا جائے گا۔ کچھ ایسا ہی حال آپ کی تصنیف "مسند" بھی ہے، جو مسانید میں سب سے مشہور اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔

امام احمد بن حنبل نے ۲۰۰ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں مسند کی تصنیف شروع کی تھی۔ مسند میں تیس ہزار احادیث ہیں، تقریباً ایک سو ستر صحابہ کی روایات اس میں ہیں۔ ابن اثیر کے بقول کثرت اور حسن روایت میں مسند امام احمد بن حنبل کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل کو اپنی اس مسند کی جامعیت پر اس قدر اعتماد تھا کہ آپ نے فرمایا کہ جب بھی مسلمانوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔

مسند امام احمد بن حنبل پہلی مرتبہ ۱۳۱۳ھ میں مصر سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔ ۱۳۶۵ھ میں دوسری بار بھی اسکی طباعت مصر سے ہوئی۔ اس بار یہ کتاب مصر کے مشہور زمانہ محدث شیخ احمد محمد شاہ کی تحقیق و تعلیق سے مزین تھی۔ شیخ نے مسند کی احادیث کی تشریح، الفاظ کی توضیح اور رجال پر کلام کیا ہے۔ استفادہ کو مزید آسان بنانے کے لئے چھ طرح کی فہرستیں علیحدہ علیحدہ مرتب کیں، ان میں ایک بخاری کے طرز پر ابواب کی ترتیب کے مطابق احادیث کی فہرست بھی ہے۔ اس طرح علامہ احمد محمد شاہ نے اپنی قابل قدر کوششوں سے حدیث کی عظیم خدمت انجام دی، اللہ تعالیٰ انکی قبر کو نور سے نغمہ دے! آمین۔

شیخ شاہر جب مسند احمد کی تحقیق میں مصروف تھے اور مسند کی کچھ جلدیں منظر

۱۔ مسند احمد ۶۰:۱ (مطبوعہ بیروت)

۲۔ طبقات الشافعیہ ۲۶۹:۱

۳۔ تدریب الراوی ص ۱۳۹

۴۔ طبقات الشافعیہ ۲۶۸:۱

۵۔ اسکے جملہ مصارف حیدرآباد کے نواب میر محبوب علی خان نے ادا کئے۔ (ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۲۱)

عام پر بھی آپچی تھیں، تو انکے وفور علم نے انہیں انکی اپنی ہی فروگزاشتوں پر متنب کیا اور انکی اصلاح کی جانب توجہ مرکوز کرائی۔ چنانچہ علامہ نے مسند احمد کی تیسری جلد میں "الاستدراک والتعقیب" کا عنوان قائم کر کے اسکے تحت پچھلی دو جلدوں میں جو کمیاں رہ گئی تھیں انکی اصلاح کی اور استدراکات لکھے۔

علامہ شا کرنے اسی پراکتفاء نہیں کیا، بلکہ انکی بلند ہمتی و عالی ظرفی نے انہیں مجبور کیا کہ پوری دنیا کو اپنی اس تحقیق و تعلیق میں نقص و کمی کی تلاش کی دعوت دیں۔ یہ دعوت خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"ثم اني اتوقع أن يعني اخواني علماء الحديث في أقطار

الأرض بأن يرسلوا لي كل ما يجدون من ملاحظة أو

استدراک أو تعقیب، أو بحث في احادیث المسند."

(اطراف عالم کے علماء حدیث سے امید کرتا ہوں کہ مسند کی احادیث کی

تحقیق کے سلسلہ میں اگر کہیں کوئی استدراک، تعقیب، یا لغزش پائیں

میں تو انہیں میرے پاس ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔)

دوسری جانب جب مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، جنہیں حدیث کی کتابوں کا شوق رہتا تھا، کو احمد شاہ کی تحقیق کردہ مسند کا علم ہوا تو مولانا نے اسے حاصل کر کے اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق مطالعہ شروع کیا، جوں جوں مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا، ویسے ویسے شارح کی فروگزاشتیں مولانا کے سامنے ابھر کر آنے لگیں۔ مولانا نے ایک ڈائری بنائی اور اس میں ان استدراکات اور ملاحظات کو نوٹ کرنا شروع کیا۔ لیکن مولانا پس و پیش میں رہے کہ ان استدراکات کے بارے میں شیخ کو مطلع کریں کہ نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیخ برا مان جائیں۔ لیکن جب تیسری جلد میں شیخ احمد شاہ کی

دعوت استدراک پر نظر پڑی تو مولانا نے اسی وقت ان جمع کردہ استدراکات کو ارسال کرنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ یہ استدراکات شیخ کے پاس مصر بھیج دیئے گئے۔

علامہ شا کر تک جب یہ استدراکات پہنچے تو گویا منہ مانگی مراد پوری ہو گئی۔ ان ملاحظیات وغیرہ کو انہوں نے آنکھوں سے لگایا اور مسند احمد کی پندرہویں جلد میں انہیں شائع کر کے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ علم و تحقیق اور فضل میں عرب و عجم، انیس واسود اور قرب و بعد کی کوئی حیثیت نہیں، جو صاحب فضل ہے چاہے دنیا کے کسی گوشہ میں ہو، صاحب فضل ہی رہے گا۔ شیخ احمد محمد شا کر ان استدراکات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”..... ثم جاءني كتاب من اخ عالم كريم، لم يكن لي شرف معرفته من قبل، وقد عرفت من كتابه فضله وعلمه وتحققه بالبحث الدقيق. و كتابه هذا مؤرخ ٢٦ ذي القعدة سنة ١٣٤٥. وطواه على استدراكات وتعقبات دقيقة، من الجزء الأول الى الجزء الثامن وهذا الاخ العلامة هو الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي خدام الحديث..... وفاء بو عدي وسروراً بما جاء في أبحاثه الدقيقة سأثبت نص كلامه في الاستدراك بالحرف الواحد“

(پھر میرے پاس ایک معزز عالم کا خط آیا اس سے پہلے مجھے ان سے شرف تعارف حاصل نہ تھا، اور اب مجھے ان کے خط سے ان کے فضل، علم اور دقیق بحثوں میں ان کی تحقیق کا اندازہ ہو گیا ہے۔ یہ خط مؤرخہ ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس خط میں مسند احمد کی جلد اول سے جلد آٹھ تک

استدراکات اور تعقیبات ہیں۔ اور یہ بھائی علامہ استاذ حبیب الرحمن
الاعظمی خادم حدیث ہیں، اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے اور اس لئے بھی
کہ مجھے ان کی دقیق بحثوں سے مسرت اور خوشی ہوئی، میں ان
استدراکات کو حرف بہ حرف شائع کروں گا۔

شیخ شاکر نے مولانا الاعظمی کو شکریہ کا خط بھی لکھا تھا، جس کو انشاء اللہ آئندہ
کسی مناسب موقع پر نقل کیا جائے گا۔ مسند احمد جلد اول سے جلد آٹھ تک مولانا الاعظمی
کے شائع ہونے والے استدراکات کی تعداد ۳۹ ہے۔ مولانا نے ان استدراکات
وملاحظات کو پانچ حصوں میں منقسم کیا تھا۔

۱۔ متن اور اسناد کی تصحیح سے متعلق۔

۲۔ رواۃ حدیث سے متعلق۔

۳۔ احادیث کی تشریح اور الفاظ کی توضیح سے متعلق۔

۴۔ حدیث کی تخریج سے متعلق جہاں شارح نے ”لم اجد“ کہہ دیا ہے۔

۵۔ کتابت و طباعت کی غلطی پر تنبیہ۔

شیخ شاکر نے مولانا الاعظمی سے مسند کی تحقیق میں مزید نظر نقد ڈالنے کی
فرمائش کی اور جو کچھ استدراکات ہوں پھر ان کو ارسال کرنے کی درخواست کی۔
چنانچہ مولانا نے استدراکات کی مزید ایک قسط ارسال کی۔ مولانا لکھتے ہیں:

”فأرسلت إليه ثانياً ما بدا لي اثناء المطالعة..... وهو ضعف

ما أرسلت إليه أولاً“۔

(مطالعہ کے دوران جو بھی استدراکات میرے سامنے آئے، میں نے

انہیں دوبارہ علامہ شاکر کے پاس بھیج دیا، یہ استدراکات پہلی مرتبہ بھیجے

جانے والے استدراکات کے دو گنا ہیں۔)

دوسری قسط میں ۲۴ استدراکات تھے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۳۷۱ھ میں شیخ احمد محمد شاہ دارفانی سے دار بقاء کو کوچ کر گئے۔ چنانچہ یہ استدراکات جو شیخ کو ان کی زندگی میں ہی بھیج دیئے گئے تھے، اہل علم حضرات کے اصرار پر اور علم و تحقیق کی امانت کے مد نظر "البعث الاسلامی" جنوری ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں شائع کئے گئے۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے قلمی مسودات میں مسند احمد پر استدراکات کی ایک تیسری قسط بھی دریافت ہوئی، جو مولانا اعجاز احمد اعظمی کی جمع و ترتیب کے ساتھ شائع ہوئی۔ ۱۱۸ استدراکات پر مشتمل یہ آخری قسط المآثر جلد ۲، شمارہ نمبر ۱ میں شائع ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے استدراکات اور ملاحظات کے چند نمونے پیش خدمت ہیں:-

۱۔ مسند احمد ج: ۶: ۲۲۰- اس حدیث میں ایک لفظ "مغیب" آیا ہے۔ اس پر مولانا الاعظمی نے لکھا کہ اگر شارح تشریح فرمادیتے کہ جس عورت کا شوہر غائب ہو جائے اسے "مغیب" اور "مغیبة" کہا جاتا ہے تو بہت بہتر ہوتا۔ مولانا کی اس بات پر شیخ شاہ کرنے نوٹ لگایا "هذا صواب مند و تنبيه مفيد" (۲) (یہ صحیح اور مفید تنبیہ ہے۔)

۱۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے جو استدراکات اصل مسودہ سے ترتیب دیئے ہیں، ان میں اور البعث میں شائع ہونے والے استدراکات میں باہم کہیں کہیں اشتراک ہے۔ اسی طرح مسند کی پندرہویں جلد میں جو استدراکات درج ہیں، البعث الاسلامی میں دوبارہ ایک دو جگہ انکا ذکر آ گیا ہے۔ اس لئے پیچھے دیئے ہوئے استدراکات کے اعداد و شمار کے مطابق جو تعداد ۷۸ کو پہنچ رہی تھی اب وہ اتنی نہ رہی بلکہ ۷۸ سے کم ہو گئی۔

۲۔ مسند احمد ج: ۱۲۰۶۔ حدیث کے متن میں ”ثم انی رأیت أبی“ آیا ہے۔ اس پر مولانا نے تنبیہ کی کہ یہاں ”أبی“ کے بجائے ”أنی“ ہے اور درست عبارت ”ثم انی رأیت أبی“ ہے۔

۳۔ مسند احمد جلد: ۱ ص ۵۵ س ۱۲ میں ”أبو الفضل محمد بن محمد بن فہر“ ہے۔ مولانا الاعظمی نے اس پر ریمارک لگایا کہ ”فہر“ صحیح نہیں ہے بلکہ ”فہد“ وال مہملہ کے ساتھ صحیح ہے۔

۴۔ مسند احمد جلد: ۵ ص ۲۹۳، میں شارح نے لفظ دربان کی تشریح ایک قسم کے کپڑے سے کی۔ مولانا نے ان کا تعاقب کیا اور لکھا کہ ”دربان“ فارسی کا لفظ ہے، اسکے عربی معنی ”حاجب“ اور ”بواب“ کے ہیں۔ آگے چل کر مولانا نے اس پورے جملہ کی تشریح بھی کی جہاں یہ لفظ آیا تھا۔^۱

۵۔ مسند احمد جلد: ۵ ص ۲۰۳، میں سونے کی انگلی پینے کی کراہت کے بارے میں ابو کنود کی حدیث کے سلسلہ میں شارح فرماتے ہیں کہ مسند کے علاوہ یہ حدیث ان کو نہیں ملی۔

مولانا الاعظمی نے ان کی اس بات پر نقد کیا اور لکھا کہ طیالسی نے اس حدیث کو ایسی سند کے حوالہ سے ذکر کیا ہے جس میں انقطاع نہیں ہے۔ امام احمد نے ”عن غندر عن شعبۃ“ روایت کیا ہے اور طیالسی نے خود شعبہ سے براہ راست روایت کی ہے۔^۲

نمونے کے طور پر یہ چند مثالیں پیش کی گئیں۔ مولانا نے کافی طویل استدراکات و ملاحظیات بھی تحریر فرمائے ہیں، جن کو یہاں نقل کرنا مقالہ کی ضخامت

وطوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے مختصر ترین استدراکات پر ہی اکتفاء کیا گیا۔ شیخ احمد محمد شاكر نے جگہ جگہ آپ کے نوٹ اور ریمارکس کی ”صواب“، ”توجیہ جیدہ“، ”تحقیق جیدہ“، ”تحقیق بدیع ممتاز“ وغیرہ کے الفاظ میں تحسین فرمائی۔

مولانا کے ان استدراکات نے علمی دنیا میں اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے محدثین و محققین کے درمیان دھوم مچا دی تھی۔ یہ استدراکات آپ کا تعارف اور شناخت بن گئے تھے! وہی محدث جس نے احمد شاكر پر استدراکات لکھے تھے، وہی ہندی عالم جس نے احمد شاكر کی گرفت کی تھی، وہی شخص جس نے مسند کی طباعت کے کئی برس بعد اس کی تحقیق میں فروگزاشتوں پر تنبیہ کی تھی! یہی تھے وہ انداز جو اس دور میں مولانا اعظمی کی تعریف و تعارف میں اپنائے جاتے تھے۔

کچھ اسی طرح کے انداز میں شیخ ابونعیم مولانا الاعظمی کا تعارف کراتے ہیں:

”..... العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقیقاته واستدراکاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد محمد شاكر رحمه الله تعالى في تحقیقه لكتاب ”مسند أحمد“۔“

(علامہ کبیر، محقق، محدث، مولانا شیخ حبیب الرحمن الاعظمی، جن کو شام، مصر، مغرب وغیرہ ممالک کے علماء نے انکی تحقیقات اور ”مسند احمد“ کی تحقیق میں علامہ شیخ احمد محمد شاكر پر ان کے قیمتی اور نادر استدراکات کے حوالہ سے جانا۔)

الاکبانی شذوذہ و اخطاؤہ

شیخ ناصر الدین البانی علمی حلقوں میں ایک معروف نام ہے خاص طور سے
فن حدیث میں ایک بے باک و متجاوز نقاد کی حیثیت سے آپ کا تعارف ہے۔ شیخ
البانی مدینہ یونیورسٹی میں استاذ حدیث تھے، حدیث کے میدان میں آپ نے وسعت
مطالعہ اور نقد و نظر کے سہارے اہم کارنامے انجام دیے۔

چونکہ طبیعت میں حدت کا عنصر غالب تھا، اور اپنی بات کہنے میں بغیر کسی لحاظ
کے جری اور بے باک واقع ہوئے تھے، اس لئے بسا اوقات حدیث صحیح کی بھی تضعیف
کر دیتے اور ضعیف کو موضوع کہہ دیتے۔ اور اس سلسلہ میں اتنا آگے چلے جاتے کہ
ائمہ محققین جیسے ابن عبد البر، ابن حزم، ابن تیمیہ، ذہبی، ابن قیم اور ابن حجر وغیرہ تک کی
تخلیط فرما دیتے اور ان سے بھی آگے بڑھ کر بخاری و مسلم میں بھی اوہا کی نشاندہی فرماتے!
اپنے اس انداز تحقیق و نقد پر ان کو اس قدر اعتماد تھا کہ اپنی تحقیق کے بارے
میں کبھی یہ بھی فرماتے:

”اغتنم هذا التحقيق فانك لا تجده في غير هذا الموضع“^۱

(اس تحقیق کو غنیمت جانو دوسری جگہ نہیں پاؤ گے۔)

شاید اسی وجہ سے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ ان کی توصیف ان
الفاظ میں فرماتے ہیں:

”وبذلك وصل إلى ما لم يصل إليه غيره من المحققين

السابقين ولا اللاحقين.“^۲

۱۔ الاکبانی شذوذہ و اخطاؤہ ۹:۱

۲۔ ایضاً

(اور اس سلسلہ میں وہ اس حد تک پہنچ گئے کہ ان کے علاوہ پہلے اور بعد کے محققین وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔)

مولانا الاعظمیٰ نے چار اجزاء میں ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ”الالبانی شذوذہ واخطاؤہ“ کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی۔ ڈاکٹر مسعود احمد اس کتاب کا پس منظر بیان فرماتے ہیں کہ شیخ البانی نے جب علامہ اعظمیٰ سے ملاقات کی تو خواہش ظاہر کی کہ علامہ اعظمیٰ ان کی کتابیں پڑھ کر اپنی رائے لکھیں۔ چنانچہ زبیر شاویش (اپنی کتابوں کے ناشر) سے کہہ کر کتابیں منجھوائیں جس کے نتیجہ میں ”الالبانی شذوذہ واخطاؤہ“ معرض وجود میں آئی۔

مولانا نے حدیث کی تحقیق میں شیخ البانی کی تجدید پسندی، ان کی تحقیق و تدقیق میں جدت طراز یوں اور غلطیوں کی طرف اس کتاب میں نشاندہی فرمائی ہے۔ مولانا نے کئی جگہوں پر خود البانی کے اقوال میں اضطراب و اختلاف کا ذکر کر کے شیخ کے ہی وضع کردہ اصول سے ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اس رسالہ میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مولانا نے شیخ البانی پر اعتراضات و استدراکات لکھے ہیں:

- (۱) مبلغ علم الالبانی (۲) ولوع الالبانی بنقص کلام ابن تیمیہ (۳) مناقضات (۴) تحریم الصورة التي توطأ (۵) هل خاتم الذهب محرم علی النساء (۶) خرق الإجماع (۷) اختلاف العلماء (۸) ستر المرأة (۹) السفر لزيارة القبر النبوي ﷺ (۱۰) تطبیق الالبانی ذم المعتزلة علی ذم أتباع الأئمة (۱۱) القراض الاجتهاد۔

ان کے علاوہ ذیلی عنوانات بھی قائم کئے گئے ہیں۔

”الالبانی شذوذہ واخطاؤہ“ سے بطور نمونہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

ہا کہ تحقیق میں مولانا کی عقابى نگاہ کا اندازہ ہو سکے :-

۱۔ البانی اپنی کتاب ^{لصحیحہ} ۱۶۱:۲ میں "تصدق باثوار من الاقط" میں "اثوار" کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہ "نور" کی جمع ہے جسکے معنی پیتل کے برتن کے ہیں۔
مولانا ^{عظمیٰ} فرماتے ہیں درست "باثوار من الاقط" ہے۔ "اثوار" "نور" کی جمع ہے، جسکے معنی پیر کے ایک ٹکڑے کے ہیں، جیسا کہ النہایہ: ۱۶۳ میں ہے۔ چنانچہ حدیث کا مطلب ہوگا پیر کے چند ٹکڑے صدقہ کئے۔

۲۔ البانی صحیحہ ۱۸۸:۳ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "هذا تحقیق استفدناہ من تحقیقات الأئمة" یعنی ہماری یہ تحقیق براہ راست ائمہ کی تحقیق سے مستفاد ہے۔
مولانا ^{عظمیٰ} ریمارک لگاتے ہیں کہ ایسا وہی کہہ سکتا ہے جس کا دائرہ علم محدود ہوگا، کیونکہ ان سے پہلے یہ تحقیق محدث الہند شیخ نیموی اپنی کتاب "العلق الحسن" میں پیش کر چکے ہیں۔ ابواب المیاء حدیث وقوع الزنجی فی زمزم ملاحظہ ہو۔

۳۔ البانی فرماتے ہیں کہ حدیث اگر "زوی" یا "یروی" یا "یذکر" مجہول کے معنی سے روایت کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث یقیناً ضعیف ہے۔
مولانا ^{عظمیٰ} البانی کے اس قاعدہ کلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہل هذا إلا زعم فاسد واعتقاد ظاہر البطلان" (یہ ایک غلط خیال کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور اسکو صحیح سمجھنا صراحتاً باطل ہے۔) کتنی حدیث یا کتنے ایسے قول ہیں جہاں یہ صیغہ استعمال ہوئے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ حدیث صحیح اور قوی ہے، اس میں کسی طرح کا کوئی شک وارتیاب نہیں۔ پھر مولانا نے شواہد پیش کئے :-

استرمدی فرماتے ہیں: روی عن النبی ﷺ أنه قال: ویل للأعقاب الخ۔

۱۔ البانی شدوزہ و أخطاؤہ ۱۰۱

منذری نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ ترمذی نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اسکو طہرانی نے کبیر میں اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

۲- مولانا نے دوسری دلیل دی کہ ترمذی فرماتے ہیں: ”هذا أصح من حديث شريك، لأنه قد روى من غير وجه، يعني یہ حدیث شریک کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے؛ کیونکہ ایک سے زائد طریق سے مروی ہے۔“

ہم نے صرف دو دلیلوں کے ذکر پر ہی اکتفاء کیا ورنہ مولانا نے ۲۳ شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ محض مجہول کے صیغہ سے کوئی حدیث ضعیف نہیں ہو جاتی ہے۔

۳- البانی صحیحہ ۳: ۳۵ میں فرماتے ہیں کہ: ”وعلى ذلك فلا يجوز التسمية بعز الدين، ومحي الدين، ناصر الدين“ (اسی بنا پر عز الدین، محی الدین، اور ناصر الدین نام رکھنا جائز نہیں ہے۔)

مولانا الاعظمیٰ نے البانی کی اس عبارت پر ریمارک لگایا کہ وہ اپنا نام تو محمد ناصر الدین ہی بتاتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے اپنے لئے اسکو کیسے جائز سمجھ لیا۔

۵- البانی صحیحہ ۳: ۴۳ میں لکھتے ہیں: ”في عشرين ربيع الآخر“

مولانا الاعظمیٰ نے گرفت کی کہ یہ غلط ہے۔ درست ”في عشرين ربيع

الآخر“ یا ”في العشرين من ربيع الآخر“ ہے۔

انہیں چند مثالوں کے پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، ورنہ بات طویل ہو جائے گی۔ یہ کتاب پہلے ارشد سلفی کے نام سے طبع ہوئی تھی، مولانا نے یہ کتاب انہیں املا کرائی تھی۔ بعد میں کتاب کی استناد کی خاطر لوگوں کے اصرار پر آپ نے اپنے نام کو ظاہر فرمایا۔ ”الکتابانی شذوذہ وأخطاؤہ“ پہلی دفعہ ہندوستان میں، پھر

حیرت میں اور تیسری دفعہ ۱۹۸۴ء میں ”دار العروہ للنشر والتوزیع“ کویت سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ مولانا بدر الحسن قاسمی مقیم کویت کے ۱۴/۳/۱۹۸۵ء کے ایک مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے، لکھتے ہیں:-

”یہاں دار العروہ للنشر والتوزیع نے ’الاکبانی اخطاؤہ وشدوؤہ‘ (کذا)

کو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا اور معرض الکتاب العربی میں بہت

فروخت ہوئی۔“

الرفع والتکمیل

فقیر امت حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (۱۲۶۳ھ-۱۳۰۴ھ) کی شخصیت ہندو بیرون ہند کی ایک بے مثال علمی شخصیت تھی۔ آپ نے مختصر سی زندگی میں گراں قدر تحقیقی و علمی کارنامے انجام دیے، فقہ و حدیث کے محقق و نقاد شمار کئے جاتے ہیں۔ حضرت فرنگی محلی کی ایک مشہور تصنیف ”الرفع والتکمیل فی البحر والتعدیل“ ہے۔ علامہ شیخ ابو غدہ کی تحقیق، تخریج اور تعلیقات سے مزین یہ کتاب تین مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اسکا پہلا ایڈیشن حلب سے ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء اور دوا ایڈیشن حیرت سے ۱۳۸۸ھ م ۱۹۶۸ء اور ۱۴۰۷ھ م ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئے۔

”الرفع والتکمیل“ کے پہلے دوا ایڈیشن پر بھی مولانا اعظمی کے استدراکات ہیں، جسکی تصحیح شیخ ابو غدہ نے تیسرے ایڈیشن میں کر لی تھی۔ استدراکات کی چند مثالیں تیسرے ایڈیشن کے حوالہ سے پیش کی جا رہی ہیں:

۱۔ الرفع والتکمیل ص ۲۳۸ پر ایک عبارت ہے: ”و من ثم لم یقبل قول أبی حاتم

فی حق (موسی بن ہلال العبدي)“

شیخ ابو نعیم نے "ابو حاتم" پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا:

"وقع في الاصلين: (ومن ثم لم يقبل قول الدار قطني.....)
وهو خطأ نشأ عن سبق نظر من الطابع لأول مرة، ثم استقر
في الطبعة الثانية، وصوابه ما أثبتته، صوابه لي من الهند
شيخنا العلامة المحدث الجليل الناقد حبيب الرحمن
الأعظمي جزاه الله خيراً. وقد جاء كما صوابه في "الجرح
والتعديل" لابن أبي حاتم ۱/۳: ۱۶۶."

(پہلے دوایدیشن میں "ومن ثم لم يقبل قول الدار قطني" (دار
قطني کا قول مقبول نہیں) ہے۔ ایسا پہلی مرتبہ طابع کی سبقت نظر کے
سبب ہوا، پھر یہی غلطی دوسرے ایڈیشن میں بھی باقی رہی، حالانکہ صحیح وہ
ہے جسے میں نے متن میں ذکر کیا ہے۔ یہ تصحیح ہندوستان سے ہمارے شیخ
علامہ محدث جلیل ناقد حبيب الرحمن الأعظمی نے کی، اللہ انہیں جزائے خیر
دے۔ ابن ابی حاتم کی "الجرح والتعديل" ۱/۳: ۱۶۶ میں بھی وہی ہے جو
انہوں نے تصحیح کی۔)

۲۔ الرفع والتكميل ص ۳۵۰ پر ایک عبارت ہے: "وقال في ترجمة (أحمد بن
سعيد بن عقدة) الخ

شیخ ابو نعیم اس پر حاشیہ لگا کر لکھتے ہیں:

"وقع في الأصلين: (أحمد بن شعيب.....) وهو تحريف
صوابه (أحمد بن سعيد بن عقدة) وترجمته في الميزان
۱: ۶۴ و كنت غفلت عن هذا التحريف في الطبعة الأولى،
فنبهني إليه مشكوراً من الهند شيخنا العلامة المحدث

الكبير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي فجزاه الله عني وعن العلم والسنة ورجالها خيراً.

(اصلین میں (احمد بن شعیب) ہے، یہ ایک تحریف ہے۔ صحیح (احمد بن سعید بن عقدہ) ہے، میزان ۶۴:۱ میں ان کا تذکرہ ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اس تحریف پر میری نگاہ نہیں گئی، ہندوستان سے ہمارے شیخ علامہ محدث کبیر مولانا حبيب الرحمن الأعظمی نے اس جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اللہ ان کو میری طرف سے، علم و فن کی طرف سے، حدیث اور رجال حدیث کی جانب سے جزائے خیر سے نوازے۔)

۳۔ امام بخاری کی اصطلاح ”فیہ نظر“ کا کیا مفہوم ہے، اس سے امام بخاری کی کیا مراد ہوتی ہے؟ کبار محققین اس بابت مختلف رائے رکھتے ہیں۔ امام بخاری کی مراد حافظ ذہبی کے نزدیک متہم راوی اور حافظ عراقی کے نزدیک متروک الحدیث راوی ہے۔

مولانا حبيب الرحمن صاحب الأعظمی حافظ ذہبی اور حافظ عراقی کے اس موقف پر نقد کرتے ہیں، اور حیرت و استعجاب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”لا ينقصني عجبني حين أقرأ كلام العراقي والذهبي هذا

أن البخاري لا يقول: (فيه نظر) إلا فيمن يتهمة غالباً. ثم

أرى أنمة هذا الشأن لا يعباون بهذا، فيوثقون من قال فيه

البخاري: (فيه نظر) أو يدخلونه في الصحيح.“ ۲

(عراقی اور ذہبی کے اس قول کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ امام بخاری

۱۔ الرفع والکلیل ص ۳۸۸ اور ۲۰۳ ایڈیشن ۱۹۸۷ء

۲۔ ایضاً ص ۳۸۹

(فیہ نظر) کہہ کر اکثر متہم راوی ہی مراد لیتے ہیں، پھر میں محدثین کو دیکھتا ہوں کہ اسکی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں، چنانچہ جنکے بارے میں بخاری نے فیہ نظر کہا ہے وہ انکی توثیق کرتے ہیں یا انکو اپنی صحیح میں جگہ دیتے ہیں۔

پھر ائمہ نے جہاں جہاں بخاری کے ”فیہ نظر“ کہے ہوئے راوی کی توثیق کی ہے، یا اپنی صحیح میں ان کا ذکر کیا ہے، مولانا الاعظمی نے ان کو بطور شواہد پیش کیا، مولانا نے گیارہ شواہد پیش کئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

۱- تمام بن شیح: بخاری نے ان کے بارے میں (فیہ نظر) کہا ہے، اور ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے، بزار نے ایک جگہ انہیں صالح الحدیث کہا، بخاری نے خود وقت رکوع حضرت عمر بن عبدالعزیز کے رفع یدین کے سلسلہ میں ایک موقوف معلق اثر نقل کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ بخاری کے یہاں خود وہ راوی متروک نہیں، اور نہ ہی ابو داؤد و ترمذی کے یہاں۔

۲- ثعلبی بن یزید حماتی: بخاری نے ان کے بارے میں کہا: (فی حدیثہ نظر، لا یتابع فی حدیثہ) نسائی نے کہا: ثقہ ہیں، ابن عدی نے کہا کہ میں نے ان کی کوئی منکر حدیث نہیں دیکھی، حافظ ابن حجر کے بقول وہ صدوق شیعہ ہیں۔

۳- جعدہ مخزومی: بخاری نے ان کے بارے میں کہا: (لا أعرف له إلا هذا الحديث، وفيه نظر) اور ترمذی نے ان سے روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے ان کو مقبول کہا، ابن حجر ایسا اسی راوی کے بارے میں فرماتے ہیں جن سے چند حدیثیں مروی ہوں؛ لہذا اس سے اس راوی کا متروک الحدیث ہونا ثابت نہ ہو سکا۔

۴- جمیع بن عمیر التیمی: بخاری نے فرمایا: (فی احادیثہ نظر) اور ابو حاتم نے کہا: ”محلہ الصدق“، ”صالح الحدیث“ ساجی نے صدوق کہا، عجلی نے ”تابعی ثقہ“ لکھا، ابن حجر فرماتے ہیں کہ: ”صدوق یخطی، و یشیع و روی له“

الاربعة“ یعنی وہ صدوق ہیں، خطا کر جاتے ہیں، ان کے یہاں تشیع معلوم ہوتا ہے، سنن اربعہ میں ان سے روایتیں لی گئی ہیں۔ ترمذی نے اپنی سنن میں مناقب ابی بکر صدیق کے سلسلہ میں ان کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

۵۔ حبیب بن سالم: بخاری نے ان کے بارے میں کہا: ”فیہ نظر“ ابن عدی نے اسی راوی کے بارے میں کہا: ”لیس فی متون احادیثہ حدیث منکر، بل قد اضطرب فی اسانید ما یروی عنہ“ یعنی متون احادیث میں کوئی منکر حدیث نہیں ہے، بلکہ ان سے مروی روایات کی اسانید میں اضطراب ہے۔

آجری نے ابوداؤد سے نقل کیا کہ وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو الثقات میں ذکر کیا ہے، مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ ابن حجر نے کہا: لا بأس بہ۔

۶۔ حریش بن خریٹ: بخاری نے ان کے بارے میں کہا ”فیہ نظر“ اور یہ بھی کہا ”ارجو“ یمانی معلمی التاریخ الکبیر میں تعلیقاً لکھتے ہیں کہ غالباً امام بخاری کی مراد اس سے ”ارجو انه لا بأس بہ“ ہے۔ اور تہذیب التہذیب میں ہے (قال البخاری فی ”تاریخہ“ ارجو ان یکون صالحاً) ابو حاتم نے لکھا: لا بأس بہ۔

۷۔ راشد بن داؤد الصنعانی: بخاری نے کہا ”فیہ نظر“، لیکن یحییٰ بن معین نے ان کی توثیق کی اور فرمایا ”لا بأس بہ ثقہ“، وحیم نے کہا کہ وہ میرے نزدیک ثقہ ہیں، ابن حبان نے انکو الثقات میں ذکر کیا ہے۔ نسائی نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں کہا ”صدوق له أوہام“

۸۔ سلیمان بن داؤد خولانی: بخاری نے کہا ”فیہ نظر“ اور ابو زرہ، ابو حاتم، عثمان بن سعید اور حفاظ کی ایک جماعت نے ان کی تعریف کی ہے، ابن حجر نے لکھا ”لا ریب فی انه صدوق“ ان کے صدوق ہونے میں کوئی شک نہیں۔

۹۔ صمصمہ بن ناجیہ: بخاری نے کہا ”فیہ نظر“۔ یہ صحابی ہیں، ابن حجر نے ”تہذیب التہذیب“ اور ”الاصابہ“ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ طالب بن حبیب المدنی الانصاری: بخاری نے کہا ”فیہ نظر“ لیکن ابوداؤد نے ان سے روایت نقل کی ہے، ابن عدی نے لکھا ”أرجو أنه لا بأس به“ ابن حبان نے ”الثقات“ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور بیہقی نے مجمع الزوائد ۵: ۶۰۶ میں انکی توثیق کی ہے۔

۱۱۔ عبدالرحمن بن سلمان الزبیری: بخاری نے کہا ”فیہ نظر“ ابن یونس نے انکی توثیق کی، ابوحاتم نے کہا ”ما رأیت من حدیث منکرأ، وهو صالح الحدیث“ مجھے انکی کوئی منکر حدیث نہیں ملی، وہ صالح الحدیث ہیں۔ ”ولہ عند مسلم فی مبیئ ابن عباس عند میمونہ“ (مسلم میں بھی ان کی ایک روایت ہے، حضرت میمونہ کے یہاں ابن عباس کے رات گزارنے کے سلسلہ میں۔) نسائی نے کہا یس بہ، یس بہ، جیسا کہ تہذیب التہذیب ۶: ۱۸۸ میں ہے۔ ابن حجر نے کہا لا بأس بہ، بخاری نے ان کو ”الضعفاء“ میں داخل کیا ہے، اس پر ابوحاتم نے ”یحول من ہناک“ لکھا یعنی ان کو ضعفاء سے منتقل کیا جانا چاہئے۔

مولانا کی پیش کردہ مثالوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تاہیدی شواہد یا مثالیں آتی گئیں اور انھیں وہ بڑی روانی سے قلم بند کرتے چلے گئے۔ اس موقع پر تحقیق و نقد میں مولانا کے علم کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کے کامل استحضار کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ مولانا اعظمی نے اپنے موقف کے سلسلہ میں ان دلائل کے پیش کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ قول فیصل بھی سنایا:

”الصواب عندی: أن ما قاله العراقي ليس بمطرد ولا

صحيح على إطلاقه، بل كثيراً ما يقوله البخاري ولا يوافقه

عليه الجهابذة و كثيراً ما يقوله ويريد به اسناداً خاصاً.....

و كثيراً ما يقوله ولا يعني الراوي، بل حديث الراوي. ۱۔
(عراقی کے قول کی حیثیت کسی قاعدہ کلیہ کی نہیں ہے، اور نہ ہی یہ بات
علی الاطلاق صحیح ہے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بخاری نے جو بات کہی
ہے دوسرے جہابذہ فن اس کی موافقت نہیں کرتے ہیں۔ اور بسا
اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسا کہہ کر بخاری کوئی خاص سند مراد لیتے
ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے راوی نہیں بلکہ راوی کی حدیث
مراد ہوتی ہے۔)

شیخ ابو غندہ نے مولانا الاعظمی کے اس محققانہ نقد پر اس انداز میں داد

تسین دی:

”وقد أيقظ..... حفظه الله وأمتع به..... إلى موضوع من

العلم هام جداً، كان مأخوذاً بالتسليم والمتابعة من العلماء،

فجزاه الله تعالى خيراً عن السنة وعلومها.“ ۲۔

(مولانا نے، اللہ ان کی حفاظت فرمائے اور ان کا سایہ تادیر قائم رکھے،

ایک بہت ہی اہم علمی مسئلہ سے باخبر کیا، جو علماء کرام کے یہاں مسلم و مختار

ہے۔ اللہ ان کو حدیث اور علوم حدیث کی جانب سے اس خدمت پر

بہترین جزاء سے نوازے۔)

۱۔ یہ پوری بحث الرفع والکمیل ص ۳۸۸-۳۹۱ اور قواعد فی علوم الحدیث مصنفہ مولانا ظفر احمد

تھانوی، تحقیق شیخ ابو غندہ ص ۲۵۳-۲۵۷ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۲۔ الرفع والکمیل ص ۳۹۱، قواعد فی علوم الحدیث ص ۲۵۷

تحفۃ الاحوذی

مشہور و جلیل القدر محدث امام ترمذی کے آفاقی شہرت یافتہ مجموعہ حدیث ”جامع ترمذی“ کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، انہیں میں ایک شرح ”تحفۃ الاحوذی“ کے نام سے ہے۔ یہ شرح معروف عالم دین مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوریؒ نے لکھی۔ اس شرح کو ایک امتیازی حیثیت و مقبولیت حاصل ہے، ترمذی شریف کے حل میں اس کو ایک مرجع شمار کیا جاتا ہے۔

”تحفۃ الاحوذی“ پر بھی مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے استدراکات ہیں، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔ تحفۃ الاحوذی پر مولانا الاعظمی کے استدراکات ان کے ذاتی نسخہ میں ہیں، یہ نسخہ جدید برقی پریس کا چھپا ہوا ہے۔ ڈاکٹر مسعود احمد اس نسخہ سے ان استدراکات کو چین چین کر مجلہ ”المآثر“ کے صفحات پر منتقل کر رہے ہیں۔ اب تک تحفۃ الاحوذی پر استدراکات کی ۹ قسطیں آچکی ہیں۔ ہم یہاں المآثر کے حوالہ سے ان میں سے چند استدراکات نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں:-

۱- استدراک نمبر ۹ ص ۵۴- امام ترمذی فرماتے ہیں: ”وقد رواہ زائدة بن قدامة وغير واحد عن خالد بن علقمة عن عبد خير.....“ یعنی اس حدیث کو زائدہ بن قدامہ اور کئی لوگوں نے خالد بن علقمہ..... سے روایت کیا ہے۔

مولانا مبارکپوری لکھتے ہیں: ”أخرج حديث قدامة عن خالد بن علقمة.....“ مولانا اعظمی نے (صح) کی علامت لگا کر حاشیہ لکھا کہ صحیح زائدہ بن قدامہ ہے۔ یعنی اس حدیث کو روایت کرنے والے قدامہ نہیں بلکہ زائدہ ہیں۔ شارح نے غلطی سے زائدہ بن قدامہ کے بجائے قدامہ لکھ دیا ہے۔

۲- استدراک نمبر ۱۶ ص ۸۱- باب الوضوء مما غيرت النار. امام ترمذی اس

باب میں لکھتے ہیں: "وفي الباب عن أم حبيبة وأم سلمة....."

مولانا مبارکپوری نے ام حبیبہ اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرام کی حدیثوں کی نشاندہی کی ہے کہ فلاں صحابی کی حدیث فلاں کتاب میں مذکور ہے، لیکن حضرت ام سلمہ کی حدیث کے بارے میں خاموش ہیں، مولانا اعظمیؒ حضرت ام حبیبہ کی حدیث جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں یہ علامت () لگا کر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں: "واما حدیث أم سلمة فأخرج ابن أبي شيبة والطحاوي." یعنی ام سلمہ کی حدیث کی تخریج ابن ابی شیبہ اور امام طحاوی نے کی ہے۔

۲- استدراک نمبر ۴۱- ج: ۱ ص ۱۸۳- عن أبي سعيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن. یعنی حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم لوگ اذان سنو تم بھی اسی طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے۔ امام ترمذی نے اس کو نقل کر کے لکھا کہ: وفي الباب عن أبي رافع وأبي هريرة وأم حبيبة وعبد الله بن عمرو وعبد الله بن ربيعة الخ.

حضرت عبد اللہ بن ربیعہ کی حدیث کی بابت مولانا عبد الرحمن مبارکپوری نے لکھا: "لم أقف عليه" (میں اس سے واقف نہیں)

مولانا اعظمیؒ نے فرمایا: قلت: حدیث عبد اللہ بن ربیعہ أخرجه

النسائي في باب أذان الراعي من الصغرى، وفي عمل يوم وليلة من الكبرى. یعنی حضرت عبد اللہ بن ربیعہ کی اس حدیث کو امام نسائی نے سنن صغریٰ (مختصر) کے باب اذان الراعی میں اور سنن کبریٰ کے عمل الیوم واللیلة میں روایت کیا ہے۔

۳- استدراک نمبر ۵۳ ج: ۱ ص ۲۳۷ پر یہ باب ہے ما جاء في الانصراف عن بسيناه وعن يساره یعنی (نماز کے بعد) دائیں اور بائیں رخ کرنے کے بارے

میں جو حدیث وارد ہوئی ہے اس کا باب۔ امام ترمذی نے حضرت ہلب کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضرت ﷺ ہماری امامت فرماتے تھے تو آپ دائیں اور بائیں ہر طرف گھومتے تھے۔ اس حدیث کی تخریج کے بعد امام ترمذی نے لکھا: "وفي الباب عن عبد الله بن مسعود وأنس وعبد الله بن عمرو وأبي هريرة" اس باب میں حضرت عبد اللہ بن مسعود، انس، عبد اللہ بن عمرو اور ابو ہریرہ کی حدیثیں ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کی نسبت مولانا مبارکپوری نے لکھا ہے: "والا حدیث ابی ہریرہ فلم أقف علی من أخرجه" حضرت ابو ہریرہ کی حدیث مجھے علم نہیں ہو سکا کہ اس کی تخریج کس نے کی ہے۔

مولانا اعظمی نے حاشیہ میں لکھا: "أخرج هق في (ج ۲/۲۹۵) وأخرج عبد الرزاق في مصنفه" یعنی اس کی تخریج بیہقی نے سنن کبریٰ میں جلد ۲: ص ۲۹۵ پر کی ہے اور اس کو عبد الرزاق نے مصنف میں بھی روایت کیا ہے۔

۵۔ استدراک نمبر ۶۳ ج: ۱ ص ۲۸۳ پر باب فی الصلوٰۃ الی المرحلة آیا ہے، اس باب میں حضرت ابن عمر کی حدیث مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اونٹ یا اونٹنی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، نیز آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے تھے جس طرف وہ جاتی تھی۔

اس باب میں امام ترمذی نے کسی اور صحابی کی حدیث کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے، جہاں امام ترمذی کی عبارت ختم ہوتی ہے وہیں پر علامت لگا کر مولانا اعظمی نے حاشیہ لکھا: "وفي الباب عن عبادة أخرجه ابن أبي شيبة" یعنی اس باب میں عبادہ سے روایت ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے۔

۱۔ مندرجہ بالا استدراکات المآثر ج: ۱۰ ص ۳۶، ج: ۱۱ ص ۴۱، ج: ۱۲ ص ۴۹، ج: ۱۳ ص ۵۲، ج: ۱۴ ص ۵۵، سے ماخوذ ہیں۔

اسماء الرجال

اسلام کی پر شکوہ عمارت دو محکم بنیادوں پر قائم ہے، ایک قرآن مجید، دوسری حدیث شریف۔ حدیث نبوی کلام الہی کی تفسیر بھی ہے اور اس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا بالکل اسی طرح اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ارشادات، عادات و اطوار اور آپ کی حیات سے متعلق ہر ایک چھوٹی بڑی بات کی حفاظت کا انتظام فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے اس شمع ہدایت کے لئے ایسے پروانے پیدا کئے کہ تاریخ عالم و تاریخ اقوام آج تک ایسے جاں نثاروں اور وفا شعاروں کی کوئی مثال پیش نہ کر سکی۔ حضور اکرم ﷺ کے دہان مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو سننے اور یاد رکھنے کے لئے جھپٹ پڑتے تھے۔ خود حضرت عبد اللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ جتنی باتیں آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنتا تھا یاد رکھنے کے لئے ان کو قلمبند کر لیتا تھا، قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں بھی فرما جاتے ہوں گے؛ اس لئے حدیث نہ لکھو، میں ان کے کہنے سے رک گیا اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم لکھو اور اپنے دہان مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے کسی حالت میں ناحق اور غلط بات نہیں نکلتی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو کے اس بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونے والی ایک ایک چیز کی حفاظت میں کس قدر اہتمام برتا گیا ہے، اس اثر سے اس گوشہ پر بھی واضح روشنی پڑتی ہے کہ عہد نبوی سے ہی

کتابت حدیث کا سلسلہ جاری تھا، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور رجال حدیث سبھی نے پوری امانت و دیانت کے ساتھ احادیث رسول اور کلام نبی کی حفاظت اور نگہداشت کی، اور جب احادیث و آثار کے ذخیرے پوری دنیا میں پکھر گئے اور مدون و مرتب شکل میں منظر عام پر آ گئے تو اب ان صحابہ، تابعین اور محدثین کے حالات زندگی بھی مرتب کئے گئے، جنہوں نے روایتیں نقل کی تھیں؛ تاکہ ان کے حالات اور زندگی کے نقوش و خطوط سے ان کی صداقت و امانت اور دیانت خود بخود آشکار ہو جائے اور یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے کہ ان کی نقل کردہ روایات و آثار میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رجال (رواة) پر اس قدر کتابیں تصنیف کی گئیں کہ اس موضوع نے ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی، یہ علم رجال کیا ہے؟ مشہور محدث و محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

”وكان من أجل ما اهتموا به علم رجال الحديث، فدونوا فيه واستقصوا استقصاءً عجباً، حتى يكاد يقال: لم يفتهم من الرواة راوٍ ثقة كان أو ضعيفاً إلا ذكروه، بما وصل إليه علمهم، فأحسنوا وأجادوا، وتعبوا وأفادوا، فجاء من بعدهم فرأى كل من يمر به من الرواة مذكوراً مترجماً بما يكشف عن حاله جرحاً أو تعديلاً.“^۱

(جن علوم کے ساتھ اہل علم حضرات نے بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا، ان میں سے ایک علم رجال حدیث تھا، انہوں نے اس کو مدون کیا اور حیرت انگیز طور پر اس کا احاطہ کیا، حتیٰ کہ کہا جانے لگا کہ جہاں تک ان کے

^۱ لسان المیزان: ابن حجر عسقلانی، تحقیق: شیخ عبد الفتاح ابو غدہ، دار البشائر الاسلامیہ بیروت لبنان ۲۰۰۲ء

علم کی رسائی تھی کوئی بھی راوی خواہ ثقہ ہو یا ضعیف ایسا نہیں کہ جس کا ذکر انہوں نے نہ کیا ہو، ان حضرات نے بہترین کارنامے انجام دیئے، خود مشقت اٹھائی اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، چنانچہ ان کے بعد کے لوگوں کے سامنے جو بھی راوی آیا انہوں نے اس کو کتابوں کے اندر اس قدر مذکور اور متعارف پایا کہ جس سے اس راوی کے حالات کی بہ لحاظ جرح یا تعدیل اطلاع مل جاتی ہے۔)

علم رجال الحدیث کے ذیل میں راویوں پر جرح و تعدیل کی جاتی ہے اور ان سے متعلق تمام چیزوں سے بحث کی جاتی ہے؛ تا کہ کذاب و ضعیف رواة عدول اور ثقہ راویوں سے خود بخود چھٹ جائیں۔ اس علم کو معرض وجود میں لانے کا سہرا مسلمانوں کے سر جاتا ہے، اس سے پہلے اس فن کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ مشہور زمانہ مستشرق اسپرنگر کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ سابقہ اور موجودہ اقوام عالم میں کسی قوم نے بھی علم اسماء الرجال میں ایسے کارنامے انجام نہیں دیئے جیسا کہ مسلمانوں نے پانچ لاکھ افراد کے حالات پر مشتمل اس اہم اور عظیم ترین علم کے سلسلہ میں انجام دیئے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فن یا علم ہو جسکو ثقہ و جرح میں وہ مقام بلند حاصل ہو جو فن رجال کو حاصل ہے۔

حدیث سے متعلق تمام علوم و فنون پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی بڑی گہری نظر تھی لیکن ان علوم میں بھی علم رجال میں آپ کو اختصاص حاصل تھا؛ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی تحقیق و تعلیق میں رواة و رجال کے بارے میں آپ کی آراء و تحقیقات ایسے مقامات پر دیکھنے میں آتی ہیں، جہاں پٹمی جیسے محقق خاموش نظر آتے ہیں۔ رجال کی ابھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں مولانا کو خاص مہارت حاصل ہے۔

۱۔ الرسالة الحمدیہ ص ۴۴ بحوالہ علم رجال الحدیث ص ۱۸-۱۹، سیرۃ النبی ج: ۱ ص ۳۹ علامہ شبلی

رجال کی واقفیت کوئی آسان کام نہیں، اس فن میں ملکہ پیدا کرنے کے لئے ضمانت جانے کتنے علوم میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے: تاریخ، میراث، جغرافیائی حالات وغیرہ تمام موضوعات پر اس میدان کے شہسوار کی نظر رہتی ہے۔

اس فن میں مولانا الاعظمیٰ کی آراء کو ان کے معاصر علماء حدیث بڑی اہمیت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، علم رجال میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی انڈوپاک میں مولانا اعظمیٰ سے بڑھ کر کسی کو نہیں مانتے، مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ:

”مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیٰ..... سے بڑھ کر فن حدیث و اسماء

الرجال کا محقق و مبصر میرے نزدیک آج انڈوپاک میں کوئی نہیں ہے۔“

اس علم میں مولانا الاعظمیٰ کی صداقت و مہارت کو دیکھتے ہوئے مولانا اعجاز احمد اعظمی مدیر مجلہ ”الماثر“ نے بھی کچھ اسی طرح کی رائے ظاہر کی ہے، لکھتے ہیں:

”یہ مشکل ترین کام ہے، کیونکہ ایک نام و نسب کے متعدد راوی اسماء

الرجال کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں یہ متعین کرنا کہ یہ فلاں راوی

ہے، بے حد مشکل ہے، مگر یہی مشکل حضرت محدث کبیر کے لئے اللہ تعالیٰ

نے آسان کر دی تھی۔“

چنانچہ اب ہم تعلیقات و حواشی میں سے رجال سے متعلق مولانا کی تحقیق و تنقید کے چند نمونے پیش کرتے ہیں، ویسے تو گزشتہ صفحات میں تعلیقات کے نمونوں میں رجال کے بارے میں مولانا کی آراء پیش کی گئی ہیں، لیکن اس فن میں مولانا کے اختصاص کی وجہ سے یہاں اس کی چند مثالیں مزید پیش کی جا رہی ہیں؛ تاکہ قاری کو خود بھی اندازہ ہو جائے۔

۱۔ صدیق اکبر ص ۲۷ مولانا سعید احمد اکبر آبادی

۲۔ الماثر ج: ۱ ص ۳۰

المصنف عبد الرزاق ج: ۱ ص ۳۶ ج: ۱۵ میں: "عبد الرزاق عن أبي بكر بن محمد بن أبي سبرة عن يحيى بن سعيد" ہے۔

مصنف کے اصل نسخہ میں اسناد اس طرح تھی: "عبد الرزاق عن أبي بكر بن محمد بن أبي ميسرة۔"

مولانا الاعظمی نے اسکی تصحیح کی اور متن میں 'ابی ميسرة' کے بجائے 'ابی سبرة' تحریر فرمایا۔ جب مولانا کو ظاہر یہ کانسخہ ملا تو ان کی اس تصحیح کی تائید ہو گئی یعنی اس میں 'ابی سبرة' ہی لکھا ہوا ملا۔ مولانا نے اس راوی کا مختصر تعارف بھی کرایا کہ یہ ابو بکر بن عبد اللہ بن محمد بن ابی سبرہ ہیں، تہذیب میں ان کا ذکر ہے، یہاں دادا کی جانب منسوب ہیں، یحییٰ بن سعید الانصاری سے روایت کرتے ہیں اور ان سے عبد الرزاق روایت کرتے ہیں۔

۲۔ مصنف عبد الرزاق ج: ۲ ص ۱۲۳ ج: ۵۱-۲ "عبد الرزاق عن عكرمة بن عمار قال: حدثني ضمضم بن جوس"

اصل نسخہ میں 'جوس' کے بجائے 'حويضم' رقم تھا۔
مولانا نے کہا کہ یہ غلط ہے صحیح 'جوس' ہے، چنانچہ متن میں 'جوس' ہی تحریر فرمایا اور حوالہ دیا کہ یہ ضمضم بن حارث بن جوس ہیں، تہذیب میں ان کا تذکرہ ہے۔

۳۔ مسند حمیدی ج: ۱ ص ۱۰۲ ج: ۴۰۴- "حدثنا الحميدي قال: ثنا عبد العزيز ابن محمد الدراوردي قال: أخبرني علقمة عن أمه الخ."

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے مندرجہ بالا اسناد پر دو جگہ حاشیے لگائے ایک 'علقمة' پر دوسرا 'عن أمه' پر: پہلے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک علقمة سے مراد علقمة بن ابی علقمة المدنی قاضی مدینہ ہیں، ان کے والد کا نام بلال ہے۔
دوسرے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ جامع الاصول میں 'عن أمه' کے بجائے

’عن ابیہ‘ ہے، لیکن میرے نزدیک درست ’عن امہ‘ ہے۔ مولانا علقمہ کی والدہ کا تعارف پیش کرتے ہیں کہ ان کا نام مرجانہ ہے، حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں اور ان سے ان کے صاحبزادے علقمہ روایت کرتے ہیں جیسا کہ تہذیب وغیرہ میں ہے۔ مولانا اعظمی نے یہ اور اس سے پہلے والی تعلیق اپنے وجدان کی شہادت پر لکھی تھی۔ اور پھر جب طحاوی میں دیکھا تو ویسا ہی پایا جیسا کہ لکھا تھا؛ کیونکہ طحاوی نے اس حدیث کو ابو الزناد کے طریق سے عن علقمة ابن ابی علقمة عن امہ روایت کیا ہے۔

۳۔ مسند حمیدی ج: ۲ ص ۳۹۷ ح: ۸۹۶۔ حدثنا الحمیدی قال: ثنا سفیان قال: ثنا مسعر عن ابن القبطیة الخ۔

اصل نسخہ میں ’ابی العطیة‘ تھا، جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں ’ابن القبطیة‘ تھا، مولانا کے مطابق اصل نسخہ میں تصحیف یعنی نقطوں کا ہیر پھیر یا لفظ میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے۔ صحیح ’ابن القبطیة‘ ہے۔ اس راوی کا نام عبید اللہ ہے جیسا کہ مسلم میں ہے۔

۵۔ کشف الاستار ج: ۱ ص ۲۹۵ ح: ۶۱۷۔..... قال البزار: لا نعلمه عن ابی ہریرة وحذیفة إلا بهذا الإسناد، وأبو حازم المدني سلمة، وأبو حازم الأشجعی اسمه نبتل۔

مولانا الاعظمی نے ’نبتل‘ پر حاشیہ لگایا کہ شاید یہاں کوئی چوک ہو گئی ہے؛ اس لئے کہ ابو حازم الاشجعی کا نام سلمان ہے، وہ ’عزّة‘ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ اور رہی بات نبتل کی تو وہ ابو حازم مولیٰ ابن عباس ہیں، اس پر خوب غور کر لینا چاہئے۔

۶۔ کشف الاستار ج: ۳ ص ۷ ح: ۲۱۱۱۔ حدثنا رفیع بن سلمة، ثنا معمر بن المثنی أبو عبیدة الخ۔

اعظمی اس حدیث پر کلام کرتے ہیں کہ طبرانی نے اس حدیث کو اپنے شیخ رفیع بن سلمہ سے روایت کیا ہے، اور میں انہیں نہیں جانتا، اس حدیث کے بقیہ

رجال حدیث ثقہ ہیں۔ (۱۲۸/۸)

مولانا اعظمی فرماتے ہیں کہ بزار نے بھی اس حدیث کی روایت رفیع بن سلمہ سے کی ہے، لہذا یہ کوئی مجہول راوی نہیں ہے۔

۷۔ المطالب العالیہ ج: ۱ ص ۲۳۸ ح: ۸۳۰۔ ابن ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب قال: الخ۔

نسخہ مجروحہ میں 'ابو ربیعہ' تھا، اسی طرح مسندہ میں بھی 'عن ابی ربیعہ' تھا۔ لیکن مولانا الاعظمی نے دونوں نسخوں میں ابو ربیعہ لکھے جانے کو غلط ٹھہرایا؛ کیونکہ جب ابو ربیعہ مشرف بہ اسلام ہی نہیں ہوئے تھے تو حدیث کیسے روایت کرتے، چنانچہ مولانا نے اس غلطی کی تصحیح کی اور متن میں 'ابن ربیعہ' تحریر فرمایا۔

۸۔ المطالب العالیہ ج: ۳ ص ۱۵۵ ح: ۴۲۲۲۔ یزید بن ابی حبیب، أن أبا الخیر أخبره أن رجلاً من جھینۃ الخ۔

جھینہ کا ایک شخص کون ہے؟ مولانا الاعظمی نے حاشیہ میں اسکی وضاحت کی کہ 'رجلاً من جھینۃ' سے مراد ابو عبد الرحمن الجھنی ہیں، جیسا کہ آئندہ حدیث میں ان کا ذکر آ رہا ہے۔

۹۔ معارف ابن ابی شیبہ ج: ۳ ص ۳۱۳ ح: ۶۳۱۵۔ حدثنا أبو بکر قال: حدثنا ابن نمیر عن سفیان بن سعید الخ۔

حیدر آباد کن کے نسخہ میں سند اس طرح تھی 'سعید بن سعید' اور کتب خانہ پیر جہند و پاکستان کے نسخہ میں 'عن سعد بن سعید' رقم تھا۔

مولانا اعظمی نے دونوں مخطوطوں میں رقم سند کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کی تصحیح سند یوں لکھی: 'حدثنا ابن نمیر عن سفیان بن سعید'۔

۱۰۔ تلمیذ خواتم جامع الاصول ص ۲۹۶۔ عید اللہ بن عبد اللہ ہو

أبو عبد الله عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود الهذلي ولد أخى
عبد الله بن مسعود الخ.

مولانا عظمیٰ نے 'اخی' پر حاشیہ لگایا کہ ایک 'ولد' چھوٹ گیا ہے، یعنی صحیح
عبارت یہ ہے: 'ولد ولد أخى عبد الله'، یعنی مسعود ہندلی عبد اللہ بن مسعود کے
بھائی کے بیٹے نہیں بلکہ پوتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاید پہلا 'ولد' لکھنا رہ گیا۔

نصرة الحديث

اس دور بلا خیز میں بہت سے نئے نئے فتنے وجود میں آئے، ان فتنوں میں
ایک اہم فتنہ "انکار حدیث" کا ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں اور
انکے رفیق چراغ علی نے حدیث کی حجیت کا انکار کیا۔ انکے بعد نظریہ انکار حدیث
عبد اللہ چکڑالوی کی قیادت میں آگے بڑھا، اس کے بعد اسلم جیرا جپوری اور غلام احمد
پرویز نے اس فتنہ کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے ایک منظم نظریہ اور مکتب فکر کی شکل دی۔
بیسویں صدی کی غالباً تیسری یا چوتھی دہائی کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے
ایک رسالہ "میں منکر حدیث کیوں ہوا؟" تحریر فرمایا، اپنے نام کو پردہ خفا میں رکھتے
ہوئے انہوں نے خود کو "حق گو" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ جن وساوس اور شکوک کی
بنیاد پر منکرین حدیث نے حدیث کا انکار کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے
ساتھ ان کو یہاں ذکر کیا جائے:

- ۱- اقوال و افعال نبوی ﷺ کی پیروی کا خدا نے حکم ہی نہیں دیا۔
- ۲- اقوال و افعال نبوی ﷺ قابل پیروی تو ہیں لیکن وہ محفوظ نہیں ہیں اور ان کی نقل
و حکایت کا کوئی اہتمام نہیں برتا گیا ہے۔

۳۔ حدیث میں بہت سی باتیں خلاف عقل ہیں اور خلاف عقل باتیں قابل تسلیم نہیں۔
 ”میں منکر حدیث کیوں ہوا؟“ کے مصنف ”حق گو“ نے تاریخ کو مسخ کر کے، قرآن و حدیث کے معانی و مفاہیم میں مغالطے پیدا کر کے حدیث کو غیر معتبر ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کی نظروں سے بھی یہ رسالہ گزرا۔
 مولانا محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری نے مولانا سے مذکورہ بالا رسالہ کے محققانہ جواب کی فرمائش کی۔ مولانا نے اس کو قبول فرمایا اور قرآن و حدیث کے دفاع میں اور اس فتنہ کے فوری سد باب کے پیش نظر دو ماہ کے اندر ہی اس رسالہ کا جواب لکھ کر مولانا بہاء الحق قاسمی کے پاس ارسال فرمادیا۔^۱

مولانا الاعظمیٰ نے اس کتاب میں ازاول تا آخر بہت ہی محققانہ، محدثانہ اور مؤرخانہ بحث کی ہے۔ سب سے پہلے ”قرآن کریم اور حدیث“ کا عنوان قائم کر کے حدیث کی حیثیت و حجیت پر قرآن کی روشنی میں کلام فرمایا۔ مولانا نے قرآن مجید سے ۲۵ شواہد پیش کئے، ان شواہد میں دو قسم کی آیتوں کا ذکر کیا۔ پہلی قسم کی آیتوں میں جس طرح خدا، ملائکہ، کتاب اللہ اور قیامت پر ایمان لانے کا حکم ہے، اسی طرح رسول ﷺ پر ایمان، رسالت کا اعتقاد اور آپ کے مبعوث من جانب اللہ ہونے پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، دوسری قسم کی آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح احکام الہی کا ماننا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام قرآن میں ہیں، بالکل اسی طرح رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت بھی لازم ہے اور احکام رسول اور آپ کے فیصلوں کو ہی حدیث کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں باہمی ارتباط ایسا

ہے کہ انکار حدیث کا لازمی نتیجہ انکار قرآن ہوگا۔

مولانا اعظمی نے ”منکر حدیث کے رسالہ“ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ ”کا عنوان قائم کر کے ”حق گو“ کے رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی غلط بیانیوں، فتنہ انگیز شکوفوں اور حدیث پر ان کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات کا مدلل انداز سے پوری علمی قوت کے ساتھ رد کیا اور حق و ناحق کے درمیان ایک اپنی تفصیل کھڑی کر دی، انہوں نے ”حق گو“ کے چہرے سے حق گوئی کا نقاب اتار کر انکا اصل چہرہ امت مسلمہ کو دکھا دیا۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے قرآن و حدیث اور تاریخ سے حدیث کی حقانیت اور صداقت و امانت پر دلیلوں کے انبار لگا دیئے۔ ہر سچے پکے مسلمان کے لئے قرآن و حدیث کی شہادت ہی کافی ہے، ان کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں لیکن مولانا نے اس کا بھی التزام رکھا کہ نالشائی اور گہن کے حوالے سے دلائل دیئے جائیں۔

چنانچہ مشہور روسی فلسفی نالشائی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے چند حکیمانہ اقوال زریں کا ترجمہ روسی زبان میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح مشہور مؤرخ ایڈورڈ گہن نے تاریخ زوال روم جلد: ۵ باب: ۵ میں لکھا ہے: ”ہر ایک بانی مذہب کی سیرت سے اس کے تحریری مکاشفات کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ (حضرت) محمد ﷺ کی حدیثیں امر حق کی جامع نصیحتیں اور ان کے افعال مجسم نیکی کے نمونے ہیں۔“

اگر کوئی چیز معرض وجود میں ہی نہیں تو اس کا ترجمہ کیسا اور گہن نے اسے کیسے جامع نصیحت قرار دیا؟

مولانا الاعظمی نے اس کتاب کا نام ”نصرة الحديث“ رکھا۔ اس کتاب کے اخیر میں مولانا نے مجلہ ”اہل حدیث“ کے ایڈیٹر مولانا ثناء اللہ صاحب کی بھی خبر لی ہے جن کے پریس میں ”حق گو“ کا رسالہ ”میں منکر حدیث کیوں ہوا؟“ طبع ہوا۔ مولانا نے اسے ”تعاون علی الاثم والعدوان“ قرار دیا۔ مولانا الاعظمی مولانا ثناء اللہ صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ:

”اہل حدیث“ کہلانے کے لئے تو آپ ہیں، اور حدیثوں سے مدافعت کرنے کے لئے حنفی؟“

”نصرة الحديث“ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۳ء میں برقی پریس امرتسر سے شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ لیکن اس دوسرے ایڈیشن میں مولانا محمد ایوب صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم کی خواہش پر مولانا الاعظمی نے ایک گرانقدر مقدمہ کا بھی اضافہ فرمایا، ۵۴ صفحات پر مشتمل اس مقدمہ کی حیثیت خود مستقل ایک کتاب کی ہے، حدیث سے متعلق جتنے بھی گوشے ہو سکتے تھے مولانا نے اس مقدمہ میں سبھی پر روشنی ڈالی ہے، حدیث کی حیثیت پر یہ مقدمہ ہی کافی ہے اصل کتاب کی تو بات چھوڑیے۔ نصرة الحديث کا تیسرا ایڈیشن ۱۳۱۲ھ ۱۹۹۲ء میں دار المآثر الاسلامیہ مئو سے شائع ہوا۔ اور چوتھا ایڈیشن ۱۳۲۵ھ ۲۰۰۲ء میں مرکز تحقیقات سے شائع ہوا۔

نصرة الحديث جب منظر عام پر آئی تو علماء اور پڑھے لکھے طبقہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور علم و تحقیق کے لئے اسے اپنی ضرورت سمجھا۔ ملک کے معروف علمی رسائل و مجلات میں اس پر ریویو لکھے گئے، جنہیں طوالت کے اندیشہ سے یہاں نقل کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں، ہم یہاں صرف دو شخصیات کے تاثرات نقل کرنے پر

اکتفاء کرتے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک مکتوب میں اس کتاب پر اظہار خیال فرماتے ہیں:

”جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا۔“

مشہور نقاد جناب ماہر القادری ماہنامہ ”فاران“ میں نصرۃ الحدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”..... منکرین رسالت جو دوسو سے مسلمانوں کے دل میں ڈال رہے ہیں،

اور جو نکتے تراش رہے ہیں، اس کتاب نے نہ صرف اسکا ازالہ کیا ہے

بلکہ اس قسم کے تمام شیطانی وساوس اور منافقانہ الزامات کی جڑیں کاٹ کر

رکھ دی ہیں..... اس کتاب کا ایک ایک ورق ایمان افروز ہے.....“

نصرۃ الحدیث کی افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے اس کا

عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، یہ عربی ترجمہ موسسۃ علوم القرآن بیروت نے

دائر حجاب مدینہ منورہ اور منار النشر والتوزیع کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔

طبقات ابن سعد اور اعتراف حقیقت

محمد بن سعد کی کتاب طبقات ابن سعد سیر و تراجم کی ایک اہم ترین کتاب

ہے۔ جرمنی کے پروفیسر سخاؤ (Sachaw) نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے شائع کیا

ہے۔ چونکہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ مستشرقین نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ اسلام

کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر سخاؤ بھی ایک مستشرق

۱۔ نصرۃ الحدیث ص ۲۲۰

۲۔ فاران، بحوالہ نصرۃ الحدیث ص ۲۲۰

تحقق ہیں: اس لئے ان کے ذریعہ طبقات ابن سعد کی تحقیق بھی مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب دانا پوری کے نزدیک دائرہ شک سے باہر نہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے عدم اعتماد کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

”طبقات ابن سعد..... اب یورپ کے عیسائیوں نے اس کو چھپوایا ہے..... مگر اس کی کوئی سند ہے کہ یہ نسخہ اصل تصنیف کے موافق ہے۔“
مزید ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

”چونکہ یہ پوری کتاب ہمیں یورپ کے واسطے سے ملی ہے، اس کے بھر دسہ پر ابن سعد کا حوالہ بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی سند متبادل کتابوں سے نہ مل جائے۔“^۲

کیا مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب دانا پوری کا یہ شک صحیح ہے؟
مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا اعظمی سے رابطہ قائم کیا اور صحیح صورت حال دریافت کی۔ اس سلسلہ میں مولانا اکبر آبادی خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

”مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں، میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا: پروفیسر سفاؤ پر یہ شبہ اور بدگمانی بالکل بیجا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوط کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی۔“^۳

۱۔ اصح المسیر ص ۳۱ مولانا ابوالبرکات دانا پوری

۲۔ ایضاً

۳۔ عثمان ذوالنورین ص ۲۴ مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مقدمہ معارف الحدیث

مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے ”معارف الحدیث“ کے نام سے اردو خواں طبقہ کے لئے احادیث کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ احادیث کئی جلدوں میں ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں کہ:

”ناچیز مؤلف نے اپنے علمی محسن اور استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے استدعا کی، ممدوح نے اس کو قبول فرمایا اور یہ مقدمہ تحریر فرمایا۔“

مولانا نے اس مقدمہ میں حدیث کی حجیت اور دین میں اس کی بنیادی اہمیت سے بحث کی ہے۔ آجکل ایک طبقہ حدیث کی حجیت اور سند کا سرے سے انکار کرنے پر مصر ہے۔ اس لئے مولانا نے مقدمہ میں اس پہلو کو خاص طور پر مد نظر رکھا اور ان کے باطل خیالات کی دلائل کی روشنی میں تردید کی۔

اس مقدمہ کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی آچکا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ ”The Sunnah in Islam“ کے نام سے U.K. Islamic Academy سے چھپ کر شائع ہوا۔

مزید خدمتِ حدیث

مندرجہ بالا تحقیقات کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن پر بالاستیعاب تو نہیں لیکن بعض بعض مقامات پر محدث اعظمی کی تعلیقات موجود ہیں۔ ان کتابوں کی ایک فہرست حیات ابوالمآثر کے حوالہ سے پیش خدمت ہے:

- ۱- التذلیل العجیب علی نہایۃ الغریب۔ جلال الدین سیوطی غیر مطبوع
- ۲- مسند اسحاق بن راہویہ۔ اسحاق بن راہویہ غیر مطبوع
- ۳- مسند الإمام ابی محمد الحارث بن ابی اسامہ۔ حارث بن ابی اسامہ غیر مطبوع
- ۴- نزہۃ الالباب فی الالقاب۔ ابن حجر عسقلانی غیر مطبوع
- ۵- حواشی بر مقدمہ ابن الصلاح

یہ حواشی شیخ عبدالشکور عبدالفتاح فدا کی طلب پر تحریر فرمائے تھے۔

۶- جزء خطبات النبی ﷺ فی حجۃ الوداع

حضرت مولانا زکریا صاحب کی تصنیف ”حجۃ الوداع و عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ جب چھپی تو اس میں حجۃ الوداع کا خطبہ شامل نہیں تھا۔ مولانا اعظمی نے حجۃ الوداع ملاحظہ فرمانے کے بعد ”جزء خطبات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع“ کا اضافہ فرمایا۔ اس جزء خطبات کی طباعت مطبع ندوۃ العلماء لکھنؤ، مکتبہ دینیات رائے ونڈ پاکستان اور مجلس علمی سحرات سے ہو چکی ہے۔

اجازت حدیث حاصل کرنے والے مشاہیر عرب

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی ایک بلند پایہ محدث تھے علماء اور محدثین ان سے اجازت و سند حاصل کرنا اپنے لئے باعث عزت و شرف سمجھتے۔ اجازت و سند حاصل کرنے والوں کا یہ سلسلہ ہندوستان سے عرب تک پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ مولانا سے اجازت حدیث حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کا شمار کارے دارو، اس لئے عرب ممالک کے جن علماء یا شخصیتوں نے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی سے اجازت حدیث حاصل کی، ان میں سے چند مشاہیر و ممتاز ناموں کو پیش کرنے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے:

- ۱- الشیخ عبدالحلیم محمود شیخ الازہر
- ۲- الشیخ عبدالعزیز ابوعیون السود (حمص)
- ۳- الشیخ عبداللہ سراج النحلی
- ۴- الشیخ نورالدین عمر (دمشق)
- ۵- الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ
- ۶- الشیخ حسن خالد، مفتی الجمہوریۃ اللبنانیۃ
- ۷- الشیخ عبدالستار ابو غدہ (کویت)
- ۸- الشیخ علوی الماکلی (مکہ مکرمہ)
- ۹- شیخ سعدی البہاشی
- ۱۰- الشیخ محمد عوامہ
- ۱۱- الشیخ حماد الانصاری
- ۱۲- ڈاکٹر عبداللہ الجبوری
- ۱۳- الشیخ حمدی عبدالحجید (بغداد)
- ۱۴- الدکتور بشار عواد معروف (بغداد)
- ۱۵- الشیخ ابوالیسر عابدین
- ۱۶- الشیخ ایمن رشدی سوید (جدہ)
- ۱۷- سید صبحی السامرائی (بغداد)

فقہ

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کی فقہی بصیرت اہل علم و فضل کے درمیان مسلم تھی، امت کے سامنے کوئی اہم دینی مسئلہ پیش آتا تو مولانا کی طرف رجوع کرنا ضروری سمجھا جاتا، خواہ وہ بیمہ کا مسئلہ ہو یا امارت شرعیہ سے متعلق بحث ہو۔

سہارنپور میں ۱۹۴۵ء میں جب جمعیت علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس ہوا، تو اس میں امارت شرعیہ کی بحث بھی چھڑی، ایک طرف جمعیت علماء ہند کی مجلس عاملہ ہندوستان میں امارت شرعیہ کا قیام چاہتی تھی اور اس سلسلہ میں اس نے اپنی تیاری بھی مکمل کر لی تھی، لیکن دوسری جانب علماء سہارنپور کو اس سے سخت اختلاف تھا، دونوں کو اپنے موقف پر اصرار تھا۔ اس جلسہ کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کر رہے تھے، جب مولانا مدنی نے یہ صورت حال دیکھی تو ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کو آئندہ کے لئے ملتوی کر دیا۔ اور متفقہ طور پر یہ تجویز پاس کرائی کہ جب بھی مجلس عاملہ کے سامنے کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ مولانا اعظمیٰ اس اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔

۱۹۶۴ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے متفقہ طور پر ایک ایسی تحریر مرتب کی تھی، جس میں بیمہ کے جواز کا رد بیان تھا۔ یہ تحریر مولانا اعظمیٰ کے پاس تصویب کے لئے بھیجی گئی، مولانا نے اس تحریر کا تنقیدی جائزہ لیا اور جواز سے متعلق جو

شواہد پیش کئے گئے تھے، انہیں ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے بیمہ کو ناجائز بتایا اور مختصر نوٹ کے ساتھ یہ تحریر واپس کر دی۔ علماء اور مفتیان کرام نے مولانا کے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا۔

مولانا اعظمی حنفی فقیہ تھے، اپنے مسلک میں بہت پختہ اور غیر متزلزل تھے، مولانا کی فقہی بصیرت پر علماء و فقہاء کے اعتماد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم کا منصب خالی ہوا اور اس منصب جلیل کے شایان شان مفتی جلیل کی تلاش شروع ہوئی تو مجلس شوریٰ دارالعلوم کی نگاہ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی پر جا گئی، مجلس نے آپ کے نام کی تجویز پاس کی اور یہ طے ہوا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب موعود جائیں گے۔

چنانچہ مولانا مدنی اور قاری طیب صاحب مولانا اعظمی کے یہاں تشریف لائے اور مولانا کے سامنے اپنا مقصد سفر رکھا، لیکن مفتاح العلوم کے ارباب اہتمام اور مسو کے عوام کو اسکی بھنک لگ گئی اور وہ اس پر راضی نہ ہوئے کہ مولانا اعظمی ان سے جدا ہوں؛ لہذا مولانا نے ان دونوں بزرگوں سے معذرت فرمائی۔^۱

اسیر اور وی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

”ہندوستان کی ان دو مایہ ناز شخصیتوں نے مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے عظیم منصب کی پیش کش کر کے اس حقیقت کا اظہار فرمادیا کہ عہد حاضر میں مولانا اعظمی جیسا کوئی فقیہ اور صاحب بصیرت ہندوستان کی

۱۔ المآثر ج: ۳، ش: ۲، بحوالہ بیمہ اور اسکا شرعی حکم ص ۹، ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۵

۲۔ محدث اعظمی نمبر ص ۱۶۰، ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۸-۹، حیات ابوالہاثر

ص ۱۹۹-۲۰۳، دارالعلوم دبیات نمبر ص ۵۴-۱۵۵، زندگی کا علمی سفر ص ۴۳

سرزمین پر نہیں ہے۔“

آئندہ صفحات میں مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی فقہی خدمات پیش کی جا رہی ہیں۔

الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ

طلقات ثلاث کے وقوع کا مسئلہ فقہی مباحث میں ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے۔ یعنی کوئی شخص اگر ایک مجلس میں تین طلاقیں دے تو وہ تین کی تینوں واقع ہو جائیں گی یا ایک؟ اہل حدیث (غیر مقلدین) کا مسلک یہ ہے کہ ایک طلاق واقع ہوگی۔ لیکن احناف بلکہ جمہور ائمہ تین طلاق کے وقوع کے قائل ہیں۔ بڑے ادب کے ساتھ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ موجودہ دور میں یہ مسئلہ طلاق اختلافی سے نزاعی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اہلحدیث حضرات نے اس مسئلہ پر خوب دعوتِ سخن دی، اور مناظرے کی مجالس گرم کیں۔ ضرورت تھی کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کی صاف ستھری شکل پیش کی جائے؛ تاکہ حلال و حرام کی حد بندی ہو سکے اور امتِ امتلاء و آزمائش سے محفوظ رہ سکے۔

غالباً ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے کہ بنارس میں ایک حنفی المسلمک نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دیں، اسکے بعد حنفی عالم سے اس بابت مسئلہ دریافت کیا، حنفی عالم نے جواب دیا کہ رجعت جائز نہیں، پھر اہلحدیث عالم کے پاس گیا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ رجعت جائز ہے، چنانچہ اس نے رجعت کر لی۔ ان عالم صاحب نے باقاعدہ اہلحدیث مفتی کا فتویٰ بھی پیش کیا۔ بنارس کے حنفی حضرات نے اس فتوے کو مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے پاس منو بھیجا اور نفس مسئلہ

و حقیقت حال دریافت کی۔

مولانا الاعظمی نے نفس مسئلہ کی تحقیق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کی جو ہمارے سامنے ”الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلاقات المجموعہ“ کے عنوان سے موجود ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں تین ابواب قائم کئے ہیں، پہلے باب میں یہ ثابت کیا کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں خواہ وہ ایک ہی لفظ سے ہوں یا متعدد الفاظ سے، واقع ہو جاتی ہیں اور رجعت شرعاً ممکن نہیں۔

مولانا الاعظمی نے آٹھ حدیثیں پیش کیں جنکی رو سے بیک مجلس تین طلاقیں دینے پر تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔ مولانا ان احادیث پر ہونے والی جرح کا دفعیہ بھی کرتے چلتے ہیں، اور حدیث کی قوت و صحت پر مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس باب میں ائمہ اربعہ، امام اوزاعی، امام ثوری، امام اسحاق، امام بخاری، بلکہ جمہور صحابہ و تابعین و جمہور ائمہ سلف و خلف کا اس مسئلہ پر اجماع ثابت کیا ہے۔ مولانا کی پیش کردہ حدیثوں میں سے ایک حدیث درج کی جاتی ہے۔

امام شافعی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور دارقطنی وغیرہ نے حضرت رکانہؓ سے روایت کیا ہے:

”انہ طلق امرأته البتہ فأتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فقال ما أردت قال واحدة قال اللہ قال اللہ قال هو علی ما

أردت۔“

یعنی حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو لفظ ”بتہ“ کے ساتھ طلاق دی اسکے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور نے دریافت فرمایا کہ اس لفظ سے تم نے کیا ارادہ کیا انہوں نے کہا ایک طلاق کا آپ نے کہا بخدا؟ انہوں نے کہا بخدا! آپ نے فرمایا کہ جو تم نے ارادہ کیا وہی ہے۔ اس حدیث کے دوسرے طریق میں

ہے کہ آپ نے ان سے تین بار قسم لی۔
اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ:

”رکائے سے بار بار قسم دے کر یہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ مآ
آردت إلا واحدة خدا کی قسم کھا کر کہو کہ ایک کے سوا اور کچھ ارادہ نہیں
کیا ہے یہ سوال تو جب ہی درست ہو سکتا ہے جب ایک کا ارادہ کرنے
سے ایک اور تین کا ارادہ کرنے سے تین واقع ہوں اور اگر دونوں
صورتوں میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہو تو ایک اور تین میں سے ایک کی
تعمین کرانا بے معنی بات ہوگی وحاشا جنابہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک۔“

ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، حافظ ابن حجر، ابن معین اور انکے علاوہ اور بھی کئی
ائمہ جرح و تعدیل نے مندرجہ بالا حدیث کی تحسین و تصحیح اور اسکے رواۃ کی توثیق کی
ہے۔ مولانا اعظمی نے ان ائمہ کی تصریحات کو نقل کیا ہے۔

دوسرے باب میں جو لوگ ایک مجلس میں تین طلاق کو رجعی قرار دیتے ہیں،
مولانا نے انکے دلائل کا جائزہ لیا اور غیر مقلدین کی طرف سے پیش کی جانے والی
حدیثوں کی اسناد و مفہوم پر کلام کرتے ہوئے انہیں ناقابل استدلال ثابت کیا۔ مولانا نے
پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، یہ بحث اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

الحدیث حضرات جن دو حدیثوں کی بنیاد پر ایک مجلس کی تین طلاقیں کو
رجعی قرار دیتے ہیں وہ یہ ہیں:

پہلی حدیث: ابو الصہبہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ
عہد نبویؐ اور عہد صدیقی کے ابتدا میں تین طلاق ایک تھی، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا

کہ ہاں لیکن جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کی تو حضرت عمرؓ نے تیوں کو نافذ کر دیا۔ (مسلم شریف)

مولانا عظمیٰ کے بقول یہ حدیث ناقابل استدلال ہے کیونکہ:-

۱- یہ روایت وہم و غلط ہے، چنانچہ محدث ابن عبد البر نے فرمایا: "هذه الرواية وهم و غلط" یعنی یہ روایت وہم و غلط ہے۔ (الجوہر النقی ص ۱۱۳)

۲- یہ روایت شاذ و منکر ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل اور بیہقی کے مطابق ابن عباسؓ کے جملہ شاگرد اسکے خلاف روایت کرتے ہیں۔ (نیل الاوطار ۶/۱۵۷، اعلام الموقعین ۲/۲۶، فتح الباری ص ۲۹۱)

۳- علامہ ابن العربی مالکی نے کہا کہ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے۔ پس وہ اجماع پر کیسے ترجیح پاسکتی ہے۔ (فتح الباری ۹/۲۹۱)

۴- امام شافعی و نووی کے مطابق یہ حکم منسوخ ہے۔ (فتح الباری ۹/۲۹۱)

۵- اس روایت کا مدار طاؤس پر ہے اور انکی نسبت علامہ ابو جعفر بن النحاس نے "الناسخ والمنسوخ" میں لکھا ہے کہ طاؤس اگرچہ مرد صالح ہیں مگر ابن عباسؓ سے انکی کئی روایتیں منکر و نامقبول ہیں۔

۶- روایت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے خود اسکا جواب دے دیا ہے کہ کبھی کسی وجہ سے ایسا ہوتا تھا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کے خلاف پراجماع ہو گیا۔

۷- علامہ قرطبی کے مطابق یہ روایت مضطرب ہے۔ (فتح الباری ۹/۲۹۲)

۸- قابل توجہ ہے کہ طاؤس نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے اور خود ابن عباسؓ نے اسکے خلاف فتوے دیئے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ روایت یا تو کسی راوی کا وہم ہے یا پھر منسوخ ہے۔ اس

حدیث پر کلام کرتے ہوئے اخیر میں مولانا لکھتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے بیٹوں کو نافذ کیا اور اسکا اعلان فرمایا تو کسی صحابی نے نہ ٹوکا، کسی نے مخالفت نہ کی اور کسی نے نہ بتایا کہ یہ عہد نبوی و عہد صدیقی کے خلاف ہے۔

دوسری حدیث: حضرت رکانہؓ اپنی بیوی کو طلاق دے کر بہت پچھتائے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کتنی طلاق دی ہے، انہوں نے کہا تین۔ آپ نے پوچھا کہ ایک جگہ میں؟ کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ہی ہے اگر تمہارا جی چاہے تو رجعت کرلو۔ مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں مولانا اعظمی فرماتے ہیں کہ:

”کسی محدث نے مسند احمد والی حدیث کی تصحیح یا تحسین نہیں کی ہے بلکہ محدثین نے اسکو حد درجہ کمزور بتایا ہے۔“

مولانا کے اس دعوے کی دلیل ملاحظہ ہو:

۱- حافظ ابن حجر نے ”تلخیص“ میں اس حدیث کو ذکر کر کے فرمایا: ”وہو معلول بضاً“ یعنی مسند احمد والی حدیث بھی بہت مجروح و ضعیف ہے۔ (ص ۳۱۹)

۲- حافظ ذہبی نے بھی اس کو داؤد بن الحصین کے مناکیر میں شمار کیا۔

۳- رجال اسناد میں محمد ابن اسحق ہیں، حافظ ذہبی نے انکے بارے میں محدثین کی سخت ترین جرحیں نقل کر کے اپنا فیصلہ لکھا کہ انکے حافظہ میں کچھ خرابی ضرور ہے اور جس چیز کے روایت کرنے میں وہ تنہا ہوں وہ منکر ہے۔

حضرت رکانہؓ کے واقعہ طلاق میں دو روایتیں ہیں: ایک وہ جسکو حضرت رکانہؓ نے خود روایت کیا۔ جس میں یہ صراحت ہے کہ انہوں نے لفظ ”البتہ“ کے ذریعہ طلاق دی۔

مولانا اعظمی نے اس حدیث کو اپنے موقف کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے جس میں ذکر ہے کہ

حضرت رکائے نے تین طلاقیں دیں۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ دونوں روایتوں میں کون کامل طور پر صحیح اور قابل ترجیح ہے حضرت رکائے کی حدیث یا روایت ابن عباسؓ؟ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے حضرت رکائے کی ”البتة“ والی روایت کی ترجیح کے سلسلہ میں ائمہ و حفاظ حدیث کی آراء نقل کی ہیں، ان میں سے صرف دو قول پیش خدمت ہیں:

۱- امام ترمذی یا امام بخاری نے فرمایا کہ: أصحها أنه طلقها البتة وأن الثلاث ذكورت فيه على المعنى“ یعنی صحیح تر بات یہ کہ رکائے نے لفظ ”بتة“ سے طلاق دی اور تین کا ذکر روایت بالمعنی ہے۔ ابن القیم نے زاد المعاد اور مولانا شمس الحق صاحب الہمدیث نے تعلیق مغنی میں ذکر کیا ہے۔

۲- حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں مسند احمد کی یہ حدیث ذکر کر کے ابوداؤد کا کلام نقل کیا اور اسکی تائید کی۔ انکے الفاظ یہ ہیں: ”ان أبا داؤد رجح أن ركانة إنما طلق امرأته البتة كما أخرجہ هو من طريق ال بيتہ وهو تعليل قوي“ یعنی ابوداؤد نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اسکے سوا کوئی اور بات نہیں کہ رکائے نے اپنی بیوی کو لفظ ”بتة“ سے طلاق دی جیسا کہ انہوں نے خود رکائے کے اہل بیت سے روایت کی ہے اور یہ قوی تعلیل ہے۔ (فتح الباری ج: ۹ ص ۲۹)۔

باب سوم میں اہل حدیث حضرات کی غلط بیانیوں کی نشاندہی فرمائی۔ مخالفین کے اس قول پر کہ حضرت علیؓ و ابن مسعودؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، زبیرؓ و جابرؓ اور دیگر بڑے بڑے صحابہ ایک مجلس کی تین طلاقیں کو ایک ہی کہتے تھے، مولانا الاعظمی کہتے ہیں کہ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ایسی صریح غلط بیانی کی جرأت لوگوں کو کیونکر ہوئی، جبکہ فریق مخالف کے امام مقبول علامہ ابن القیم نے اغاثۃ اللہقان

(ص ۱۷۹) میں صاف طور پر لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے سوا اور کسی صحابی سے اس قول کی نقل صحیح ہم کو معلوم نہیں ہے۔

مولانا نے اسی باب میں اس پر بھی بحث کی کہ حضرت عمرؓ کا امضائے ثلاث یعنی تین طلاقوں کا نافذ کرنا، ان کی اپنی ذاتی رائے کی بنا پر نہ تھا اور نہ ہی وہ سیاسی و تعزیری حکم تھا بلکہ سارے صحابہ ان کے ساتھ تھے، سبھی کی تائید اور موافقت تھی۔ آگے چل کر مولانا نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب روایت پر کلام کر کے اسے غیر معتبر ثابت کیا اور اسکے خلاف حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ نقل فرمایا۔ مولانا نے آثار صحابہ بھی نقل کئے اور ان کی روشنی میں تین طلاقوں کے وقوع کو ہی صحیح قرار دیا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا اعظمی نے وقوع طلاق کے سلسلہ میں صحابہ کے مزید فتاویٰ و آثار جمع کئے تھے، اگرچہ اس مسودہ کی تہذیب مولانا کی حیات میں ہی ہو گئی تھی، لیکن شاید کچھ اضافہ کے پیش نظر اسکی اشاعت اعلام مرفوعہ کے ساتھ نہ ہو سکی تھی۔ جدید ایڈیشن میں ادارہ نے اس اہم فقہی مواد کو بھی ملحق کر کے شائع کیا۔ اس کتاب کے آخر میں تابعین کے فتاویٰ پیش کیے گئے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی اس کتاب کو دیکھ کر انکے استحضار علم، زیر بحث مسئلہ سے متعلق تمام گوشوں سے واقفیت اور ان پر مضبوط گرفت، فریق مخالف کے دلائل کی کمزوریوں سے باخبری وغیرہ تمام چیزوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سب سے اہم اور قابل داد بات تو یہ ہے کہ اتنے اہم اور مشکل مسئلہ کو اردو زبان میں اتنی آسانی سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری کے سامنے مسئلہ کی پوری نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

”الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلاقات المجموعہ“ کو دنیا نے علم و فن نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ مسلم شریف کے درس کے دوران جب حضرت عبداللہ

بن عباسؓ کی وہ حدیث آتی جس کو اہل حدیث حضرات بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ طلبہ سے فرماتے:

”اس حدیث کی بہترین توضیح و تشریح کے لئے مولوی حبیب الرحمنؒ اعظمی کی اعلام مرفوعہ دیکھو، اس سے بہتر توضیح کسی نے نہیں کی، یا یہ فرمایا کہ اس سے بہتر توضیح میں بھی نہیں کر سکتا۔“^۱

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کتاب کی توصیف میں فرماتے ہیں کہ:

”اردو خواں حضرات کے لئے آسانی ہوگی کہ اس مسئلہ پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کا رسالہ ”الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ“ ملاحظہ فرمائیں جو اس موضوع پر سلجھا ہوا اور پر مغز رسالہ ہے۔“^۲

دیوبند سے شائع ہونے والا ایک قدیم علمی رسالہ ”قاسم العلوم“ اعلام مرفوعہ پر تبصرہ کرتا ہے:

”مولانا موصوف نے جنکی علمی و مذہبی کاوشوں نے بہت سے مسائل کو حل کیا ہے اس مسئلہ پر احادیث و آثار صحیحہ سے بدلائل قویہ کلام کر کے اوسکو واضح و مبہین کر دیا ہے۔“^۳

اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، یہ رسالہ مجلہ ”العدل“ گوجرانوالہ ۱۹۳۳ء کے چار شماروں میں بھی قسط وار شائع ہوا، اسکا تیسرا ایڈیشن جو راقم الحروف کے پیش نظر ہے ۱۹۹۹ء میں دارالماثر الاسلامیہ منٹو سے شائع ہوا۔

۱۔ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۱۸۳، حیات ص ۵۳۹

۲۔ تاریخ دعوت و عزیمت ۱۰۵:۲ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ طبع اول ۱۳۷۵ھ ۱۹۵۷ء۔ بعد کے ایڈیشن میں یہ اقتباس محذوف ہے۔

۳۔ قاسم العلوم ج: ۳ ش: ۳ ص ۳۹

الازہار المربوعہ فی رد الآثار الممتبوعہ

اعلام مرفوعہ جب منظر عام پر آئی تو منو اور بنارس کے اہلحدیث علماء کے باہمی اشتراک (Collaboration) سے اسکا جواب دیا گیا۔ مسلم اہلحدیث گزٹ میں 'اعلام' کے رد میں لکھا گیا۔ مولانا عبد اللہ شائق نے "الآثار الممتبوعہ والاحکام المشروعہ لرد الاعلام المرفوعہ" کے نام سے ایک مفصل کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں انہوں نے حنفی عالم مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے موقف کا رد فرمایا اور بڑے پُر زور انداز سے مجلس واحد میں دی گئی تین طلاقوں کو حکماً ایک طلاق مانتے ہوئے رجعت کو جائز ٹھہرایا۔

اہلحدیث عالم نے اپنے موقف کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا اور مولانا الاعظمی کا رد کیا۔ اہلحدیث عالم نے "اعلام مرفوعہ" کے جواب "آثار ممتبوعہ" میں سخت انداز نگارش اختیار کیا ہے۔ مؤلف آثار اپنی کتاب کی ابتدا ہی میں صفحہ تین پر تحریر فرماتے ہیں:

"ہر شخص کو اپنے مسائل کی چھان بنان (کذا) اور اسکی اشاعت کا حق ہے لیکن یہ اسی وقت تک محمود ہے جب تک مسئلہ (کذا) مسئلہ کی صورت میں رہے اور اگر اس سے مقصود نام و نمود اور ہنگامہ آرائی ہو تو یہی فعل انتہائی مذموم ہو جاتا ہے۔ مؤلف نے اسی دوسری صورت کو اختیار کر کے بلاوجہ فتنہ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے۔"

اسی صفحہ میں آگے مؤلف آثار مزید لکھتے ہیں:

"اپنے ہمنواؤں سے وہ دل آزار، شرانگیز نوٹ لکھوایا گیا کہ انسانیت کبریٰ لرزہ بر اندام ہو گئی۔"

۱۶/ صفر ۱۳۵۴ھ کو عبداللہ شائق نے اپنی کتاب 'آثار متبوعہ' کی ایک کاپی مؤلف 'اعلام مرفوعہ' مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے پاس ارسال کی۔ مولانا نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کا جواب لکھنا شروع کیا، چھ ماہ میں مولانا کا جوابی رسالہ تیار ہو گیا۔ مولانا نے اسکو 'الازہار المربوعہ' فی ردالآثار المتبوعہ کے نام سے موسوم کیا۔ یہ رسالہ تین اجزاء میں منقسم ہے۔ باب اول میں وقوع ثلاث مجموع کے دلائل پر مجیب کے اعتراضات کا جواب ہے، باب دوم میں اعلام مرفوعہ کے دوسرے باب جس میں غیر مقلدین کے دلائل پر بحث کی گئی ہے، کے متعلق مجیب کے اعتراضات و اشکالات کا مفصل جواب ہے، باب سوم میں آثار متبوعہ کے تیسرے باب کا جواب ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

- ۱۔ چونکہ صاحب آثار نے بزعم خویش ہم کو ہمارے مسلمات سے جواب دینے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم نے بھی اس کا التزام کیا ہے۔
- ۲۔ بہت سے جوابات بنا کر مسلمات مجیب صرف الزامات ہیں ان کا جواب دیا جائے تو ذرا سوچ سمجھ کر۔

۳۔ مجیب نے جن مباحث کو لیا ہے میں نے بھی انہیں پراقتصار کیا ہے۔
 "الازہار المربوعہ" میں مولانا پہلے 'اعلام' کی عبارت پیش کرتے ہیں، اسکے بعد اس پر مؤلف آثار کے اشکالات نقل کرتے ہیں اور پھر جواب دیتے ہیں۔ اعلام مرفوعہ پر ہونے والے ایک ایک اعتراض کا مولانا نے جواب دیا اور حنفی نقطہ نظر کو روایت و درایت کے مطابق قرار دیا۔

'الازہار المربوعہ' میں احادیث و آثار پر بحث کی گئی اور فنی نقطہ نظر سے ہونے

والے اشکالات کے جواب دیئے گئے۔ اسکے ساتھ ساتھ الزامی اور منطقی جواب کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ چنانچہ کہیں کہیں ہم مناظرانہ لب و لہجہ کی جھلک بھی پاتے ہیں۔ عبداللہ شائق نے ”آثار مبعوعہ“ میں سخت انداز تحریر اختیار کیا تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اور یہ کتاب ”الازہار المربعہ“ اسکے جواب میں ہے، اس لئے مولانا کے بھی انداز نگارش میں کہیں کہیں تلخی کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مولانا الاعظمی نے بڑی صاف گوئی سے اسکا اعتراف کرتے ہوئے اظہارِ افسوس بھی کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

”مجھے افسوس ہے کہ بعض بعض مقامات میں ”تلخ نوائی“ کا اثر بھی آپ چائیں (کذا) گے، مگر آثار مبعوعہ کو سامنے رکھنے کے بعد آپ خود بخود مجھے معذور تصور فرمائیں گے۔“

تین طلاقوں کے بیک وقت وقوع کے مسئلہ پر ”ازہار مربعہ“ ایک تحقیقی، تنقیدی اور جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کی حیثیت تحقیقی تو اس طریقے سے ہے کہ وقوع ثلاث مجموع کے موضوع پر جتنے دلائل ہو سکتے تھے انکی پوری جانچ پرکھ کے بعد یہ رسالہ لکھا گیا۔ اور تنقیدی بایں طور کہ ان دلائل پر ہونے والے اعتراضات یا بیک مجلس تین طلاقوں کے ایک طلاق مراد لینے میں فریق مخالف کی طرف سے پیش کئے جانے والے دلائل و شواہد کا اس کتاب میں تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا اور پھر حنفی نقطہ نظر کو روایت و درایت کے قریب پایا گیا۔

یہ کتاب حجم کے بڑے ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہے، اسکا پہلا حصہ ۱۵۱ صفحات پر مشتمل ہے، حصہ اول و کثور یہ اسٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوا اور دوسرا حصہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔

الازہار المربعہ پر علامہ سید سلیمان ندوی تبصرہ کرتے ہوئے تحریر

فرماتے ہیں:

”اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنہوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ ”الابحاث فی التعلیقات الثلاث“ لکھا ہے۔“

احکام النذر لاولیاء اللہ و تفسیر ما اہل بہ لغیر اللہ

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ واتباعہ اجمعین۔

چونکہ نذر لغیر اللہ کے مسئلہ میں بعض اشخاص نے بہت الجھاؤ پیدا کر دیا ہے اس لئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات از راہ کرم ایسی وضاحت سے ارشاد فرمائے کہ الجھاؤ دور ہو جائے۔

(۱) ما اہل بہ لغیر اللہ کی صحیح تفسیر کیا ہے؟ (۲) اولیاء کرام کے نام پر نذروں کا کیا حکم ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جن کے جواب میں رسالہ ”احکام النذر لاولیاء اللہ و تفسیر ما اہل بہ لغیر اللہ“ معرض وجود میں آیا جس کے مصنف مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ہیں۔ اس کتابچہ میں مندرجہ ذیل مباحث ہیں:

- ۱- ما اہل بہ لغیر اللہ کی مدلل تفسیر و تشریح۔
- ۲- اولیاء اللہ کے لئے مرجعہ نذروں کے احکام شرعی کا بیان۔
- ۳- بدعت نواز مصنفین کے موقف کا مدلل رد۔

مضامین اور عنوانات کے لحاظ سے اس رسالہ کی حیثیت سہ رخنی ہے: تفسیر، فقہ اور مناظرہ۔ چونکہ نذر لاولیاء اللہ کی حمایت میں لکھنے والے مولانا سید امیر علوی

پنجابی کی کتاب ”ارشاد الحق“ کا اس رسالہ میں جواب دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں کہیں کہیں مناظرانہ اسلوب نگارش اور طرز ادا بھی اپنایا گیا، اس لئے بعض تذکرہ نگاروں نے اس رسالہ کو مناظرہ کی شق میں رکھا ہے۔ لیکن ہم اس کتاب کا تعارف عنوان ”فقہ“ کے ضمن میں پیش کرتے ہیں، کیونکہ مولانا الاعظمی کا فقہی رنگ اس کتاب میں غالب نظر آتا ہے۔

مولانا نے ”ما اھل بہ لغیر اللہ“ کی تشریح کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ:
 ”جملہ مفسرین نے ما اھل بہ لغیر اللہ کے حرام ہونے کی علت تقرب غیر خدا سمجھی ہے اور اس فقرے کا موڈی سب کے نزدیک یہ ہے کہ جس جانور کے خون بہانے سے غیر خدا کے ساتھ تقرب کا قصد کیا گیا ہو۔“
 مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کئی شواہد پیش کئے، یہاں پر ان میں سے صرف دو کو نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ ابن کثیر، نیشاپوری، صاحب روح البیان اور فخر الدین رازی وغیرہم نے اس آیت کی تفسیر کے تحت ذکر کیا کہ کوئی مسلمان بقصد تقرب غیر خدا کوئی جانور ذبح کرے تو مرتد ہو جاتا ہے۔ یہ جزئیہ اس مقام پر اسی وقت چسپاں ہو سکتا ہے، جب ما اھل بہ لغیر اللہ کی یہی مراد ہو کہ جو تقرب غیر خدا کے لئے ذبح کیا گیا ہو۔

۲۔ علامہ شیخ زادہ نے حاشیہ بیضاوی میں لکھا کہ وما اھل بہ لغیر اللہ..... کا مطلب یہ ہے کہ جو اقسام و طوائف کے لئے ذبح کیا گیا ہو۔ اور اسی کے متصل مزید لکھتے ہیں کہ جو مسلمان بنیت تقرب غیر خدا کوئی جانور ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور اس کا ذبیحہ مردار کے حکم میں ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے مولانا الاعظمی کا موقف یہ ہے کہ مخلوق کے واسطے نذر ماننا

جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہوتی۔ لہذا اگر اولیاء کے نام کی نذریں انکے تقرب و تعظیم کے مقصد سے مانی جاتی ہیں تو انکی حرمت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مولانا نے شامی، درمختار، بحر الرائق، عالمگیری سے عبارتیں اور اقتباسات پیش کر کے اپنے موقف اور رائے کو ثابت کیا ہے۔ اور بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے کہ جو جانور بقصد تقرب غیر خدا ذبح کیا جائے چاہے ذبح کے وقت خدا ہی کا نام کیوں نہ لیا جائے وہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے۔ مولانا نے نذر اولیاء کو جائز قرار دینے والے ”ارشاد الحق“ کے مصنف کی تضاد بیانی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اسکی مختصر تفصیل یہ ہے کہ حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ ”صراط مستقیم“ میں اولیاء کے بارے میں عوام کے اعتقاد کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

”بعض لوگ خدا کو اور بزرگوں کو تقرب و رضا جوئی کے برابر مرتبہ میں رکھتے ہیں..... بعض لوگ بزرگوں کی رضا جوئی مقدم رکھتے ہیں اور بعض ان کو مستقل حاجت روا جان کر خدا سے التجا کرنے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔“

سید امیر علوی نے ”ارشاد الحق“ صفحہ ۴۴ میں مولانا اسماعیل شہیدؒ کی اس تحریر کو مسلمانوں کے ساتھ بدگمانی و بدظنی قرار دیا۔ اس پر مولانا الاعظمی نے ”ارشاد الحق“ صفحہ ۷۷ کی ایک عبارت پیش کی جس میں واضح طور پر مولانا سید امیر علوی نے خود اقرار کیا ہے کہ بعض لوگ بزرگوں کو مستقل بالذات، خدا کا ساجھی، اور مقرب حقیقی بھی سمجھتے ہیں۔ مولانا اعظمی ”ارشاد الحق“ سے یہ عبارت ”بے شبہ بعض جاہل اس قسم سے نذر مانتے ہیں۔“ نقل کر کے سید امیر علوی کے پہلے بیان کی تردید خود

۱۔ صراط مستقیم ص ۵۷ بحوالہ الفرقان شوال و ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ ص ۸۷

۲۔ ارشاد الحق ص ۷۷ بحوالہ احکام النذر لاولیاء اللہ (الفرقان شوال و ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ ص ۸۶)

انہیں کی کتاب سے پیش کرتے ہیں۔

یہاں مولانا نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ حضرت شہید اور سید امیر علوی کی عبارتوں کے مفہوم باوجود یکہ ایک ہیں لیکن صرف اس لئے کہ ایک صحیح بات حضرت شہید کے قلم سے نکلی اس لئے اہل بدعت کو قبول نہیں، اور اسے بدگمانی قرار دیا گیا۔ مولانا نے سید امیر علوی کی ایسی کئی تضاد بیانیوں کو نقل کیا ہے کہ ایک جگہ جس چیز کا انکار کرتے ہیں خود دوسری جگہ اسی کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں۔ مولانا الاعظمیٰ نے نذر اولیاء سے متعلق اہل بدعت کے حیلہ حوالوں کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔

مولانا نے اس رسالہ میں نذر اولیاء کے اقسام اور اسکی شکلوں کو ذکر کیا، اسی کے ساتھ ساتھ اشیاء نذر کا بھی حکم بیان فرمایا اور نذر سے متعلق مستند حوالوں سے متفرق مسائل بھی جمع کئے ہیں۔ اور ان بدعت نواز مصنفین پر سخت تنقید کی ہے جو نذر اولیاء کے سلسلہ میں صاف اور پاکیزہ موقف نہیں اختیار کرتے اور مغالطے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اس رسالہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ”نذر اولیاء“ کے سلسلہ میں مستند فقہی مراجع در مختار، شامی، بحر الرائق اور عالمگیری کے فتاویٰ اور تفسیر میں علامہ قونوی، ابن کثیر، علامہ شیخ زادہ، صاحب روح البیان اور فخر الدین رازی کی تفاسیر کو سامنے رکھ کر بہت مدلل انداز میں اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ نذر سے متعلق تمام جزیوں کو اس پندرہ صفحے کے مختصر رسالہ میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا الاعظمیٰ نے اس مسئلہ کی پیچیدگیوں اور گتھیوں کو بڑے سلیقہ سے سلجھایا ہے اور اسکی ایک صاف ستھری شکل ناظرین یا قارئین کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ رسالہ مجلہ الفرقان بریلی بابت ماہ شوال، ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا۔

رکعات تراویح

رکعات تراویح کی تعداد تقریباً ڈیڑھ دو سو برس سے امت مسلمہ کے درمیان اختلافی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ حنفیہ نیز مذاہب ثلاثہ اور دیگر مذاہب کے متبعین میں رکعت تراویح کے قائل ہیں۔ ایک طبقہ جسے ہم اہل حدیث یا غیر مقلد کہتے ہیں رکعات تراویح کو آٹھ تک محدود رکھنے پر مصر ہے، دونوں جانب سے اپنی اپنی تحقیقات پیش کی گئیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا، اور ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ انکے مطابق ساڑھے بارہ سو برس تک تمام مسلمانان اہل سنت میں اور میں سے زائد ہی کو سنت اور قابل عمل سمجھتے رہے۔ ساڑھے بارہ سو برس کے بعد فرقہ کھل حدیث نے یہ جدید انکشاف کیا۔ مولانا نے اس رسالہ میں احادیث و آثار، تعامل صحابہ اور تاریخ سے ماخوذ شہادات سے ثابت کیا کہ تراویح کی رکعات میں ہیں۔ اپنے موقف کے سلسلہ میں صحابہ، تابعین، اور ائمہ کے عمل کا ذکر کیا کہ مکہ معظمہ میں حضرت عطاء بن رباح کے زمانہ تک میں پر عمل تھا، نافع بن عمر کے بیان کے مطابق ابن ابی ملیکہ ہم کو رمضان میں میں رکعات پڑھاتے تھے۔ امام شافعی کے بموجب میں پر عمل تھا، عبداللہ بن مسعود بھی میں ہی پڑھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ اربعہ مالک، شافعی، اور امام احمد رحمہم اللہ کی کتب فقہیہ میں سے کسی میں بھی آٹھ کا ثبوت نہیں ملتا! ان ائمہ کے علاوہ سفیان ثوری اور داؤد ظاہری کے یہاں بھی آٹھ پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ میں پر ہی عمل ہوا۔ مولانا بڑے وثوق کے ساتھ باند از تحدی فرماتے ہیں کہ:

”آٹھ پر عمل درآمد کی تصریح کہیں بھی نہیں دکھائی جاسکتی اور اس کا گھٹیا سے

گھٹیا ثبوت بھی پیش نہیں کیا جاسکتا، زیادہ سے زیادہ..... سائب بن یزید کا وہ اثر پیش کیا جاسکتا ہے جس میں مذکور ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔^۱

اسکے بعد مولانا اعظمی سائب بن یزید کے اس اثر میں داخلی شہادات کی بنیاد پر اضطراب ثابت کر کے اس اثر کو ناقابل ثبوت قرار دیتے ہیں۔ مولانا اعظمی نے ”بیس رکعات پر اجماع کی بحث“ کا عنوان قائم کر کے عہد فاروقی میں بیس پر اجماع کے ثبوت کو مولانا عبد الرحمن مبارکپوری کے باطل قرار دینے پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔

مولانا اعظمی نے اس اجماع کو دلائل سے ثابت کیا اور ائمہ کے اقوال نقل کئے، مثلاً حافظ ابن عبد البر مالکی جو اہلحدیث کے یہاں بڑے محقق مانے جاتے ہیں، نے بھی بیس پر عمل کا ذکر کیا ہے، امام نووی شافعی نے لکھا: ”ثم استقر الأمر على عشرين فانه المتواتر“ (پھر بیس پر عمل قرار پا گیا، اس لئے کہ وہی سلف سے خلف تک برابر چلا آ رہا ہے۔) ابن قدامہ حنبلی نے مغنی میں لکھا: ”وهذا كالاجماع“ (یہ مثل اجماع کے ہے) ابن حجر کی شافعی نے لکھا: ”ولكن اجمعت الصحابة على أن التراويح عشرون ركعة“ یعنی صحابہ نے اجماع کیا ہے کہ تراویح کی بیس رکعتیں ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ کو بھی یہ تسلیم ہے کہ: ”وهو الذي يعمل به أكثر المسلمين“ (اسی پر اکثر مسلمانوں کا عمل ہے۔)^۲

پھر اخیر میں مولانا نے ”خاتمہ“ کا عنوان قائم کر کے اپنی تحقیق کی روشنی میں ثابت ہونے والے مسائل کو نمبر وار شمار کیا ہے:

۱۔ رکعات تراویح ص ۶-۷

۲۔ ایضاً ص ۹۲

۱۔ عہد فاروقی سے لے کر اب سے کچھ پہلے تک، اس پوری مدت میں اگر ایک آدمی آدمی بیس سے کم کے قائل بھی ہوئے تو اس پر کسی مسجد میں عمل ہونے کا ثبوت نہیں۔
 ۲۔ حضرت عمرؓ کے حکم یا انکی رضا مندی سے بیس رکعات کا ثبوت ایسا پختہ ہے کہ کسی مصنف کو انکار کی گنجائش نہیں۔

۳۔ آنحضرت ﷺ کی طرف بیس رکعت پڑھنے کی نسبت بے اصل نہیں ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تحقیق میں حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ آپ رمضان میں آٹھ رکعتوں سے زیادہ پڑھتے تھے۔

۴۔ بیس کی روایات پر اہلحدیث حضرات جو جرح قدح کرتے ہیں اصول حدیث بلکہ انکے مسلمات کے رو سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔

احناف کی طرف سے اردو زبان میں رکعات تراویح میں اس جیسی تحقیقی کتاب جس میں محدثانہ و فقیہانہ دونوں بحیثیں ہوں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ مولانا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اسکے کئی ایڈیشن نکل چکے: پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا، اسکا تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں "انجمن العلمی" منو سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ہی راقم الحروف کے پیش نظر ہے، اس میں "ضمیمہ رکعات تراویح" بھی ہے، یہ ضمیمہ دراصل اہلحدیث کی جانب سے رکعات تراویح پر کئے گئے اعتراضات کا جواب ہے۔ یہ جواب مولانا عبدالباری قاسمی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ایک مکتوب میں اس کتاب پر اظہار خیال فرماتے ہیں کہ:

"میں نے رسالہ مذکورہ کو ابتدا سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے، حضرت مؤلف ممدوح کی تحقیقات ایقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں، جنہوں نے ان بدعیوں کے خرمہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر

نہیں بنا بود کر دیا ہے۔“ ۱

مولانا سعید احمد اکبر آبادی برہان میں رکعات تراویح پر تبصرہ کرتے ہوئے

رقطراز ہیں:

”و نفس موضوع پر جو بحث کی گئی ہے وہ تو بڑی جامع اور فاضلانہ ہے ہی

اسکے علاوہ ضمناً بھی اصول جرح و تعدیل اور نقد حدیث کے متعلق بعض

بڑی کارآمد اور مفید باتیں آگئی ہیں۔“ ۲

عامر عثمانی نے اس کتاب پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرمایا:

”مولانا اعظمی نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے۔“ ۳

قاضی اطہر مبارکپوری کے بقول یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو زبان میں

پہلی اور لاٹانی کتاب ہے۔ ۴

رکعات تراویح مذیل

جب رکعات تراویح منظر عام پر آئی تو اہلحدیث حضرات (غیر مقلدین)

کی جانب سے اسکا جواب دیا گیا۔ اس جوابی کتاب کا نام ”انوار مصابیح“ تھا، اس میں

احناف کے خلاف سخت انداز تحریر اختیار کیا گیا اور دل آزار باتیں لکھی گئیں، جو سنجیدہ

علمی بحث میں کسی طرح مناسب نہ تھیں، بلکہ اس طرح کی تحریریں عوام کو دین و مذہب

سے قریب کرنے کے بجائے دور کرنے میں زیادہ زور اثر ثابت ہوتی ہیں۔ احناف

۱۔ حیات ص ۲۸۱

۲۔ برہان ج: ۳۹ ص: ۳۸۱-۳۸۴

۳۔ جلی اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۵۶

۴۔ البلاغ ج: ۳۳ ص: ۲۸

کے خلاف ”انوار مصباح“ کے جارحانہ تیور کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔
 ”یہ تنگ نظری جو صرف حلقہ دیوبند کے ضدی مولویوں ہی میں پائی جاتی ہے۔“
 ”کاش مہتمم دارالعلوم..... یہ فساد انگیز مشغلہ چھوڑ دیتے۔“
 ”حنفی مذہب بھی کیسا یتیم مذہب ہے کہ اس غریب کا سہارا یا تو کوئی
 ضعیف حدیث ہے یا کمزور توجیہ۔“

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی جنہوں نے رکعات تراویح تحریر فرمائی
 تھی، ایک بار پھر اٹھے اور ”انوار مصباح“ کے رد میں ۲۳۴ صفحات کی ایک کتاب تصنیف
 کر دی۔ مولانا اعظمی نے اس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ رکعات تراویح کی
 عبارت کو ہو بہو متن میں رکھا، اور اس پر ”انوار مصباح“ کے مصنف کے جو اعتراضات
 و اشکالات تھے، انکا جواب ذیل (حاشیہ) میں دیا۔ یہ طریقہ از ابتداء تا انتہاء ہے۔
 ”رکعات تراویح مذیل“ موضوع، مواد، دلائل و شواہد کے اعتبار سے ایک
 کامیاب کتاب ہے، رکعات تراویح کے سلسلہ میں احناف پر غیر مقلدین کی طرف
 سے جو اعتراضات اور دل آزار باتیں کی جاتی ہیں، یہ کتاب انکا شافی جواب ہے۔
 مولانا ماہر القادری نے اس کتاب کے بارے میں اپنا تاثر یہ دیا:

”جہاں تک کتاب کے عمومی تاثر کا تعلق ہے اس میں متانت، تہذیب
 اور شائستگی پائی جاتی ہے! فریق ثانی کی دلیلوں کو بڑی قوت کے ساتھ
 توڑا ہے، اور رمضان کی تراویح میں رکعات کی تعداد کے مسئلہ کو اس
 قدر وضاحت سے سلجھا کر بیان کیا ہے کہ یہ مسئلہ آئینہ کی طرح روشن
 و چمکی ہو گیا ہے۔“

۱۔ انوار مصباح، بحوالہ رکعات تراویح مذیل ص ۱۰

۲۔ ماہر القادری کے تبصرے ص ۵۲ مرتبہ طالب ہاشمی

چونکہ ”انوار مصباح“ کا لہجہ و اسلوب تحریر جارحانہ تھا! اس لئے مولانا کے انداز میں بھی فطری طور پر تلخی کے کچھ آثار ہیں، اور مناظرانہ رنگ غالب نظر آتا ہے، یہاں اس کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام مولانا عبد الباری قاسمی لکھا ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر مسعود احمد کے مطابق یہ کتاب بھی مولانا اعظمی کی ہی تصنیف کردہ ہے، جو مولانا عبد الباری صاحب کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

رکعات تراویح ندیل پہلی مرتبہ ۱۳۷۹ھ ۱۹۶۰ء میں تنویر پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

رہبر حجاج

حج کے مسائل و احکام سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، انہیں میں ایک کتاب ’رہبر حجاج‘ ہے۔ یہ کتاب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی تصنیف کردہ ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں حج کے مسائل و احکام مستند مراجع کے حوالے سے ذکر کئے ہیں، حج و زیارت میں جو آداب مسنون ہیں، اور جو امور غیر مسنون یا غیر شرعی ہیں، ان کا ذکر اس میں سہل و شستہ پیرایہ میں کیا گیا ہے، اسکے ساتھ ساتھ اس میں محققانہ بحث بھی ہے۔

”تنبیہات“ عنوان کے تحت مولانا اعظمی نے بہت سے اہم امور کی جانب توجہ دلائی ہے، مثال کے طور پر رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان معلمین جو دعا پڑھاتے ہیں، اسکے بارے میں مولانا نے لکھا کہ نہ ان دعاؤں کا پڑھنا ضروری ہے، نہ جس طریقے سے معلمین دعا پڑھاتے ہیں وہ کوئی اچھا طریقہ ہے، جو دعایا دہو حاجی خشوع خضوع سے پڑھتا ہوا طواف کرے۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ از ابتداء تا انتہاء زبان سہل ہے، مسئلہ حاجی یا قاری کے سامنے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی افادیت و اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلی دفعہ یہ کتاب ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

بیمہ اور اس کا شرعی حکم

اس مادی دنیا میں انسان نے جیسے جیسے ترقی کی، اسکی خواہشات میں اضافہ ہوتا گیا، جسکی تکمیل کے لئے اسے دولت و ثروت کی کمی محسوس ہونے لگی؛ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اور زیادہ سے زیادہ زر زمین کے حصول کے لئے اس نے فطری و غیر فطری طریقے اپنائے، حالانکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان کی خواہشات اسکی موت کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی ہیں، اس سے پہلے اس سیلاب کے تھمنے کی امید نہیں۔

مادی منفعت کے عصری وسائل میں ایک اہم وسیلہ ”بیمہ“ بھی ہے۔ اس دور میں کم ہی ایسے خوش نصیب ہیں جو اسکے دام فریب سے محفوظ ہیں۔ شیخ عبداللہ ناصح علوان کے مطابق ایک شخص کا خیال ہے کہ اسکی جان یا مال کو خطرہ درپیش ہے، اور وہ اس خطرہ کے اثرات و نتائج کو دور یا کم کرنے کے لئے ایسے لوگوں سے معاہدہ کرتا ہے جو حادثہ پیش آنے پر اسکی تلافی کی ضمانت لیتے ہیں؛ اس ضمانت کے لئے وہ ایک مشمت یا قسطوں میں معاوضہ ادا کرتا ہے۔

چنانچہ جب وہ شخص کسی حادثہ کا شکار ہوتا ہے تو یہ معاہدہ کرنے والے لوگ کئی گنا اضافہ کے ساتھ اس شخص کی رقم اسکو ادا کرتے ہیں، اسی مفہوم و معنی کو بیمہ کہا

جاتا ہے۔ بیمہ کا آغاز قرون وسطیٰ میں (۱۴۹۸ء) میں لوئڈز نامی لندن کے ایک مشہور قہوہ خانے میں ہوا۔

اسلامی شریعت کی رو سے انشورنس جائز ہے یا ناجائز، فقہاء کے درمیان مختلف فیہ بحث ہے۔ بعض علماء اسکے جواز کے قائل ہیں جیسے استاذ مصطفیٰ زرقاء، استاذ عبد الرحمن عیسیٰ، استاذ محمد یوسف موسیٰ اور استاذ علی خفیف، انکے علاوہ بعض ہندوستانی علماء کے یہاں بھی جواز کا رجحان پایا جاتا ہے۔

بیمہ کو حرام قرار دینے والے فقہاء میں اہم نام علامہ شیخ محمد بخیت المصطفیٰ حنفی، علامہ محمد ابوزہرہ، ڈاکٹر عیسیٰ عابدہ، شیخ عبد اللہ ناصح علوان اور مولانا حبیب الرحمن الاعظمی وغیرہ کے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم فقہاء میں زیادہ تر عدم جواز کے ہی قائل ہیں۔

۱۹۶۴ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ملک و ملت کے حالات کے پیش نظر بیمہ سے متعلق مسائل کا از سر نو جائزہ لیا۔ مجلس کے علماء و مفتیان کا رجحان بیمہ کے جواز کا تھا۔ چنانچہ مجلس کی طرف سے مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بیمہ کے جواز سے متعلق دلائل و امکانات کو جمع کر کے ایک مفصل تحریر مرتب کی اور اس مرتب کردہ مقالہ کو نظر ثانی کے لئے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی خدمت میں پیش کیا۔

مولانا الاعظمی نے اس مفصل مقالہ کو بغور پڑھا اور اس پر ایک نوٹ تیار کیا، مولانا نے اس تحریر میں ۲۱ جگہوں پر گرفت کی، بیمہ کے جواز سے متعلق جمع کردہ شواہد میں ہونے والے تسامحات اور غلطیوں کی نشاندہی فرمائی، اصول فقہ کی رو سے فقہاء کی

۱۔ اسلام میں بیمہ کا حکم از شیخ عبد اللہ ناصح علوان، مترجمہ ڈاکٹر مسعود احمد ص ۳۹-۴۰ (مجلد مع بیمہ اور اسکا شرعی حکم۔ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی)

۲۔ المآثر ج ۲: ۳ بحوالہ بیمہ اور اسکا شرعی حکم ص ۹، ترجمان الاسلام جنوری تا جون ۲۰۰۳ء ص ۱۳۶

مراد و معنی کی تعین و تخصیص کی، بیمہ کے جواز کے سلسلہ میں جن فقہاء کا حوالہ دیا گیا تھا ان کا دلائل کے ساتھ رد فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ مولانا بیمہ کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کے یہاں اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔

جناب مولانا تقی امینی کا مضمون تو بہت مفصل ہے، اس لئے طوالت کے خوف سے نقل کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، اور اس موقع پر مولانا کے لکھے ہوئے نوٹ سے صرف دو چار نکات پیش کئے جاتے ہیں، مولانا کی تحریر سے ہی مولانا تقی امینی کے مضمون پر بھی روشنی پڑ جائے گی، مولانا فرماتے ہیں:

۱۔ پس اندازی کے رجحان کو فطری کہہ کر ظاہر کرنا کہ وہ تمام تر محمود رجحان ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں، فطرت سلیمہ کا تقاضا وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی قولی و عملی تعلیمات سے ثابت ہوتی ہے، جو حریمانہ پس اندازی اور مسرفانہ انفاق کے درمیان ایک نہایت معتدل رجحان ہے، اور جس میں پس اندازی سے زیادہ انفاق کا عنصر نمایاں ہے۔

۲۔ بیمہ کا اہم مقصد اثاثہ جمع کر کے مستقبل کے غیر متوقع حادثات و خطرات کا مقابلہ کرنا ہے، یہ بات غایۃ الغایات کی حد تک تو کسی درجہ میں صحیح، لیکن بیمہ کی اولین غرض وہ ہوتی ہے جو ”بیمہ کی قسموں“ کے عنوان کے تحت مذکور ہے، یعنی مال یا اطراف کے امکانی نقصان کی تلافی۔

۳۔ دارالاسلام و دارالحرب کی بحث کو حل کی بنیاد بنانا مناسب ہو یا نہ ہو، سوال یہ ہے کہ بیمہ اگر ربوی معاملہ یا قمار ہے تو دونوں جگہ اس کا حکم یکساں ہے یا الگ الگ؟

۴۔ من ضمن عن آخر خراجہ کا ترجمہ صحیح نہیں ہے، لہذا جو نتیجہ اس سے اخذ کیا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جو خراج کسی پر واجب ہے یا جو نوائب ”وقتی ٹیکس“ اس پر عائد ہوتے ہیں، یا جو قیمت اسکے ذمہ ہو، اسکی ضمانت کوئی

لے لے تو جائز ہے۔ اس عبارت کی شرح اور نواب وغیرہ کی تحقیق کے لئے ہدایہ (۱۰۹/۳) کی طرف رجوع کیجئے۔

مولانا نے اپنے اس نوٹ کے ساتھ ایک مکتوب بھی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو ارسال فرمایا تھا، اس خط کی ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:

”محبی الفاضل! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بیمہ والی تحریر پر اپنے نوٹ بھیج رہا ہوں، میں نے پہلا خط صرف اس لئے لکھا تھا کہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ اظہار اختلاف، بدمزگی پیدا ہونے کا سبب نہ بنے گا؛ باقی رہا قبول کرنا، تو کل کیا، آپ ایک بات بھی قبول نہ کیجئے، میں برائہ مانوں گا.....“ ۳

بیمہ پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کا یہ نوٹ تحقیق کی دنیا میں ایک مستند اضافہ ہے، بیمہ کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علماء کی آراء کا ایک عمدہ تجزیہ ہے۔ مولانا کی اس تحریر کی حیثیت ایک نوٹ اور ریمارک کی نہ رہ کر بیمہ کے موضوع پر مستقل ایک مختصر تحقیقی رسالہ کی ہو گئی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے فقہ کے اصول و اصطلاحات پر مولانا کی گہری نظر کا علم ہوتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے جو بحث کی ہے زیادہ تر اصول اور اصطلاحات کی تعیین اور تخصیص کی ہی بنیاد پر کی اور ایک حتمی فیصلہ پر پہنچے کہ بیمہ ناجائز ہے۔

۱۔ بیمہ اور اس کا شرعی حکم ص ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۳۲

۲۔ بیمہ اور اس کا شرعی حکم میں مولانا کے مکتوب کو مولانا تقی امینی کے نام لکھا گیا ہے، لیکن سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور ڈاکٹر مسعود احمد سے زبانی گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ یہ خط دراصل مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کے نام لکھا گیا تھا، لیکن رسالہ کی طباعت کے وقت اس کی طرف توجہ نہ ہو سکی۔

۳۔ بیمہ اور اس کا شرعی حکم ص ۱۱

بیمہ کے موضوع پر ایک تحقیقی رسالہ 'حکیم الاسلام فی التامین' ہے، جس کے مصنف ایک شامی عالم عبداللہ ناصح علوان ہیں۔ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے اس عربی رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ 'المجمع العلمی' مئو نے ۲۰۰۲ء میں بیمہ کے موضوع پر مولانا الاعظمی کی اس تحریر اور شیخ علوان کے رسالہ کو ایک ساتھ 'بیمہ اور اس کا شرعی حکم' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ ۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب

مغل حکمران جب مغلوب ہو گئے اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو ہندوستان کی حیثیت شرعی کے بارے میں بھی سوالات اٹھنے لگے کہ اب یہ پہلے کی طرح دارالاسلام رہا یا دارالحرب؟ اسی کشمکش کے عالم میں شاہ عبدالعزیزؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ شاہ صاحب کا یہ فتویٰ سیاسی نقطہ نظر سے بہت مفید ثابت ہوا، اس فتویٰ نے انگریز دشمنی اور اس ملک سے انکے انخلا میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہمارا مقصود یہاں اس فتویٰ سے فقہی نقطہ نظر سے بحث کرنا ہے سیاسی پہلو سے اس کا جائزہ لینا نہیں۔

چونکہ انیسویں صدی میں ملک کے حالات بدل چکے تھے، حاکم قوم محکوم ہو چکی تھی اور محکوم لوگ حاکم بن بیٹھے تھے، اور بیسویں صدی میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا؛ اس لئے لامحالہ اس تبدیلی کے ساتھ مسائل شرعیہ کی نوعیت میں بھی تبدیلی ایک لازمی نتیجہ تھی۔

چنانچہ اساطین علم اور فقہاء کے درمیان ہندوستان کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی بحث کسی نہ کسی انداز میں چھڑی رہی، تاکہ اس بنیاد پر دائر مسائل

اور احکام شرعیہ کی صحیح جہت اور سمت مقرر کی جاسکے۔ ان علماء اور فقہاء میں قابل ذکر نام حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا کرامت علی جوہری، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا عبدالحی، حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی کے ہیں۔ اور بعد کے لوگوں میں اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں مولانا محمد میاں، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علماء کا ایک طبقہ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتا تھا، ایک طبقہ اسکو دارالاسلام قرار دیتا تھا، اور کچھ علماء اسے دارامان کہتے رہے۔ اپنے اپنے دلائل و شواہد سبھی کے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اکثر کی رائیں مضامین، فتاوے یا مقالات کی شکل میں منظر عام پر آچکی تھیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے بھی اس موضوع پر ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا، جو اگرچہ بعض علماء کی آراء پر تنقیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسکے باوجود اس مقالہ کی حیثیت تخلیقی اور انداز نگارش جدید تجزیہ کا ہے۔ مولانا اعظمی اولاً بشمول امام ابوحنیفہ کے، قدیم فقہاء کی آراء پیش کرتے ہیں، قدیم فقہی مراجع سے اقتباسات نقل کرتے ہیں، اور ان کی روشنی میں دارالحرب اور دارالاسلام کی حقیقی و حکمی تعریف کرتے ہیں اور ان تعریفات کی روشنی میں ہندوستان کس دار کے تحت آتا ہے اسکا فیصلہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”مذکورہ بالا ارشادات کی رو سے ہندوستان کا دارالحرب ثابت ہونا ناممکن

ہے، اور انکی رو سے وہ بلاشک و شبہ دارالاسلام ہے۔“

پیش کئے گئے دلائل کا خلاصہ جن کی بناء پر مولانا اعظمی نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا یہ ہے کہ جن بلاد کے والی و حاکم غیر مسلم ہوں، مگر مسلمان اس میں

جمعہ و جماعت قائم کرتے ہیں اور مسلمانوں کی باہمی رضا سے قاضی^۱ بن سکتا ہو ان کو دارالحرب کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مولانا نے محققین اور فقہاء کے دونوں موقف کو پیش کر کے انکا محاکمہ کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ کن بنیادوں پر بعض فقہاء نے ہندوستان کو دارالحرب کہا ہے، انکے دلائل کا تجزیہ فرمایا، خاص طور پر شاہ عبدالعزیزؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پیش کردہ دلائل اور تحریروں میں مولانا الاعظمیؒ کو خلجان پیش آیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی ایک تحریر کے بارے میں مولانا اظہار خیال فرماتے ہیں:

”یہ اور اسی طرح کی بعض دوسری باتیں پڑھ کر ہم کو شک ہوتا ہے کہ یہ تحریر

واقعی حضرت شاہ صاحب کی ہے بھی یا نہیں، ہم کو اس میں خلجان ہے.....“

مولانا الاعظمیؒ کو ان حضرات سے سخت اختلاف ہے جو دار کی چار قسمیں قرار دیتے ہیں یعنی دارالامن اور دارالعہد کو دارالسلام اور دارحرب کا تقسیم ٹھہراتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ دارالامن اور دارالعہد ایک دار (دارالحرب) کے ہی تحت آتے ہیں الگ سے کوئی قسم نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی علمی گرفت کی ہے۔ مولانا اعظمیؒ نے دارالحرب سے ہجرت اور دارالحرب میں سود کے حکم پر بھی بحث کی اور بیمہ کے باب میں تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کے فتویٰ کو غلط قرار دیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیؒ نے اپنے اس مضمون میں مولانا محمد

۱۔ قاضی سے مراد قاضی جمعہ و اعیاد ہے، قاضی خصوصیات نہیں۔ کیونکہ قضاء کی شرعی تعریف کے سلسلہ میں فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”والقضاء في الشرع قول ملزم يصدر عن ولاية عامة.“ یعنی قضاء شریعت میں ایسے فیصلہ کو کہا جاتا ہے جو کسی پر ایسے شخص کی طرف سے لازم ہو جس کو ولایت عامہ حاصل ہو۔ (فتاویٰ عالمگیری ۳: ۳۰۶) اور ظاہر ہے کہ یہاں ہندوستان میں ولایت عامہ حاصل نہیں۔

۲۔ دارالاسلام اور دارالحرب ص ۳۴

میاں، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی پر خاص طور سے رد و قدح فرمائی اور ان کے موقف و دلائل کی بہ دلائل تردید کی۔ مولانا الاعظمیٰ کا یہ مضمون انکی فقہی بصیرت کا عمدہ نمونہ ہے، اگر اسکو بحث و تحقیق کا مرقع کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ پہلی مرتبہ یہ رسالہ جنوری تا اکتوبر۔ نومبر ۱۹۶۷ء میں مجلہ 'البلاغ' بمبئی میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اسکے بعد یہ رسالہ جلد ۹ شمارہ ۳ سے جلد ۱۰ شمارہ ۴ تک مجلہ 'الماثر' کے صفحات پر شائع ہوا۔ اب یہ مقالہ 'دارالاسلام اور دارالحرب' کے نام سے کتابی شکل میں مجمع علمی مسو سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔

مولانا الاعظمیٰ کی اس فقہی تحقیق کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ملک کے مختلف رسالوں اور مجلات میں اس پر ریویو لکھے گئے۔ عربی مجلہ 'الداعی' میں مولانا نور عالم خلیل امینی استاذ ادب دارالعلوم دیوبند دارالاسلام اور دارالحرب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وقد تحدث المحدث الأعظمي كما هو شأنه في كل موضوع علمي إسلامي يعالجه بقول فصل يزيل كل لبس، ويسجلي كل غموض، فهي بذلك دراسة رائعة تستحق أن تنقل ولا سيما إلى اللغة العربية." ۱

(محدث الاعظمیٰ نے اپنے اسی انداز پر جیسا کہ ہر علمی اسلامی موضوع میں ان کی نمایاں شان ہے، اس بحث میں بھی اپنی ایک فیصلہ کن رائے قائم کی اور تمام طرح کے اوہام والتباس کو دور فرما دیا۔ چنانچہ یہ ایک ایسی شاندار علمی بحث ہے جسکا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہونا چاہئے خاص طور سے عربی زبان میں۔)

فقہی انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کی دعوت

کویت کی وزارت اوقاف نے 'الموسوعة الفقهية' (فقہی انسائیکلو پیڈیا) کی جمع و ترتیب کا کام اپنی ماتحتی میں شروع کیا تھا، معروف عالم شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء اس پروجیکٹ کے نگران تھے، مولانا اعظمی کو بھی وزارت اوقاف کی جانب سے کویت میں قیام کرنے کی دعوت دی گئی؛ تاکہ مولانا انسائیکلو پیڈیا سے متعلق سپرد کی گئی ذمہ داریوں کو کویت میں ہی رہ کر انجام دے سکیں۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان متعدد خطوط حکومت کویت کی طرف سے مولانا اعظمی کے پاس بھیجے گئے، مولانا نے اپنی رضامندی بھی دے دی تھی، حکومت کویت کا دعوت نامہ تو ہمیں دستیاب نہ ہو سکا البتہ مولانا اعظمی کی آمادگی کے بعد شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کے شکریہ و شرائط کے دو خط ضرور ملتے ہیں، ایک خط ۳۰ جون ۱۹۶۹ء کا ہے، جس کا ایک مختصر سا اقتباس ذیل میں پیش خدمت ہے:

"صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم
حفظه الله تعالى وأدام للمسلمين نفعه.

السلام عليكم

وبعد فأحمد الله تعالى اليكم راجياً من فضله أن تكونوا بخير
وعافية من كل مكروه.

تلقيت الآن رسالتكم العزيزة المؤرخة في
٢٠/٣/١٣٨٩ هـ جواباً على رسالتي الأخيرة إليكم. وقد
كان سروري عظيماً جداً بما تضمنته من استعدادكم
للمجيء هنا للتعاون في مشروع الموسوعة بما يمكن أن

يستغاد فيه من فضيلتكم هي هذا المشروع الجليل، بارك
الله فيكم وقواكم وإيانا على متابعة الخدمة لهذه الشريعة
الغراء الخالدة.....

(عزت مآب استاذ جلیل محترم شیخ حبیب الرحمن الاعظمی، اللہ آپ کی
حفاظت فرمائے اور جناب کے فیوض و برکات کو جاری رکھے۔ السلام علیکم
الحمد للہ بخیر ہوں، آپ کی خیریت و عافیت کا متمنی ہوں۔

میرے آخری خط کے جواب میں ۶/۴/۱۳۸۹ھ کو گرامی نامہ موصول ہوا،
مجھے بہت مسرت ہوئی کہ اس خط میں انسائیکلو پیڈیا کے پروجیکٹ میں
یہاں آکر آپ کے تعاون کرنے کی اطلاع ہے، اور اس وجہ سے بھی خوشی
ہوئی کہ اس عظیم پروجیکٹ میں آنجناب سے حتی الامکان استفادہ کیا جاسکے
گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت عطا فرمائے، اور ہمیں اور آپ کو
اس عمدہ اور پائندہ شریعت کی خدمت جاری رکھنے کی قوت بخشے۔)

۱۱/رجب ۱۳۹۰ھ ۱۲/ستمبر ۱۹۷۱ء کے ایک دوسرے مکتوب میں شیخ
مصطفیٰ الزرقاء تحریر فرماتے ہیں کہ:

"وبعد فاسأل المولى أن تكون حالتكم الصحية جيدة، وأن
تكون آثار العملية الجراحية قد ولت وعاد إليكم نشاطكم
المعهود، وحينئذ أجد الفرصة سانحة لتكرار العرض على
فضيلتكم للحضور إلى الكويت والقيام بمهمة عضو في
هيئة تحرير الموسوعة، وذلك لمدة سنة مبدئياً،
بالشروط والتعليمات المبينة لسيادتكم سابقاً وبمرتب

شہری (لیس معہ ای توابع او علاوات) قدرہ / ۳۵۰
ثلاثمائة وخمسون ديناراً كويتياً۔“ ۱

(اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کی صحت اچھی ہو، اور آپریشن کے اثرات ضائع ہو چکے ہوں، اور نشاط و فرحت لوٹ آئی ہو، یہ موقع اس وقت غنیمت سمجھ رہا ہوں کہ آنجناب سے ایک بار پھر درخواست کروں کہ کویت تشریف لائیں، اور انسائیکلو پیڈیا کے اڈیٹوریل بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے اپنے کام کو انجام دیں، یہ قیام کم از کم ایک سال کے لئے ہوگا، انہیں شرائط و ہدایات کے مطابق جو پہلے عرض کی جا چکی ہیں، اور ساتھ میں (سہولیات و لوازمات کے علاوہ) ۳۵۰ کویتی دینار کا مشاہرہ بھی ہوگا۔)

لیکن مولانا الاعظمیٰ کو بیروت کا سفر پیش آ گیا، جہاں جانا ضروری تھا، اس وجہ سے انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کے لئے کویت نہیں جاسکے، لیکن پھر بھی گھر بیٹھے ’الموسوعة الفقهية‘ کا کام کیا۔ مولانا نے ’کتاب الجنائز‘ لکھ کر وزارت الاوقاف کویت کو روانہ کیا تھا، اس کے علاوہ: ’انسائیکلو پیڈیا کے متعدد مقالات پر نظر ثانی کا کام بھی کیا۔“ ۲

انساب و کفایت کی شرعی حیثیت

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں بانٹ دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک باعزت وہ ہوگا جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہوگا۔

فقہاء و علماء نے اس آیت کے ذیل میں انساب و کفایت کے موضوع پر بحث و تحقیق کی ہے، کفایت (مساوات) ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، یہ مسئلہ اس وقت اور الجھ جاتا ہے جب شادی بیاہ کا معاملہ ہوتا ہے، یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زوجین کے درمیان موافقت کے لئے کفایت یعنی مساوات کا کیا معیار ہوگا، دیانت و تقویٰ، نسب، مال، پیشہ، ان میں سے ہر ایک چیز ملحوظ ہوگی یا کوئی ایک! یا صرف دین و تقویٰ کا اعتبار ہوگا، اور اسکے علاوہ دوسری چیزوں کا سرے سے اعتبار نہیں، ائمہ و فقہاء حضرات کی اس سلسلہ میں مختلف آراء ہیں۔

قرآن و حدیث، آثار صحابہ اور ائمہ و فقہاء کے اقوال و آراء کی روشنی میں بعد کے محققین اور علماء نے بھی اس موضوع پر بحث کی ہے اور اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ ۱۳۵ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی کفایت کے مسئلہ پر قلم اٹھایا اور 'نہایات الارب فی غایات النسب' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس پر تقریظ لکھی ہے، یہ تقریظ 'وصل السبب فی فصل النسب' کے عنوان سے ہے۔ اس رسالہ کو مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے کس پس منظر میں تحریر فرمایا، خود بیان فرماتے ہیں کہ:

”پہلا مرض (تفاخر بالانساب)..... اور دوسرا مرض (انتساب الی غیر الانساب)..... ان دونوں کا مرض درحقیقت ایک ہی مرض تھا کہ اصل کمالات اور حقیقی فضائل کو چھوڑ کر نسب کے پیچھے پڑ گئے، اور سب سے زیادہ اہم اور اعلیٰ فضیلت کمال نسب کو سمجھے..... ایک تیسرا طبقہ وہ ہے جو سرے سے تفاضل انساب ہی کو مٹانا چاہتا ہے کہ کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور اسکا نام مساوات اسلام رکھا ہے..... آخر الذکر معاملہ مساوات کے متعلق اطراف ملک سے سوالات کثرت سے ہوئے نکاح شادی کے معاملات میں کفالت کے باب کو ان حضرات نے بالکل چھوڑ دینا چاہا اور مساوات اسلام کے سچے اور صحیح عنوان کا معنون یہ غلط صورت بنا دی اس لئے خیال ہوا کہ اس بحث کو ایک مستقل رسالہ کی صورت میں لکھ دیا جائے۔“ ۱

مفتی صاحب نے اس رسالہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: جزو اول مساوات اسلام کی حقیقت اور پیشوں میں تفاضل، جزو دوم التفاخر بالانساب، جزو سوم الانتساب الی غیر الانساب۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے نزدیک مساوات کی حقیقت یہ ہے کہ زمان و مکان اور اجناس و اصناف کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے قانون بنایا جائے، اور اس قانون کی تنفیذ میں اعلیٰ ادنیٰ اونچ نیچ ذات پات کا امتیاز نہ برتا جائے، نہ یہ کہ قانون ہی ایسا مہمل بنایا جائے کہ گدہا اور گھوڑا برابر ہوں۔ ۲

انساب اور پیشوں کے باہمی تفاضل سے متعلق مفتی صاحب کی تحقیق یہ ہے

۱۔ نہایات الارب فی غایات المنسب ص ۴

۲۔ ایضاً ص ۸

کہ عزت و ذلت ایک عرفی ہے اور ایک شرعی، شرعی عزت کا مدار اللہ کے نزدیک صرف تقویٰ اور اتباع شریعت ہے، ذات پات کی اونچ نیچ، اصناف و اقوام کا تفاوت اس جگہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا؛ کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“۔ احادیث بھی وارد ہیں کہ اللہ کے نزدیک فضیلت کا مدار تقویٰ ہے، مرد اگر عورت سے افضل ہے تو اسی وقت ہے جب اسکو تقویٰ کی دولت حاصل ہو، عرب کو عجم، سادات (بنی ہاشم) کو دوسرے عرب پر اور تمام عجم پر اگر فضیلت حاصل ہوگی تو صرف اور صرف تقویٰ و دیانت کی بنیاد پر ہوگی، اور جہاں تک عرفی عزت کی بات ہے تو ان تمام چیزوں کا تفاضل معتبر ہے۔

مفتی صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں آگے چل کر احادیث و آثار اور اقوال فقہاء وغیرہ پیش کئے ہیں۔ یہاں اس رسالہ پر تبصرہ اور تعارف مقصود نہیں؛ اس لئے اسکی تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے۔

پھر ہندوستان کے ایک مشہور عالم نے مذکورۃ الصدر آیت کی تفسیر میں ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا، اور اس آیت کے ذیل میں کفایت کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے نسبی تفاضل پر بھی بحث کی، فاضل مصنف کی تحقیق کا نتیجہ بھی وہی تھا جو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی بحث و تحقیق کا تھا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیؒ نے بھی کفایت کی شرعی حیثیت سے بحث کی، اور اس موضوع پر لکھے گئے دونوں رسالوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہر دو محققین کے موقف کی تردید کی۔

مولانا اعظمیؒ نے اولاً آیت شریفہ کے پہلے فقرہ ”یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی“ کی تفسیر میں لکھا کہ یہ فقرہ نسبی مساوات پر دلالت کرتا

ہے، کہ جب سارے انسان ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا ہوئے تو کسی کو کسی پر نسب کے لحاظ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مولانا نے اپنی تائید کے لئے مفسرین میں امام بغوی، علامہ خازن، خطیب شربنی، بیضاوی، امام نسفی، علامہ زنجیری اور علامہ عینی وغیرہ کی تصریحات درج کیں۔

آیت کے دوسرے فقرہ: ”وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا“ کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خاندان و قبائل کی تقسیم اس لئے نہیں کی کہ اسکے بندے اسکو شرافت کا معیار قرار دے لیں، بلکہ یہ تقسیم تو صرف اس لئے ہے کہ اسکے ذریعہ شناخت اور پہچان ہو سکے، مثلاً دو شخص ہیں ایک ہی نام کے، اور ان کے باپ کا نام بھی ایک ہی ہے، تو ایک کو اموی اور دوسرے کو قریشی کہہ کر دونوں میں امتیاز کیا جاسکے۔ مولانا نے دلیل میں علامہ زنجیری کی عبارت پیش کی۔ اور تیسرے فقرہ: ”ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“ کو شرافت، عزت اور فضیلت کا معیار قرار دیا۔

نسبی مساوات اور ذات پات کی اونچ نیچ کی تردید میں مولانا اعظمی اس آیت کے شان نزول کو بھی بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باعزت قبیلہ بنو بیاضہ سے فرمایا کہ ابو ہند کا (جو بنو بیاضہ کے غلام اور پچھنا لگانے کا پیشہ کرتے تھے) اپنے خاندان میں نکاح کر دو بنو بیاضہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم اپنی لڑکیوں کو اپنے غلاموں سے بیاہ دیں، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

مولانا اعظمی کی رائے یہ ہے کہ ساری برادریاں ایک ماں باپ سے پیدا ہوئی ہیں؛ اس لئے نسباً تو ان میں کوئی تفاوت نہیں، البتہ جن برادریوں نے علمی و عملی کمالات سے خود کو آراستہ کر لیا ہے وہ کسباً دوسری برادریوں سے اعلیٰ ہیں۔

مولانا تمثیل کے ذریعہ شعوب و قبائل کے مفہوم کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

”بہر حال انسانوں کا نسب ایک ہے، ہاں اس نسب میں بہت سی شاخیں، پھر شاخوں میں دوسری شاخیں پیدا ہوتی گئی ہیں، انہیں شاخوں اور شاخوں کی شاخوں کو قرآن کریم میں شعوب و قبائل سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اسکی مثال بعینہ درخت کی ہے کہ اس کا تنا ایک ہوتا ہے، اسی ایک تنا سے کئی شاخیں پھوٹتی ہیں، پھر ان شاخوں میں بھی کئی کئی شاخیں نکل آتی ہیں، پس جس طرح اس درخت کے جتنے پھل یا پھول یا پتیاں ہیں وہ پہچان کے لئے یوں کہے جائیں گے کہ یہ پھل فلاں شاخ کا ہے، اور یہ فلاں شاخ کا، پھر بھی وہ سب ایک درخت کے ہیں۔“ ۱

کفایت کے سلسلہ میں مولانا اعظمی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جمہور علماء اسلام کے نزدیک دین کے ساتھ نسب میں بھی کفایت کا اعتبار ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ نسباً کفایت کا اعتبار عرب یعنی اولاد قحطان اور اولاد اسماعیل تک ہی مخصوص ہے، عجمی نسل کے لوگوں میں اس کفایت کا مطلقاً اعتبار نہیں ہے۔ پھر آگے چل کر اس سلسلہ میں مولانا نے دلائل و شواہد دیئے، اور لکھا کہ:

”فقہاء حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ غیر عربی برادریوں میں نسب کفایت کا اعتبار نہیں ہے۔“ ۲

”فقہ میں جولا ہے اور دھنئے سے کون مراد ہے؟“ کا عنوان قائم کر کے مولانا اعظمی نے مسئلہ کفایت کے اس رخ کی جانب بھی توجہ فرمائی کہ جولا ہہ اور دھنیا فقہی اصطلاح میں کس کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ فقہ میں جولا ہا اور دھنیا سے مراد وہی

ہوسکتا ہے، جو خود یہ پیشہ کر رہا ہے، جو شخص یہ پیشہ چھوڑ چکا ہے، قدیم زمانہ میں کبھی اسکے خاندان میں یہ پیشے ہوتے تھے تو ایسے شخص کو کوئی غیر پیشہ ور عجمی قوم فقہ حنفی کی رو سے جولاہہ یا دھنیا قرار دے کر اپنا غیر کفو نہیں کہہ سکتی۔

پیشہ کے اعتبار سے کفویت کے بارے میں مولانا اعظمی سرخسی کی ایک مبسوط عبارت پیش کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک پیشہ میں کفویت معتبر نہیں، امام ابو یوسف کے نزدیک پیشہ کے لحاظ سے کفویت کا اعتبار ہے۔

۲- پیشہ اور نسب کی حیثیت میں فرق ہے مثلاً اگر کوئی آدمی خیس پیشہ اختیار کرتا ہے تو خیس کہلائے گا، اور اگر اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی اچھا پیشہ اختیار کرتا ہے تو اسکی خست اور دنائت دور ہو جائے گی، برخلاف نسب کے کہ اس میں یہ صورت نہیں چلے گی، اسکا جو نسب ہے وہ نسب رہے گا۔

۳- اسی طرح یہ حدیث نقل کی جاتی ہے کہ سارے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں بجز جولاہے اور حجام کے، اس حدیث کے بارے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ناقابل اعتبار حدیث ہے۔

بالغ لڑکی اپنا نکاح غیر کفو میں کر لے تو نکاح صحیح ہوگا یا نہیں؟ دلی کی رضا مندی کے بغیر اگر بالغ لڑکی نے اپنا نکاح غیر کفو میں کر لیا تو اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں، حسن بن زیاد کی روایت کی بناء پر اس صورت میں نکاح صحیح نہیں ہوگا، لیکن ظاہر الروایۃ کی بناء پر نکاح صحیح ہے، اب دونوں میں مفتی بہ قول کون ہے؟
مولانا اعظمی فرماتے ہیں کہ:

”تحقیقی بات یہ ہے کہ مشائخ نے دونوں روایتوں پر فتوے دیئے ہیں۔“

مولانا نے ان دونوں روایتوں میں ترجیح کی کوشش کی ہے، اور ظاہر الروایۃ کو چھوڑ کر ترجیح سے رائج قرار دیا ہے۔

آخر میں مولانا الاعظمیٰ نے ”ہندوستانی شرفاء کے شجرہائے نسب“ کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت مولانا نے ہندوستان کے مشہور خاندانوں کے شجروں سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں جو غلط انتساب ہیں یا جو مشتبہ اطلاعات ہیں، ان کو واضح کاف کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ مولانا اعظمیٰ نے تحریر فرمایا کہ ہندوستان کے اکثر فاروقی حضرات اپنے کو حضرت ابراہیم بن ادہم کی اولاد سے بتاتے ہیں، حالانکہ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ ان کے نسب کے بارے میں ”ترجیح محدثین کے قول کو ہے۔“ یعنی یہ کہ ابراہیم ادہم حضرت فاروق کی اولاد میں تو درکنار وہ قریشی بھی نہیں ہیں بلکہ عجمی یا حبشی ہیں۔

مولانا اعظمیٰ نے ان شجروں کے بابت جو کچھ لکھا ہے، دلیل و شہادت کی روشنی میں لکھا ہے۔ وفاء الوفاء، نزہۃ الخواطر، تاریخ ظفر آباد، استاذ العلماء، نجات الانس، مرآۃ الانساب، اصول المقصود، طبقات ابن سعد وغیرہ کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کی یہ کتاب انساب و کفایت کی شرعی حیثیت کی تعیین کے سلسلہ میں بہت مدلل کتاب ہے، جس وقت مولانا نے یہ کتاب تحریر فرمائی اس وقت ان کی عمر بتیس یا کچھ زائد رہی ہوگی؛ کیونکہ حضرت مفتی محمد الحکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ابراہیم بن ادہم کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ: ”چار روایتیں ابراہیم بن ادہم کے بارے میں جمع ہوئیں، فاروقی، عجمی، سیدیہ یا پنجواں شہید ہے کہ ابراہیم بن ادہم بہت سے ہوئے ہیں واللہ اعلم یہ فاروقی کون سے ابراہیم بن ادہم کی طرف منسوب ہیں، مجھے تو جب سے یہ روایات معلوم ہوئی ہیں تو اس دعوائے نسب کو سلام کرتا ہوں اور میں اپنے آپ کو فاروقی لکھتا ہوں، ہاں اس قدر تو محقق ہے کہ جو لوگ فاروقی کہلاتے ہیں، یہ ادہمی ہیں۔“ (حقیقت عبادت ص ۲۶۶)

شفیع صاحبؒ کی نہایات الارب فی غایات النسب کا سنہ اشاعت ۱۳۵۱ھ ہے، اسکے بعد ہی مولانا نے یہ کتاب لکھی ہوگی اور مولانا کا سن ولادت ۱۳۱۹ھ ہے، چنانچہ ان کی عمر بتیس تینتیس کے قریب رہی ہوگی۔

مولانا اعظمی کی ذہانت اور قوت استعداد کو دیکھتے ہوئے عمر کی اس منزل پر ’انساب و کفایت کی شرعی حیثیت‘ جیسی کتاب کا لکھا جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ انہوں نے ۲۹ برس کی عمر میں ہی حدیث کا وہ کام کر دکھایا تھا کہ جس نے فن کے امام کو چونکا دیا تھا۔

بہر کیف! مولانا نے اپنے موقف کو قرآن و سنت اور فقہ کی روشنی میں پیش کیا، اور نسب و کفایت کے سلسلہ میں اردو زبان میں ایک قیمتی کتاب تصنیف کی، انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اسلام میں نسب کا تعلق ذات و نسل سے ہے، کوئی چیز نہیں ہے، اگر فضیلت و برتری کا کوئی مدار ہے تو وہ تقویٰ ہے، نہ کسی کو کوئی افضلیت نہیں حاصل ہے، البتہ علم و عمل اور تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے کس کا کوئی برتر ہو سکتا ہے۔ کتاب کے حواشی بھی بہت اہم اور معلومات آفریں ہیں۔

کتاب کا عنوان یا نام حضرت مولانا اعظمی کا تجویز کردہ نہیں ہے، بلکہ اس کا نام مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ منو نے تجویز کیا ہے۔ ادارہ نے اسی کتاب کے صفحہ ۵۲ کی ایک تحریر سے اس نام کو اخذ کیا ہے، وہ تحریر یہ ہے:

”..... میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنیوالے،

حق بات کا اعلان کرنے والے، اور انساب و کفایت پر شرعی حیثیت سے روشنی ڈالنے والے عربی النسل بزرگ.....“

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے جس انداز سے اس موضوع پر بحث

تحقیق کی ہے، وہ واقعی قابل تعریف ہے، انہوں نے خیر القرون کے اسلامی معاشرہ کی جس طرح منظر کشی کی ہے، اور اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان مساوات و عدم امتیاز کو جس طرح بیان کیا ہے، وہ مولانا جیسے محقق کا ہی حصہ تھا۔

چونکہ یہ کتاب دور سالوں کے رد میں لکھی گئی تھی جو اسی موضوع یعنی کفایت وغیرہ پر منظر عام پر آئے تھے، اور جن کے انداز تحریر سے سواد اعظم کی دل آزاری ہوئی تھی، اس لئے اس میں بھی بعض مقامات پر تلخی کے اثرات پائے جاتے ہیں اور انداز تحریر میں کہیں کہیں شدت آگئی ہے۔

یہ کتاب ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء میں المجمع العلمی، مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مؤ سے شائع ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید مولانا اعظمی کا ارادہ اس کتاب کو شائع کرنے کا نہ تھا، اس لئے اس دور میں شائع نہیں ہوئی، اور جب مولانا کے زمانہ میں یہ کتاب شائع نہیں ہوئی تو اب اس زمانہ میں اس کی اشاعت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ ممکن ہے کہ مولانا کو یہ خیال ہوا ہو کہ اس وقت کتاب کی اشاعت اس لئے مناسب نہیں ہے کہ برادرانہ چیقلش نہ پیدا ہو جائے، اور بحث و مباحثہ کا دروازہ نہ کھل جائے، لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ مولانا کی بہت سی چیزیں ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہیں، مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مؤ آہستہ آہستہ مولانا کی تحقیقات کو شائع کر رہا ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

صدر اللثام عن وجہ تحقیق الکلام

امام کے پیچھے مقتدی کے قرأت (قرأت خلف الامام) کے مسئلہ پر مشہور المحدث عالم مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری نے تحقیق الکلام کے نام سے ایک

کتاب تصنیف کی تھی، یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور نہایت محقق سمجھی جاتی ہے۔ مولانا مبارکپوری نے اس میں بہت شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے، انہوں نے اپنی کتاب کے دو حصے کئے ہیں، پہلے حصے میں اپنے مسلک کو دلائل سے مدلل کیا، اور اس پر ہونے والے اعتراضات و ایرادات کا دفعیہ کیا، اور دوسرے حصے میں حنفیہ کے دلائل کا تجزیہ کیا اور ان کا جواب دیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے کاغذات میں ایک تحریر دستیاب ہوئی، یہ تحریر دراصل مولانا مبارکپوری کی کتاب 'تحقیق الکلام' کا جواب تھی، یہ تحریر ۱۳۴۳ھ کی لکھی ہوئی تھی۔ مولانا اعظمی ۱۳۴۰ھ میں فارغ ہوئے اور ۱۳۴۳ھ میں 'تحقیق الکلام' کا جواب لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مولانا یہ کتاب مکمل نہ کر سکے۔ البتہ یہ کتاب ناقص ہی سہی مولانا اعظمی کے قلمی مسودات میں محفوظ تھی۔ مولانا کی یہ نامکمل کتاب احباب اور اہل علم کی خواہش پر مجلہ 'المآثر' میں 'حدر اللثام عن وجہ تحقیق الکلام' کے نام سے قسط وار شائع ہو رہی ہے، اب تک اسکی چار قسطیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا اعظمی نے جواب میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا، جس ترتیب پر مولانا مبارکپوری نے اپنی کتاب تصنیف کی تھی، یعنی انہوں نے بھی دو حصے کئے پہلے حصہ میں احناف کے دلائل ذکر کئے اور فریق مخالف کے اعتراضات کے جوابات دیئے۔ اور دوسرے حصے میں 'تحقیق الکلام' کے پہلے حصہ پر کلام کیا۔ مولانا نے محدثانہ رنگ میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری نے احناف کے جن دلائل کو روایۃ یا مضمون حدیث پر کلام کر کے مشتبہ اور ناقابل قبول قرار دیا تھا، مولانا اعظمی نے اصول حدیث، مضمون حدیث اور منشاء حدیث کی رو سے ان دلائل کو مضبوط ترین اور مستحکم دلائل قرار دیا، اصول حدیث سے مولانا مبارکپوری کے انحراف کرنے پر ان کی گرفت کی اور اپنی اس تنقید پر اصولیین اور نقاد حدیث کی

آراء پیش کیں۔

مولانا نے آیت شریفہ ”واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون“ (اعراف) سے استدلال کیا، اور اس آیت کے سبب نزول کو بیان کیا، متن قرآن والفاظ حدیث سے کیا مراد ہوگی، اور کسی آیت کا سبب نزول کیوں معلوم کیا جاتا ہے، ان تمام پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

”کسی آیت کا سبب نزول معلوم کرنے کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے آیت کی مراد سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آیت کا حکم اسی سبب نزول کے ساتھ خاص ہے، صرف علمائے حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ محققین شافعیہ و مالکیہ نے بھی تصریح فرمائی ہے کہ آیت یا حدیث کا سبب کوئی خاص چیز ہو، لیکن الفاظ آیت و حدیث عام ہوں تو وہ الفاظ جن جن صورتوں کو شامل ہوں گے، ان سب پر آیت یا حدیث کا حکم نافذ ہوگا۔“

مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں علامہ ابن العربی مالکی کی احکام القرآن، علامہ سیوطی شافعی کی اتقان اور فتح الباری کا حوالہ دیا ہے۔ بہر حال یہ رسالہ نہایت ہی محققانہ و محدثانہ انداز میں لکھا گیا ہے، اگر یہ کتاب مکمل ہوتی تو حنفیہ کے لئے قرأت خلف الامام کے موضوع پر اہم کتاب ہوتی! خیر جو کچھ مواد سر دست اس میں ہے، وہ بہت ہی اہم اور کارآمد ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی یہ کتاب مجلہ ”المآثر“ ج: ۱۲ ش: ۴، ج: ۱۳ ش: ۱، ۲، ۳ میں قسط وار شائع ہوئی ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

فتاویٰ

مولانا الاعظمیٰ معتبر فقیہ و مفتی سمجھے جاتے تھے؛ اس لئے کوئی بھی اہم مسئلہ ان کی طرف رجوع کیا جاتا، رویت ہلال کے مسئلہ پر قرب و جوار کے اضلاع میں ان کا فیصلہ آخری فیصلہ مانا جاتا۔ دور دراز علاقوں سے لوگ اپنے مسئلہ کا حل پوچھنے آتے، مولانا کے ارد گرد دینی مسائل پوچھنے والوں کی ایک بھیڑ جمع رہتی، اطراف ملک سے استفتاء آتے اور مولانا اعظمیٰ ان کا تحریری جواب دیتے، استفتاء کا جواب لکھنا ان کے معمول (Routine) میں تھا۔

مولانا اعظمیٰ کے نام ہمیں بہت سے ایسے خطوط ملتے ہیں، جن میں اہل علم حضرات فقہی مسائل میں انکی رائے معلوم کرتے نظر آتے ہیں، یا اپنی رائے کی صحت و عدم صحت پر مولانا کا فیصلہ چاہتے ہیں۔

مولانا کے فتاویٰ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے، اور انکی حفاظت کا اہتمام بھی حتی الامکان کیا جاتا، لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ مولانا اعظمیٰ کے علمی سرمایہ پر دو حادثے گزرے، انہوں نے لکڑی کے ایک صندوق میں اپنے کاغذات اور مسودات رکھے تھے، لیکن جب کچھ عرصہ بعد صندوق کھولا گیا تو سارے کاغذات و میمک کی نذر ہو چکے تھے۔

اسی طرح ایک الماری میں قلمی مسودات و مخطوطات رکھے ہوئے تھے کہ ایک چنگاری صاعقہ محرقہ ثابت ہوئی، اور علم کے بیش بہا خزانہ کو جلا کر رکھ کر دیا۔ ڈاکٹر مسعود احمد کے بقول:

”اس میں خدا جانے کیا کچھ ضائع ہوا ہوگا، قیاس یہ ہے کہ اس میں

مسودات و مخطوطات کے علاوہ آپ کے فتوؤں کا ذخیرہ بھی تھا۔^(۱)
خوش قسمتی سے مولانا الاعظمی کے کچھ فتوے الحمد للہ محفوظ رہ گئے ہیں، جنہیں
الماثر نے شائع بھی کیا ہے، یہاں مجلہ المآثر (ج: ۲، ش: ۱) کے حوالہ سے صرف ایک
فتویٰ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

سوال: ایک عورت کا شوہر لاپتہ ہو گیا مثلاً پانچ برس اس طرح پر کہ تلاش
کرنے پر بھی پتہ نہیں چلتا، اب وہ عورت کتنی مدت انتظار گزارنے کے
بعد نکاح ثانیہ کرے گی۔ اگر اس عورت کو بعد نکاح ثانیہ اولاد ہوئی اور
پہلا شوہر جو مفقود تھا آیا اور اس نے اپنی بی بی کا دعویٰ کیا، اب وہ عورت
شریعت کی رو سے کس کی ہوگی اگر پہلا شوہر ناراض رہا تو وہ عورت
آخرت میں لائق بخشش ہوگی یا نہیں۔ جواب مع حوالہ کتاب سے مطلع
فرمادیں گے۔

جواب: ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ (کذا) کے قول میں مفقود کی
بیوی کو اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب تک اس کے شوہر کے ہم عمر
لوگ مرنہ جائیں اور اس کو نوے سال کی مدت کے ساتھ مقدر کیا ہے،
لیکن امام مالک کے قول میں چار برس گزرنے کے بعد عورت چار مہینہ
دس دن عدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور ہمارے علماء نے بھی
بوقت ضرورت اس قول پر فتویٰ دینے کی اجازت دی ہے۔ لو افتمی بہ

فی موضع الضرورة لا بأس به۔ (شامی ج: ۳ ص: ۳۴۰)
اگر مفتی موضع ضرورت میں اس قول پر فتویٰ دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر اتنی مدت کے بعد کسی عورت نے نکاح کر لیا اور بچے پیدا ہوئے،
 پھر پہلا شوہر آگیا تو اولاد دوسرے شوہر کی قرار دی جائے گی اور بیوی
 پہلے شوہر کی طرف رجوع کرے گی۔ ان زوجتہ له والاولاد للثانی
 ج: ۲ ص ۳۴۲ بیشک بیوی پہلے شوہر کی ہوگی اور اولاد دوسرے شوہر کی۔
 پس معلوم ہوا کہ پہلے شوہر کی واپسی کے بعد دوسرے کے پاس رہنا
 عورت کو جائز نہیں گنہگار ہوگی، یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ چار برس سے
 پہلے اگر نکاح کیا ہے تو نکاح ناجائز ہے۔

ابوالمآثر حبیب الرحمن الاعظمیٰ مدظلہ

جمادی الاخریٰ ۱۳۷۰ھ

فقہی مضامین و مقالات

جن مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین و مقالات میں مولانا کی فقیہانہ بحث ہے، ان کی ایک اجمالی فہرست حیات ابوالمآثر، مجلہ المآثر اور مختلف رسائل کے حوالہ سے پیش کی جا رہی ہے:

۱- اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو (المآثر ج: ۸ ش: ۱ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ)

۲- تبصرہ بر حقیقۃ الفقہ

۳- تحقیق حکم الطلاقات الثلاث

۴- تشہد بالکفار سے نبی کی حکمت

۵- تطہیر المبتدعین بجواب 'مکفیر المبتدعین'

۶- تعاقب بر فتویٰ مفتی محمود حسن

۷- تقبیل ابہامین (المآثر ج: ۳ ش: ۴ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ)

۸- چند مسائل فقہیہ پر شبہات اور انکا ازالہ

۹- حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل

۱۰- دلائل فرضیت جمعہ

۱۱- رمضان میں تہجد باجماعت

۱۲- رویت ہلال

۱۳- فقہ نبوی کے نوٹ

۱۴- فی التنفل بعد الوتر (المآثر مسمی تا جولائی اور اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء)

۱۵- قتل مرتد

۱۶- مسافت قصر

۱۷- مسئلہ اطاعت امیر اسوۂ حسین کی روشنی میں (ضیاء الاسلام ۲۲ فروری ۱۹۳۹ء)

۱۸- مسئلہ تقویض اور ایک وکیل کا دخل و محقولات (ضیاء الاسلام ۱۹۳۹ء ۶ قسطوں میں)

۱۹- مسئلہ طلاق پر شبہات اور انکا ازالہ (القاسم ۲۵ اپریل ۱۹۲۳ء)

۲۰- مسلم پرسنل لاء یا اسلامی شریعت (البلاغ مئی ۱۹۷۲ء)

۲۱- رمضان کا چاند

۲۲- الحج القویۃ علی حرمة سجدۃ التیمۃ

۲۳- موضوعات القصاص (دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۶۱ھ) ۱



۱۔ ان مضامین کے علاوہ متعدد ایسے مضامین و مقالات ہیں، جن میں مولانا اعظمی نے الحمد للہ حضرات کا رد کرتے ہوئے فقیہانہ بحث کی ہے۔ ان مضامین کی فہرست 'مناظرہ' کی فصل میں 'رد الحمد للہ' عنوان کے آخر میں دی گئی ہے۔

مناظرہ

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کا علم مضبوط، ذہن برق رفتار، دماغ حاضر جواب اور قلم پختہ تھا۔ مولانا نے حدیث کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ انہیں خوابوں کی رہیں تھیں۔ یہی وہ خوابیاں ہیں جو کسی شخص کو بے باک مناظرہ نادیتی ہیں۔ مولانا الاعظمی نے سن شعور کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ایسے وقت میں علم و فن کے دروازہ پر دستک دی جب پورے ہندوستان میں مختلف مذاہب، مسالک اور فرقوں کے درمیان مناظروں، مجادلوں اور بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔

مولانا ماحول سے متاثر ہوئے، وقت کا تقاضا دیکھا اور دین و شریعت کی حفاظت کی خاطر اس محاذ پر کمر بستہ ہو گئے۔ مولانا نے تقریری و تحریری دونوں طرح کے مناظرے کئے۔ تحریری مناظرے خاص طور سے شیعیت، غیر مقلدیت اور بریلویت کے خلاف ہیں۔

مولانا اعظمی نے منکرین حدیث کے خلاف بھی ایک مستقل کتاب ”نصرۃ الحدیث“ کے نام سے تصنیف کی، جس کا تعارف ”حدیث“ کے عنوان کے ذیل میں پیش کیا جا چکا ہے۔ مناظرے کی مجلسوں میں کہیں مولانا نے باقاعدہ تقریر کی تو کہیں پر آپ کی حیثیت سرپرست اور مرجع کی رہی۔ مولانا اعظمی کے ساتھ مناظرے کی مجلسوں میں اکثر مولانا عبداللطیف نعمانی بھی شریک رہا کرتے تھے۔

آئندہ صفحات میں مولانا کی مناظرانہ تحریروں کو پیش کیا جا رہا ہے، جو علمی، تنقیدی اور مناظرانہ نقطہ نظر سے ایک اہم تراث علمی ہے۔

رد شیعیت

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے شیعیت یا رافضیت کے رد و ابطال میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، شیعیت کی بیخ کنی اور اس کے اثرات کو مٹانے میں آپ کی گرانقدر خدمات قابل ذکر ہیں۔ شیعیت کے رد میں مولانا کے کارناموں کی شہادت خود ان کی تصنیفات، رسائل اور مضامین سے ملتی ہے۔

شیعہ حضرات کے ساتھ مولانا الاعظمی کے تقریری مناظرے کا کوئی تحریری ثبوت راقم الحروف کی نگاہ سے نہیں گزرا، البتہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی مجاہد ملت کے دو خط ضرور ملتے ہیں، جن کے ذریعہ مولانا سیوہاروی نے مولانا حبیب الرحمن صاحب کو انصاری شیعہ عالم کے خلاف تقریر کی دعوت دی تھی۔ شیعہ عالم نے برادری کی بنیاد پر شیعیت کی تبلیغ شروع کی تھی، بعض سنی اس تبلیغ سے متاثر بھی ہوئے۔ مولانا الاعظمی کو سیوہارہ یا امر وہہ تقریر کے لئے بلائے جانے میں ایک خاص مصلحت یہ بھی تھی کہ مولانا کا تعلق بھی اسی برادری سے تھا۔ لیکن مولانا سیوہارہ یا امر وہہ تقریر کے لئے گئے یا نہیں، اس کی تصریح نہیں ملتی، ڈاکٹر مسعود احمد بھی حیات ابوالہماثر میں ان دو مکتوبوں کو نقل کر کے خاموش نظر آتے ہیں۔

امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنؤی سے مولانا الاعظمی کا خاص تعلق تھا، ہم آئندہ کسی مناسب موقع پر اس کا تذکرہ کریں گے۔ مولانا عبدالشکور صاحب کی روافض کے خلاف خدمات اور نمایاں کارناموں سے عوام و خواص بخوبی

واقف ہیں، ان کا رسالہ ”النجم“ تو رد شیعیت کے لئے ہی وقف تھا۔
 چنانچہ اس کا اثر امام اہلسنت کے رفیق مولانا الاعظمیٰ پر بھی پڑا اور انہوں نے
 بھی شیعیت کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ مولانا اعظمیٰ نے روافض و شیعیت کے خلاف
 متعدد رسائل مولانا فاروقی کے ہی ایماء اور فرمائش پر تصنیف فرمائے۔ چنانچہ اب ہم
 رد شیعیت میں مولانا کی بعض مناظرانہ تحریروں کو پیش کرتے ہیں۔

دفع المجادلہ عن آیت المہابلہ

شیعہ حضرات نے واقعہ مہابلہ کو ایک الگ تناظر میں دیکھا اور اس وجہ سے
 اسے غیر معمولی اہمیت دی، آیت مہابلہ سے حضرت علیؑ کی دیگر صحابہ پر افضلیت اور
 آپ کی خلافت بلا فصل ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور ایک ایسا بھی دور آیا کہ
 بمبئی کے شیعہ ”عید مہابلہ“ بھی منانے لگے اور اس طرح ایک نئی عید کا اضافہ ہو گیا۔ بعض
 سنیوں نے بھی اس انوکھی رسم میں حصہ لیا اور اس کو قرآن و سنت کے مطابق سمجھا۔

”عید مہابلہ“ کے سد باب کے لئے مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی
 لکھنؤی نے آیت مہابلہ کی تفسیر لکھی اور یہ واضح کیا کہ آیت مہابلہ سے صحابہ پر حضرت
 علیؑ کی افضلیت اور ان کے خلیفہ بلا فصل ہونے کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ملتا، جو لوگ ایسا
 کہتے ہیں، وہ آیت مہابلہ کے صحیح مفہوم کو مسخ کرتے ہیں۔ مولانا نے یہ بھی واضح کر دیا
 کہ نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ دو عیدوں کے سوا اور کوئی عید نہیں ہے۔

سنی عالم کی آیت مہابلہ کی اس تفسیر کا شیعہ عالم مولانا اعجاز حسن بدایونی نے
 رد کیا اور ”برہان مجادلہ“ کے نام سے اس کو شائع کیا۔ ان کا اصرار اسی پر رہا کہ آیت
 مہابلہ سے حضرت علیؑ کی صحابہ پر افضلیت اور ان کی خلافت بلا فصل کا ثبوت ملتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے شیعہ عالم کا رد فرمایا اور ان کی تصنیف ”برہان مجادلہ“ کے جواب میں ”دفع المجادلہ عن آیت المہابلہ“ تصنیف کی جس میں انہوں نے آیت مہابلہ کے صحیح مفہوم اور مصداق کی تعیین فرمائی اور آیت مہابلہ کی تشریح میں شیعوں کے موقف کا سختی سے رد فرمایا ہے۔

مولانا نے اپنی کتاب میں یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ آیت مہابلہ کی تفسیر کے ذیل میں مولانا عبد الشکور صاحب نے جو لکھا تھا اس کو نقل کرتے ہیں، پھر اس پر ”برہان المجادلہ“ کے مصنف کا جو اعتراض تھا اس کو درج فرماتے ہیں، اور اس کے بعد اہلسنت وجماعت کی طرف سے اس اعتراض کا دفعیہ کرتے ہیں۔ مولانا عبد الشکور صاحب کی عبارت کے لئے ”مولانا“، مولانا اعجاز حسن بدایونی کی عبارت کے لئے ”مجادلہ“ اور اپنی عبارت کے لئے ”دفع“ کے مخففات استعمال کئے ہیں تاکہ واضح طور پر بھی کی عبارت میں فرق رہے اور اعتراض و جواب باسانی سمجھا جاسکے۔

شیعی مصنف نے حضرت علیؑ کی افضلیت پر مسلمہ وجوہ (جن وجوہ میں شیعہ و سنی دونوں متفق ہیں) شمار کی ہیں۔ شیعہ مصنف کی پیش کردہ مسلمہ وجوہ کی عبارت کو مولانا الاعظمی نے ”دفع المجادلہ“ میں نقل کیا اور جن وجوہ کو اعجاز حسن بدایونی نے حضرت علیؑ کی افضلیت کے لئے خاص کیا تھا، مولانا نے ان وجوہ میں حدیث و سیر کی کتابوں کے حوالہ سے دوسرے صحابہ کو بھی شریک و سہم قرار دیا۔ اور یہ بتلایا کہ جب کسی وصف میں حضرت علیؑ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک ہے تو اس وصف کے ذریعہ حضرت علیؑ کی افضلیت ثابت کرنا بے معنی ہے۔

مولانا الاعظمی نے ان وجوہ کو ”مسلمہ وجوہ“ کے بجائے شیعہ حضرات کی ”مختصرہ وجوہ“ قرار دیا اور اعجاز حسن بدایونی کے اس دعوے کی سختی سے تردید کی کہ افضلیت علیؑ میں سنی بھی ان کے شریک ہیں۔ مولانا نے یہ بھی تصریح کر دی کہ صحابہؓ

افضیت علیؑ کو کسی صریح حدیث سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اعجاز حسن کی عبارت اور اس پر مولانا عبدالشکور صاحب کی طرف سے مولانا الاعظمی کے جوابات کے ایک دو نمونے پیش خدمت ہیں:

۱۔ (مجادلہ) الفاظ آیت مباہلہ کے معانی یہی حضرات ہیں ان کے علاوہ اصحاب وازواج میں سے کوئی بھی مراد نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اصحاب وازواج میں سے کسی نے اس کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ان حضرات کی زبانی ان کا دعویٰ کرنا ثابت کیا جائے۔

(دفع) اصول تفسیر سے ثابت کیجئے کہ کسی آیت کے مصداق کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ مصداق خود دعویٰ کرے کہ میں اس آیت کا مصداق ہوں، پھر اس تعیین دعویٰ اور تعیین مصداق میں لزوم ثابت کیجئے، اس کے بعد ہم سے اپنا مطالبہ پورا کرائیے۔ آیہ مجوشہ کے متعلق بھی آل عباء کا دعویٰ خود اس کی زبانی ایسی روایات سے ثابت کیجئے کہ جس پر شیعہ و سنی دونوں متفق ہوں۔

۲۔ (مجادلہ) دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور ختم الانبیاء نے اپنے صحابہ وازواج کو ہمراہ نہ لے کر اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں سے کوئی مصداق آیت نہیں۔

(دفع) اولاً تو یہی غلط ہے کہ اور کوئی ہمراہ نہ تھا اور اگر آپ اپنے قول پر مصر ہیں تو آپ اپنے امام معصوم (امام باقر) کی تکذیب کر رہے ہیں۔ ثانیاً مباہلہ کا واقعہ نہیں ہوا اس لئے قبل از وقت کسی کو ہمراہ لینے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہی مصداق آیت ہے ہاں اگر مباہلہ ہوتا اور کوئی ساتھ نہ ہوتا تو ممکن تھا۔

۳۔ (مجادلہ) تیسری دلیل قول جابر انصاری ہے جو موقع پر حاضر تھے۔ قال جابر انفسنا رسول اللہ ﷺ و علی و نساءنا فاطمة و ابنانا الحسن والحسین۔

(دفع) اولاً جابر کی طرف اس قول کی نسبت پر کلام ہے۔ ابن کثیر میں ہے ہکذا رواہ الحاكم في مستدرکه (الی قولہ) وقد رواہ ابو داؤد الطيالسي عن شعبة عن المغيرة عن الشعبي مرسلًا وهذا أصح۔ ثانیاً جب حضرت جابر موقع پر حاضر تھے تو آپ نے دوسری دلیل میں یہ کیسے کہہ دیا کہ حضور نے اور کسی کو ہمراہ نہ لیا۔

”دفع الجادلہ“ مناظرانہ تکنیک سے لیس ایک علمی کتاب ہے۔ زبان اور لہجہ تقاضائے مناظرہ کے مطابق کہیں گرم کہیں نرم ہے، لیکن اس کے باوجود آیت مہلبہ کی تفسیر و تشریح کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس کی اہمیت اس لئے مزید بڑھ جاتی ہے کہ یہ کتاب اس کتاب کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے، جس میں اس آیت سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کئے گئے ہیں۔

چنانچہ ”دفع الجادلہ“ میں آیت مہلبہ سے متعلق سنیوں پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا اطمینان بخش جواب موجود ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل ”دفع الجادلہ“ مطبع عمدة المطابع لکھنؤ میں چھپ کر ”النجم“ کے صفحات پر شائع ہوئی۔ ”دفع الجادلہ“ شیعوں کے رد میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی غالباً پہلی تصنیف ہے، جیسا کہ اس کا اشارہ حیات ابوالماثر کے مصنف کے اس جملہ سے ملتا ہے:

”آگے چل کر علامہ اعظمی نے شیعوں کے رد و ابطال میں جو عظیم

الشان کارنامے انجام دیئے، یہ کتاب گویا اس کا دیباچہ ہے۔“ ۲
خیر یہ پہلی تصنیف ہو یا نہ ہو، مگر ماہر فن کی تصنیف ضرور معلوم ہوتی ہے۔

تنبیہ الکاذبین بجواب تنبیہ الناصبین

اہل سنت و جماعت کی طرف سے بعض ایسی تحریریں منظر عام پر آئیں جن میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ شیعوں کا ایمان قرآن پر نہیں ہے۔ اور یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اگر قرآن پر ایمان ہے تو شیعہ اسے ثابت کریں۔

جواب میں ۱۳۴۲ھ میں لاہور کے شیعہ مجتہد جناب حاضری صاحب نے ایک رسالہ 'موعظہ تحریف قرآن' تحریر فرمایا۔ اس رسالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کے محرف اہلسنت و جماعت ہیں۔ اس کے جواب میں سنیوں کے ایک مقتدر عالم جناب مولانا عبدالشکور صاحب نے رسالہ 'تنبیہ الحائرین' تحریر فرمایا۔

شیعہ جماعت کی جانب سے جناب مولانا اعجاز حسن بدایونی نے 'تنبیہ الحائرین' کا جواب 'تنبیہ الناصبین' کے نام سے تحریر کیا۔ 'تنبیہ الناصبین' سے قبل اعجاز حسن بدایونی نے قرآن سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جس کا رد ۱۳۴۲ھ میں 'النجم' میں بعنوان 'مولوی اعجاز حسن بدایونی کا جواب' شائع ہوا تھا۔

شیعی عالم اعجاز حسن نے اپنی کتاب 'تنبیہ الناصبین' میں 'النجم' میں شائع مضمون اور 'تنبیہ الحائرین' مؤلفہ مولانا عبدالشکور صاحب دونوں کا جواب دیا ہے۔ اور یہی موقف اختیار کیا ہے کہ سنی حضرات قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں۔

پھر یہ جواب الجواب کا سلسلہ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے 'تنبیہ الناصبین' کا جواب 'تنبیہ الکاذبین' تحریر فرمایا۔ مولانا الاعظمیٰ نے اعجاز حسن بدایونی کے 'در نجف' میں شائع مضمون اور اس پر 'النجم' کے جوابی مضمون اور اس جوابی مضمون پر مولانا اعجاز حسن بدایونی کے جواب 'تنبیہ الناصبین'، ان

تمام کو سامنے رکھ کر اپنا جوابی رسالہ مرتب فرمایا ہے۔

مولانا اعظمی نے "تنبیہ الکاذبین" کے ابتدائی حصہ میں اہلسنت و جماعت کے تحریف قرآن سے متعلق شیعوں کی طرف سے پیش کی جانے والی تمام تحریروں کا اجمالی رد کیا ہے۔ اور قرآن کریم کے بارے میں اہل سنت و جماعت کا عقیدہ بیان فرماتے ہوئے لکھا کہ ہمارے واضح عقیدہ قرآن کی شہرت تو ایسی ہے کہ خود شیعوں مصنفین نے ہی اس کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

”اہل سنت مصحف عثمانی کو قرآن کامل سمجھتے ہیں اور اس کے ناقص ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں۔ شیعوں کے قبلہ مولوی حامد حسین صاحب استقصاء الانبیاء مجلد اول ص ۹ میں لکھتے ہیں ”مصحف عثمانی کہ اہل سنت آں را قرآن کامل اعتقاد کنند و معتقد نقصان آں را ناقص الایمان بلکہ خارج از اسلام پندارند“

مولانا نے اپنے عقیدہ کے ثبوت میں قرآن مجید اور حدیث شریف سے دلائل و شواہد پیش کئے۔ اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کیا کہ سنیوں کی کتابوں میں تحریف قرآن کی ایک بھی روایت نہیں مل سکتی اور نہ ہی کسی سنی عالم کا قول مل سکتا ہے۔ برخلاف شیعوں کے کہ ان کے معتقد تحریف ہونے کے سلسلہ میں دلائل قاطعہ اور ناقابل انکار شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لگے ہاتھوں مولانا نے یہ چیلنج بھی دے ڈالا کہ:

”شیعوں کے مذہب میں بھی کچھ دم ہو تو ایسے ہی دلائل ایسی ہی شہادتیں سنیوں کے خلاف پیش کریں۔“

۱۔ تنبیہ الکاذبین (النجم محرم ۱۳۵۲ھ ص ۶۱)

۲۔ ایضاً ص ۵۷

مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر تحریف قرآن سے متعلق شیعوں کی معتبر مذہبی کتابوں سے کچھ روایتیں بھی پیش کیں، ان میں سے تین روایتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ تفسیر صافی میں بحوالہ تفسیر عیاشی امام باقر سے منقول ہے: **لولا انه زيد في القرآن ونقص ما خفي حقنا على ذي حجب**۔ (اگر قرآن میں بڑھایا نہ گیا ہوتا اور گھٹایا نہ گیا ہوتا تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ ہوتا۔)

۲۔ بحوالہ سابق ولو قرئ القرآن كما أنزل لوجدنا فيه مسمين۔ (اگر قرآن اسی طرح پڑھا جائے جس طرح نازل ہوا ہے تو یقیناً تم قرآن میں ہمارے نام پاؤ گے۔)

۳۔ احتجاج طبرسی میں حضرت علیؑ سے منقول ہے: **انهم اثبثوا في الكتاب ما لم يبق له الله ليلبسوا على الخليفة**۔ (ان منافقوں نے قرآن میں وہ باتیں درج کیں جو اللہ نے نہیں فرمائی تھیں تاکہ مخلوق کو فریب دیں۔)

مولانا الاعظمیٰ نے 'تنبیہ الناصبین' کو 'تنبیہ الحائرین' کا جواب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ مولانا کے مطابق 'تنبیہ الحائرین' کے اس حصے کا جس میں شیعوں کی مذہبی کتابوں سے عقیدہ تحریف قرآن کا ثبوت اور ان کے علماء کے اقرارات پیش کئے گئے ہیں، اس کے ایک لفظ کا بھی جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اس میں تو صرف 'النجم' میں شائع مضمون کا جواب دیا گیا ہے۔ اور تنبیہ الحائرین کی بعض عبارتوں کا ذکر کر کے اسے 'تنبیہ الحائرین' کی بحث دوم کا جواب قرار دیا گیا اور اس کی بحث اول کے جواب کو 'تنبیہ الناصبین' کے حصہ دوم پر ٹال دیا گیا۔

لیکن افسوس کہ مولانا اعجاز حسن بدایونی کا اسی دوران انتقال ہو گیا اور اسی

کے ساتھ 'تنبیہ الناصیین' کے دوسرے حصہ کی اشاعت کی امید بھی ختم ہو گئی۔ دوسری جانب مولانا اعظمی بڑی پختگی اور پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

”تنبیہ الحائرین کی بحث اول کا جواب کسی شیعہ کے امکان میں نہیں ہے۔“

جہاں تک 'تنبیہ الناصیین' کی بات ہے تو مولانا اعجاز حسن صاحب بدایونی اس کتاب میں 'النجم' یا 'تنبیہ الحائرین' کی عبارتیں نقل کرنے میں زیادہ اہتمام برتتے نظر نہیں آتے، حالانکہ کسی کار دیا جوابی مضمون تحریر کرنے میں یہ ایک لازمی عنصر ہے، اور اگر نقل بھی کرتے ہیں تو بہت سوچ سمجھ کر!

لیکن مولانا حبیب الرحمن الاعظمی میں اس کا خاص اہتمام دکھتا ہے۔ انہوں نے 'تنبیہ الناصیین' کے رد 'تنبیہ الکاذبین' میں اعجاز حسن بدایونی کی عبارتیں نقل کر کے جواب دیا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قاری کو اس کی وسعت علم و فہم کے مطابق براہ راست اخذ معانی و مطالب کا موقع ملتا ہے۔

چونکہ اعجاز حسن بدایونی نے سخت ترین انداز تحریر اپنایا تھا: (النجم کو گر گٹ کہا، فساد کی کہا وغیرہ وغیرہ) اس لئے مولانا کے یہاں بھی وہ مجادلانہ اسلوب نگارش تو نہیں البتہ جوابی مضمون کی وجہ سے کہیں کہیں ترکی بہ ترکی جواب کی نوبت آ گئی ہے۔ لیکن اتنا کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ 'تنبیہ الکاذبین' سنیوں پر شیعوں کے تحریف قرآن کے الزامات کا محققانہ اور مضبوط رد ہے۔ مولانا الاعظمی کا یہ رسالہ 'النجم' لکھنؤ ۱۳۵۲ھ میں جلد ۱۱ شمارہ ۵، ۵ اور ۶ میں شائع ہوا۔

ارشاد الثقلین

اہلسنت وجماعت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ و خلفاء کی بزرگی کا قائل نہ ہونا اور ان کی دینداری و تقدس کو شک کی نگاہ سے دیکھنا اور اس میں عیب نکالنا، خود ذات اقدس ﷺ کے دامن تقدس کو داغدار کرنا ہے۔

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ اس میں انہوں نے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کے متعدد اقوال و افعال سے جو شیعہ حضرات کی معتبر کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، ثابت کیا کہ خلفاء ثلاثہ کی نسبت جس تقدس و بزرگی کے اہلسنت قائل ہیں بعینہ وہی حضرت علیؑ کے اقوال و افعال سے بھی ثابت ہے۔ مولانا عبدالشکور صاحب نے اپنے اس رسالہ کا نام ہی ”ابوالائمہ کی تعلیم“ رکھا۔

چونکہ اس رسالہ میں خلفاء راشدین کی تعظیم اور ان کے برحق ہونے کی حمایت کی گئی تھی، اس لئے شیعہ حضرات کی جانب سے اس رسالہ کا رد لکھا گیا۔ چنانچہ ’ابوالائمہ کی تعلیم‘ کے جواب میں امامیہ مشن کی طرف سے مولانا علی نقی صاحب نے ’اتحاد الفریقین‘ تحریر فرمایا۔ اس رسالہ میں انہوں نے حضرت علیؑ کی خلفاء ثلاثہ سے ناراضگی کو ثابت کیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے اہلسنت وجماعت کی جانب سے شیعہ رسالہ ’اتحاد الفریقین‘ کے جواب میں ’ارشاد الثقلین‘ بجواب اتحاد الفریقین‘ تحریر فرمایا۔ مولانا نے سب سے پہلے ’اتحاد الفریقین‘ کے مضامین کی تلخیص پیش کی ہے، جو یہاں نقل کی جا رہی ہے:

۱۔ حضرت امیر کی خلفائے ثلاثہ سے ناراضگی اور ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے کو شیعہ

کے ساتھ علمائے اہلسنت بھی بیان کرتے ہیں۔

۲- ائمہ کے اقوال کا وہ مطلب نہیں ہے جو ابوالائمہ کی تعلیم میں ظاہر کیا گیا ہے بلکہ ان کا دوسرا مطلب ہے۔

۳- ائمہ کے افعال تقیہ پر محمول ہیں۔

مولانا اعظمی نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بحث کی ہے:

- (۱) شیعہ مصنف کے پہلے دعویٰ کی حقیقت (۲) واقعہ نکاح ام کلثومؓ سے اغماض
- (۳) جنگ فارس کے موقع پر حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کو مشورہ دینا (۴) مشورہ غزوہ
- روم (۵) اہل حل و عقد کی بیعت سے خلیفہ و امام کا تقرر (۶) افضلیت شیخین باعتراف
- علیؓ (۷) حضرت معاویہؓ کے حق میں دریدہ دہنی (۸) جناب امیرؓ کا تلوار نہ اٹھانا
- (۹) تقیہ کا جواز

ان کے علاوہ ذیلی عنوانات بھی قائم کئے گئے ہیں اور پوری تفصیل کے ساتھ زیر بحث مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولوی علی نقی لکھتے ہیں کہ حضرت امیر خلفائے ثلاثہ سے برابر ناراض رہے اور ان کی خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، حضرات اہلسنت بھی اس عقیدہ میں متحد ہیں۔ شیعہ مصنف اپنے اس دعویٰ کے لئے دلیل کے طور پر روضۃ الصفا، عقد الثرید، ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ سے تین عبارتیں پیش کیں۔

مولانا اعظمی کو مولانا علی نقی کے اس دعویٰ اور ان کے پیش کردہ دلائل میں کلام ہے۔ مولانا اعظمی کا کہنا ہے کہ ابن ابی الحدید شیعہ و معتزلی ہے لہذا اہلسنت کے سلسلہ میں اس کا نام لینا خیانت ہے، عقد الثرید کی ادبی حیثیت ہے تاریخی حیثیت سے قطعاً قابل اعتبار نہیں، روضۃ الصفا کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کسی سنی عالم نے اس

کو معتبر تاریخ نہیں شمار کیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ اگر وہ کوئی معتبر تاریخ بھی ہو تو اس کا وہ بیان جو قرآن کی نصوص اور فریقین کی روایات صحیحہ کے خلاف ہے کسی درجہ میں لائق التفات نہیں ہو سکتا۔ مولانا اعظمی سید العلماء علی نقی پر اس سلسلہ میں ابن خلدون وغیرہ کی عبارتوں میں قطع و برید کا الزام لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہاں ابن خلدون وابن اثیر کے حوالہ سے آپ نے جو لکھا ہے وہ بیشک قابل توجہ ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے نقل عبارت میں بڑی خیانت سے کام لیا ہے، عبارت کا صرف درمیانی حصہ نقل کر دیا اور اس کا آخری حصہ جس میں صاف مذکور ہے کہ حضرت علیؑ نے شیخین کی خلافت کو خوشی سے تسلیم کر لیا، حذف کر دیا۔ پوری عبارت ملاحظہ ہو: ثم تكلم بعد الحمد لله والثناء وهداية الناس بمحمد ﷺ وخلافة الشيخين وحسن سيرتهما وقد وجدنا عليهما ان توليا ونحن اقرب منهما إلى الرسول ﷺ لكن سمحنا لهما بذلك. (ابن خلدون جلد سوم ص ۱۷۱)

ترجمہ: پھر حضرت علیؑ نے حمد و ثناء اور آنحضرت ﷺ کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت یابی اور شیخین کی خلافت اور ان کے حسن سیرت کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ کہا کہ ہم شیخین کی اس بات پر رنجیدہ ہوئے کہ وہ متولی خلافت ہوئے باوجودیکہ ہم ان کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ سے زیادہ قریب تھے لیکن پھر بھی شیخین کے لئے ہم نے فیاض دلی سے اس حق کو تسلیم کیا۔

مولانا الاعظمی نے اسی انداز پر سید العلماء علی نقی صاحب کا تعاقب کیا اور ان کی گرفت کی۔ طوالت کے اندیشہ سے ارشاد الثقلین کی صرف ایک جھلک پر اکتفاء کیا

کیا ورنہ بحث تو ایسی دلچسپ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ فریقین کے مباحث کو مزید نقل کیا جائے۔ مولانا نے مندرجہ بالا عبارت کے بعد ابن خلدون کی ایک اور عبارت کا ذکر کیا جہاں شیعہ عالم نے حذف و اخفاء سے کام لیا ہے۔ وہ تمام باتیں جو شیعہ عالم نے کہیں، جنکی تلخیص بھی شروع میں پیش کی گئی ہے، انہیں مولانا نے غلط، خلاف واقعہ اور بے دلیل قرار دیا۔ مولانا کا یہ رسالہ 'ارشاد الثقلین' مجلہ 'الداعی' لکھنؤ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں قسط وار شائع ہوا۔

ابطال عزاداری

ایک شیعہ عالم نے ایک رسالہ تصنیف کیا، اس رسالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تعز یہ داری اور اس کے جملہ متعلقات علماء اہلسنت کے نزدیک بھی صحیح اور درست ہیں، بلکہ کارِ ثواب ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کا نام ہی ”عزاداری کی تاریخ اور اس کا ثبوت سنی نقطہ نظر سے“ رکھا۔

مصنف رسالہ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک میں عزاداری کی تاریخ اور اس کے پس منظر کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں علمائے اہلسنت کے اقوال اور تحریریں پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سنی علماء بھی اس کے قائل ہیں اور جو علماء تعز یہ داری کی مخالفت کرتے ہیں وہ سنی حنفی نہیں بلکہ وہابی ہیں۔

علماء اہلسنت کی جانب سے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ نے ”عزاداری کی تاریخ اور اس کا اثبات سنی نقطہ نظر سے“ کے جواب میں ”ابطال عزاداری“ کے نام سے ایک ضخیم رسالہ تحریر فرمایا۔ مولانا نے بھی اپنے رسالہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا، پہلے حصہ میں انہوں نے شیعہ رسالہ کے جزء اول کا خلاصہ پیش کیا

اور اس پر مختصر تبصرہ تحریر فرمایا، اسی حصہ میں شیعہ مؤلف کی مغالطہ آمیز تحریروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا رد بھی کیا۔ اور دوسرے حصہ میں مولانا نے تعزیہ داری کے عدم جواز کے سلسلہ میں عرب و عجم کے کبار علماء اہلسنت کے فتاویٰ اور تحریروں جمع کی ہیں۔ اس حصہ میں کسی کی وفات پر گریہ و ماتم کا حکم، سیدہ کو بی و غیرہ کا حکم، تجدید غم کے لئے مصیبت کو بالقصد یاد کرنا، ترک زینت اور سوگ، کیا تعزیت گریہ و بکا کا نام ہے؟، نقش نعل شریف اور تعزیہ کا فرق، تعزیہ کی تعظیم جیسے عنوانات قائم کر کے تعزیہ داری سے متعلق جملہ امور کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔

اس رسالہ کا بنیادی مقصد اس چیز کی نفی کرنا ہے جس کو شیعہ عالم نے ثابت کرنا چاہا ہے یعنی تعزیہ داری کا اثبات سنی نقطہ نظر سے۔ مولانا کا ماننا ہے کہ عزاداری وغیرہ شیعہ فرقہ کی بدعت ہے اہل سنت والجماعت کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔

مولانا اعظمی کا شیعہ مؤلف پر ایک بنیادی اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے رسالہ کا نام تو 'عزاداری کی تاریخ اور اس کا اثبات سنی نقطہ نظر سے' رکھتے ہیں لیکن جگہ جگہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں شیعہ مصنفین کا، مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں صفحہ ۱۲ پر کاظم زادہ، صفحہ ۱۳ پر حدائق الوردیہ اور صفحہ ۱۴ پر عبد اللہ زنجانی کی عبارتوں کا حوالہ دیا ہے۔

شیعہ مصنف کی کچھ عبارتوں کی تلخیص اور ان پر مولانا کی تنقید و تبصرہ کی صرف ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے تاکہ فریقین کے انداز تحقیق کا کچھ اندازہ ہو سکے، شیعہ مصنف کے مطابق:

- ۱۔ شہادت حسینؑ کے بعد عزاداری معنی گریہ و ماتم کی ابتداء زید کے گھر سے ہوئی۔ (ص ۵)
- ۲۔ حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد سے تین سو برس تک عشرہ محرم میں رونے پٹنے کی

رسم کا کہیں وجود نہ تھا، ۳۵۲ھ میں سب سے پہلے معز الدولہ دیلمی (شیعہ) نے صرف
دسویں محرم کو بغداد میں حضرت کے ماتم کرنے کا حکم نافذ کیا اور اس کے بعد ۳۶۳ھ
میں المعز لدین اللہ فاطمی نے مصر میں بھی حکم جاری کیا۔ (ص ۱۰-۱۱)

۳- مصر و ایران وغیرہ میں عزائے حسین صرف شیعان علی سے مخصوص ہے۔ (ص ۱۹)
۴- ہندوستان کے سوا دنیا میں کہیں بھی تعزیے نہیں بنتے اور ہندوستان میں بھی
آٹھویں صدی تک اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ (ص ۳۰-۳۱) ۱

مولانا اعظمی مندرجہ بالا عبارتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تمہیداً لکھتے ہیں:

۱- یزید کے گھر سے اس کی ابتداء ہونے کا ذکر شیعوں کی نہایت معتبر و مستند کتابوں میں
بھی ہے۔

۲- مولانا نے ناسخ التواریخ، منہج، جلاء العیون کے حوالہ سے لکھا کہ خود یزید نے اپنی
بیوی کو نوحہ و زاری کرنے کا حکم دیا۔

۳- معز الدولہ دیلمی نہایت غالی شیعہ بلکہ تبرائی رافضی تھا، جس کا شیعہ ہونا شیعہ
مصنفین و محققین کو بھی قبول ہے۔

۴- مولانا نے تاریخ الخلفاء کے حوالہ سے لکھا کہ المعز لدین اللہ جس نے مصر میں رسم
ماتم کی بنیاد ڈالی تھی، ایک مجوسی النسل بے دین رافضی تھا۔ اس تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

”جس رسم کی بنیاد یزید نے ڈالی ہو اور معز الدولہ والمعز نے اس کو ترقی

دی ہو ظاہر ہے کہ ایک غیرت مند سنی کو اس سے جس قدر بھی نفرت ہو کم

ہے، یہی وجہ ہے کہ مصر، شام اور ایران و افغانستان وغیرہ میں یہ رسم

صرف شیعہ ادا کرتے ہیں۔“ ۲

۱- ابطال عزاداری (الداعی لکھنؤ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ ص ۱۸-۱۹)

حیرت ہے! حضرت حسینؑ سے محبت کا کیا یہی ثبوت ہے کہ جو رسم یزید کے گھر میں جنم لے، اسے جزو ایمان قرار دیا جائے؟ اور سنت رسول کے بجائے سنت یزید فروغ پائے! مولانا اعظمی نے عزاداری، تعزیہ سازی وغیرہ کے عدم جواز کے سلسلہ میں جن علماء و فقہاء اور مفتیان کرام کے فتاوے اور آراء جمع کئے ان کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

- (۱) شیخ ابن حجر مکی (۲) علامہ محمد طاہر پٹنی (۳) سید شریف سمہودی (۴) علامہ محمد حیات سندھی ثم المدنی (۵) علامہ مقریزی (۶) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۷) برہان الدین بخاری (۸) ابوالرجاز اہدی (۹) ملا احمد رومی (۱۰) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱) سید احمد شہید (۱۲) مولانا الہی بخش (۱۳) مولانا خرم علی (۱۴) مولانا شاہ ابوالحسن نصیر آبادی (۱۵) مولانا سخاوت علی جوہپوری (۱۶) مولانا محمد عباس بن ناصر علی مؤرخ بن علامہ فضل اللہ جاجموی (۱۷) مولانا شاہ کرامت علی جوہپوری (۱۸) مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی (۱۹) مولانا حکیم لطف اللہ مفسر لکھنوی (۲۰) مولانا نواب قطب الدین خاں دہلوی (۲۱) مولانا شہود الحق بہاری کافتوی مع تائید مفتی سعد اللہ، مولانا ارشاد حسین رامپوری (۲۲) مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۲۳) مولانا احمد رضا خاں بریلوی۔

مندرجہ بالا علماء کی تصریحات و فتاویٰ کے بعد مولانا اعظمی نے مولانا روم کی مثنوی کے کچھ اشعار بھی پیش کئے، جن میں انہوں نے رسم ماتم کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے شیعہ عالم کے پیش کردہ بعض سنی علماء کے فتاوے کا بھی ناقدانہ تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ بعض علماء کی طرف جواز تعزیہ داری کے فتاوے غلط منسوب ہیں، یا جو ایک دو ہیں بھی تو وہ قابل اعتناء نہیں یا ان علماء کے فتاوے کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

مولانا اعظمی کی تصنیف ”ابطال عزاداری“ مناظرانہ رنگ میں ایک علمی کتاب ہے۔ اگرچہ یہ رنگ کہیں کھلتا، کہیں دہتا نظر آتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مصنف کے لئے مناظرانہ تحریر میں علم کی آبرو اور قلم کی عصمت کو بچائے رکھنا بہت اہم اور نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے علم کی سنجیدگی اور قلم پر گرفت دونوں برقرار رکھی ہے۔

’ابطال عزاداری‘ میں متفرق طور پر کچھ ایسی اہم باتیں یا نکات بھی آگئے ہیں جن کے بارے میں عوام کو مغالطہ ہے یا پھر انہیں معلوم نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ متفرق طور پر پیش کئے جائیں تاکہ اس کتاب کی علمی افادیت کا اندازہ ہو سکے، وہ نکات یہ ہیں:

- ۱- عزاداری بمعنی گریہ و ماتم کی ابتداء یزید کے گھر سے ہوئی۔
- ۲- تیمور لنگ کو تعزیہ داری کا موجد قرار دینا عامیانہ روایت ہے۔
- ۳- ہندوستان میں عالمگیر کے زمانہ سے پہلے تعزیہ کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔
- ۴- حضرت حسینؑ کو ذبح کرنے کی ملعون حرکت شمر سے نہیں بلکہ سنان نخعی سے صادر ہوئی تھی۔
- ۵- مؤرخین کی تصریحات کے مطابق ۱۲۳ھ سے تصنیف و تالیف کی ابتدا ہوئی۔
- ۶- ۶۱ھ تک تحریری استفتاء یا محضر نامہ لکھنے و لکھوانے کا دستور نہیں تھا۔
- ۷- بابا ارتن ہندی ایک طویل العمر شخص تھے، نہ صحابی تھے نہ تابعی، ان کی طرف منسوب حدیثیں جعلی ہیں۔
- ۸- ہر بے جان کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے جیسے صلیب وغیرہ۔
- ۹- فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمعیلؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں تھیں، حضور ﷺ نے انہیں کعبہ سے نکلوا یا اور ان کو مٹوا دیا۔
- ۱۰- بخاری کی ایک روایت ہے کہ عاشوراء کے دن کعبہ کو غلاف بھی پہنایا جاتا تھا۔

مندرجہ بالا نکات 'ابطال عزاداری' سے بغیر ترتیب کے مختلف جگہوں سے نقل کئے گئے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کا یہ رسالہ مجلہ 'الداعی' لکھنؤ جلد ۵: شمارہ ۶: ۶ سے ۱۲ بابت ماہ جمادی الاخریٰ تا ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوا۔ اس رسالہ کا آخری حصہ یعنی اکابر مشاہیر علماء اہل سنت کے فتوے ماہنامہ الفرقان بابت ماہ ربیعین و جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ میں الگ سے بھی شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی مصنف حیات ابوالمآثر اور ان کے علاوہ بعض تذکرہ نگاروں نے الفرقان میں شائع اکابر کے فتاوے کو مولانا اعظمی کی ایک مستقل تصنیف شمار کیا ہے۔ اور 'ابطال عزاداری' اور عزاداری سے متعلق اکابر کے فتاوے کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے 'الفرقان' میں جو شائع ہوا ہے وہ 'ابطال عزاداری' کا ہی حصہ ہے۔ دلیل میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی وہ تمہید پیش ہے جو 'الفرقان' میں شائع "جملہ مراسم عزاداری کے متعلق اکابر و مشاہیر علماء اہلسنت کے فتوے" کے شروع میں انہوں نے لکھی تھی، فرماتے ہیں:

"میرا یہ پورا رسالہ..... ضخیم ہو گیا ہے، اس لئے بعض احباب کے مشورہ کی بنا پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کا آخری حصہ (علماء کے فتاوے) الگ بھی شائع کیا جائے تاکہ فائدہ کا دائرہ وسیع تر ہو۔"

تعدیل رجال بخاری

اسلامی تعلیمات کے اصل مآخذ قرآن و حدیث کی استنادی حیثیت کو متاثر کرنے کے لئے ان میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ اسلام دشمن عناصر نے اسلام کی صورت مسخ کرنے اور حدیث کو غیر معتبر ثابت کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی عظمت کو مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ حدیث کی استناد پر حملہ کرنے والوں میں شیعیت نے بھی اپنے خوب جوہر دکھائے۔

اس فرقہ نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کے امین صحابہ کرام، ازواج مطہرات، تابعین، محدثین جیسی برگزیدہ شخصیتوں پر طعن و تشنیع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شیعوں کی تخریبی کارروائیوں سے واقفیت کے لئے زیر تبصرہ مرزا عبدالحسین لکھنوی کی تصنیف 'رجال بخاری' کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہوگا۔ مرزا لکھنوی نے مستند مجموعہائے حدیث کے صحیح ترین مجموعہ 'بخاری شریف' کے راویوں پر کلام کیا ہے۔

حالانکہ یہ بات غیروں کے یہاں بھی تسلیم شدہ ہے کہ حدیث شریف کی حفاظت کی خاطر اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین اور رواۃ کی زندگی کے تمام گوشوں کی جانچ پرکھ میں جو اعلیٰ ترین معیار مقرر کیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں جس قدر اہتمام برتا گیا، ایسا اہتمام اور ایسا معیار نقد کسی اور علم و فن میں نظر نہیں آتا۔ جانچ کے ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اہل فن نے یہ فیصلہ کیا کہ 'بخاری شریف' حدیث کا سب سے صحیح اور پاکیزہ مجموعہ ہے۔

لیکن شیعہ عالم نے حدیث کی صحت کے سلسلہ میں ان تمام احتیاط و تدابیر کو نظر انداز کرتے ہوئے رجال بخاری پر جرأت نقد کی، بلکہ یہ کہنا حقیقت کے عین

مرادف ہوگا کہ مرزا لکھنوی نے رجال بخاری پر دشنام طرازی کی۔ انہوں نے اس کتاب کا نام ہی 'رجال بخاری' رکھا۔

جب 'رجال بخاری' منظر عام پر آئی تو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے احادیث رسول پر مرزا عبدالحسین لکھنوی کے اس سفاکانہ حملے کا سخت نوٹس لیا اور ایک اہم دینی فریضہ سمجھتے ہوئے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی سے 'رجال بخاری' کا جواب لکھنے کی فرمائش کی۔

مولانا اعظمی جن کا میدان عمل حدیث اور رجال حدیث کی تحقیق و تنقید تھا، نے رداۃ بخاری کے دفاع کو سعادت عظمی سمجھا، اور رجال بخاری کے رد میں منہمک ہو گئے۔ ان کے انہماک کا اندازہ ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۳۵۸ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو لکھا تھا۔ اس خط کا چھوٹا سا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”آج کل ایک شیعہ رسالہ (رجال بخاری) کے رد میں منہمک ہوں.....

اس کے رد میں اتنا انہماک ہے کہ بجز درس و فرائض شرعی و ضروریات کے اور کوئی کام نہیں ہوتا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔“

مولانا اعظمی نے مولوی مرزا عبدالحسین لکھنوی کی ریت پر قائم تحقیق یعنی فریب اور غلط بیانیوں کو ڈھا کر اس شیعہ عالم کے مستشرقانہ انداز کے بالقابل محدثانہ و محققانہ انداز سے حق و باطل کے درمیان خط فاصل کھینچ دیا۔ مرزا عبدالحسین لکھنوی نے مسلمانوں کو جہاں جہاں دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے اور مولانا اعظمی نے اس پر جو گرفت کی ہے، اس کے کچھ نمونے نذر ناظرین ہیں:

۱۔ مرزا صاحب نے شمر بن ذی الجوشن قاتل حسینؑ کو صحیح بخاری کا راوی

لکھ دیا ہے۔ (رجال بخاری ۲: ۲۹)

مولانا اعظمی نے اس پر گرفت کی کہ صحیح بخاری و مسلم تو کیا صحاح ستہ کی کسی کتاب میں شمر بن ذی الجوشن سے روایت نہیں ہے۔ دلیل کے طور پر مولانا نے لکھا کہ تقریب، تہذیب اور خلاصہ وغیرہ جن میں صحاح کے جملہ راویوں کا ذکر ہے، میں شمر ابن ذی الجوشن کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا صحاح کا باند از تحدی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مصنف رسالہ اپنے تمام اعوان و انصار کو اکٹھا کر کے ان کتابوں میں شمر

ابن ذی الجوشن کی روایت نکال دیں تو جو انعام مانگیں حاضر ہے۔“

مولانا اس مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ فقط ترمذی میں شمر نام کے ایک راوی کی روایت ہے جو شمر بن ذی الجوشن نہیں ہے بلکہ شمر بن عطیہ ہے۔

۲- حارث بن یزید پر شیعہ مؤلف نے الزام لگایا کہ: ”قاتلین حسین میں سے ہے، کر بلا میں موجود تھا۔“ مولانا نے اسے سراسر جھوٹ قرار دیا، اخبار طوال میں جس حارث کی نسبت یہ لکھا ہے اس کے دادا کا نام رویم ہے، اور جو حارث بخاری وغیرہ کا راوی ہے اس کے دادا کا نام کسی نے بھی رویم نہیں بتایا ہے۔

مولانا مزید لکھتے ہیں کہ جو حارث بخاری کا راوی ہے عقلاً بھی ممکن نہیں کہ وہ کر بلا میں موجود ہو سکے؛ اس لئے کہ وہ ابراہیم نخعی کا شاگرد ہے اور ابراہیم واقعہ کر بلا کے سال بہت سے بہت چودہ برس کے ہوں گے تو ان کا شاگرد ان سے بھی کم عمر ہوگا لہذا وہ اس میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

ہم نے صرف دو مثالیں پیش کیں ورنہ تو مولانا نے دو سو سولہ صفحات میں رجال بخاری کا رد لکھا ہے۔ مولانا اعظمی نے اپنی اس کتاب کا کیا نام رکھا، ڈاکٹر

مسعود احمد الاعظمی نے کچھ یوں روشنی ڈالی:

”حضرت محدث کبیرؒ کی فائلوں میں اس کتاب کے دو نام آپ ہی کے رکھے ہوئے مل گئے، ان میں سے ایک نام ’ضرب کاری بر مطاعن رجال بخاری‘ اور دوسرا ’تعدیل رجال بخاری‘ تھا۔“ ۱

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا الاعظمی کی یہ کتاب اسم بالمسمیٰ یعنی ضرب کاری ہے۔ علم و تحقیق کی دوا، ہم شخصیات حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کتاب پر تقاریر لکھیں۔ امام اہلسنت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھتے ہیں:

”حق یہ ہے کہ اہل سنت کے ذمہ ایک قرض تھا جس کو مولانا ممدوح نے ادا کیا، مؤلف رجال بخاری کی خیانت اور جہالت کی کارروائیاں جو گرفت کی ہیں وہ ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔“ ۲

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی رائے کا اظہار یوں فرمایا:

”مولانا نے میری تحریک سے اس کو لکھنا شروع کیا، جواب بے حد متین، سنجیدہ، مدلل اور فن و تحقیق کے اعتبار سے کافی شافی ہے، اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے۔“ ۳

راقم الحروف کا جہاں تک خیال ہے تو فن رجال میں یہ کتاب مولانا اعظمی کی وقت نظر، وسعت معلومات اور اس فن سے متعلق ہر نشیب و فراز سے واقفیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ کتاب اس حیثیت سے ہی مفید نہیں کہ اس کا مطالعہ صرف ’رجال بخاری‘

۱۔ تعدیل رجال بخاری ص ۲۰

۲۔ ایضاً ص ۱۲

۳۔ ایضاً ص ۱۳

کے رد کے ہی نقطہ نظر سے ہو بلکہ اس کا اہم اضافی فائدہ یہ بھی ہے کہ رجال بخاری سے متعلق معلومات اور تنقیدات کے سلسلہ میں کافی کچھ مواد اس میں موجود ہے، اردو زبان میں اس طرح کی تصنیفات کم دیکھی جاتی ہیں۔

اس کتاب کو اجمع علمی مئو نے مولانا الاعظمی کے رکھے ہوئے دو ناموں میں سے مؤخر الذکر 'تعدیل رجال بخاری' کے نام سے ۱۴۲۳ھ ۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ رسالہ مجلہ 'المآثر' (جلد: ۳ ش: ۴ سے جلد: ۷ ش: ۴) 'رد رجال بخاری' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

رد الہمدیث

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ایک پختہ کار حنفی عالم تھے۔ حنفیت کے دفاع میں ہمیشہ کمر بستہ نظر آتے۔ الہمدیث حضرات کی جانب سے کئے جانے والے ایک ایک اعتراض اور ہر اشکال کا انہوں نے بڑے پرزور انداز میں رد کیا، اور احناف دشمنی پر مبنی غیر مقلدین کی افتر پردازیوں کو غوام کے سامنے اجاگر کیا۔

فرقۃ الہمدیث کے ساتھ مولانا کے تحریری مناظرے بہت مشہور ہیں، الہمدیث حضرات کے رد میں آپ کی تصنیفات کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آگے چل کر ہم آپ کی بعض مناظرانہ تحریروں کو ناظرین کے سامنے پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ مولانا اعظمی نے غیر مقلدین کے خلاف باقاعدہ تقریری مناظرے بھی کئے، دو تقریری مناظروں کا ذکر خاص طور سے کتابوں میں ملتا ہے۔ ایک بڑھئی کا، دوسرا مہوا بسم اللہ کا۔

یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فرقۃ الہمدیث کے رد میں مولانا حبیب الرحمن صاحب کی تصنیفات اور مناظروں میں ان کی شرکت ذاتی عناد کا ثمرہ نہ تھی، بلکہ یہ سب کچھ غیر مقلدین کے اس الزام کے رد عمل میں تھا جو وہ احناف پر لگاتے ہیں کہ احناف کا مسلک حدیث سے دور محض قیاس آرائیوں اور تخیلات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں خود مولانا الاعظمی کا بیان ملاحظہ کیجئے جس کے ناقل مفتی ظفر الدین صاحب مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ہیں:

”مجھے کسی سے عناد نہیں ہے۔ حدیث میں نماز کے سلسلہ میں متعدد

روایتیں آتی ہیں ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا

جائے، جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے لیکن جب وہ حنفیوں کو طعنہ

دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے قیاس پر عمل پیرا ہیں تو اس وقت سوچو کیسے خاموش رہا جائے۔“

مولانا حبیب الرحمن صاحب جیسے حنفی عالم کا مسلکی اختلاف کے باوجود اس طرح کہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، ایک سخت نقاد اور بے باک مناظر سے ایسی امید نہیں کی جاتی، اس سے مولانا کی صاف گوئی اور وسعت ظرنی کا اندازہ ہوتا ہے۔

برہمنی نیپال کی سرحد پر بستی کا ایک گاؤں ہے۔ غیر مقلدین نے اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اس جگہ کو بہت موزوں سمجھا اور یہاں غیر مقلدیت کو خوب ترویج دی۔ اس فرقہ کے ماننے والوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا لیکن یہ بھی خوب ہے کہ اسی فرقہ کے ایک نوجوان نے علم بغاوت بلند کیا، غیر مقلدیت کا پروردہ اور تربیت یافتہ بجائے اس کے کہ اس کا سہارا بننا خود اسی کے لئے وبال جان بن گیا، اور اس نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس میں حنفی علماء کو دعوت تخرن دی۔ ان علماء میں بطور خاص قابل ذکر شخصیات یہ تھیں: مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی، مولانا عبدالشکور صاحب مرزا پوری، مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا محمد ایوب مئوی۔

اس جلسہ کی کامیابی کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ عین اسی وقت تین افراد نے تبدیلی مسلک کا اعلان کیا۔ اس واقعہ کے نتیجہ میں اہلحدیث حضرات نے احناف کو مناظرہ کا چیلنج دے ڈالا۔ اس چیلنج کو مولانا اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی نے قبول کیا اور دونوں حضرات بستی پہنچ گئے لیکن شرائط مناظرہ طے نہ ہو سکنے کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔ جلسہ کا انعقاد اور مناظرہ کا چیلنج دونوں ۱۹۲۹ء کے دوران کے واقعے ہیں۔

مہوا۔ بسم اللہ ضلع گونڈہ کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا، یہاں بھی جلسہ منعقد ہوا۔
 حنفی المسلمک عالم مولانا حفیظ اللہ صاحب نے احناف کے علماء میں سے مولانا
 عبدالشکور صاحب لکھنوی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی کو اس
 جلسہ کے لئے دعوت دی۔

دوسری جانب اہلحدیث نے بھی اپنے بزرگ اور جید عالم مولانا ثناء اللہ
 امرتسری کو بلایا تھا۔ دونوں جماعتوں کے اسٹیج آسنے سامنے لگائے گئے تھے۔ مولانا
 امرتسری نے قرأت خلف الامام کا موضوع پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلے حنفی عالم تقریر
 کرے۔ مولانا عبدالشکور صاحب نے اپنے میں سے ایک نوجوان عالم مولانا حبیب
 الرحمن الاعظمی کو تقریر کرنے کو کہا۔ مولانا عبدالحفیظ رحمائی مولانا حفیظ اللہ خاں کا بیان
 نقل کرتے ہیں کہ:

”مولانا اعظمی جب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو ان کو دیکھ کر ہم لوگوں
 کو حیرت بھی ہوئی اور چہرے بھی اتر گئے کہ غیر مقلدین کے پہاڑ سے
 مقابلہ کے لئے امام اہلسنت نے ایک نوجوان کو اکھاڑے میں اتار دیا
 ہے، اللہ ہی خیر کرے.....“

مولانا اعظمی نے اپنی تقریر یہ کہہ کر شروع کی کہ قرأت خلف الامام سے
 متعلق غیر مقلدین کے استدلال میں مکڑی کے جالوں سے بھی زیادہ ضعف اور
 کمزوری ہے! اور پھر مولانا نے اس موضوع پر احادیث پیش کیں، سند و متن سے جرح
 و بحث کی، مخالفین کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان پر محمد ثناء نقد کیا اور یہ سلسلہ ایک
 رات نہیں بلکہ دو رات تک چلا! دو رات مولانا اعظمی نے قرأت خلف الامام پر تقریر کی
 اور حنفی نقطہ نظر کو بہت پختہ ثبوت کے ساتھ مستدل اور مستند ثابت کیا، اور فریق مخالف

کے موقف کا رد کیا۔ مولانا افضال الحق جو ہر قاسمی لکھتے ہیں:

”غیر مقلدین یہ دیکھ کر دم بخود تھے کہ..... ایک عالم ہے حنفی ہے، جو ان ہے اور اسے ایک موضوع پر سیکڑوں حدیثیں مستحضر ہیں جن کو بلا کسی کتاب اور کاپی کے پڑھتا چلا جاتا ہے.....“

تیسری رات جب مولانا عبدالشکور صاحب نے غیر مقلدین سے مولانا اعظمی کی تقریر کا جواب دینے کو کہا تو کوئی آمادہ نہ ہوا حالانکہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بھی موجود تھے۔ اور اس طرح احناف کی فتح کا سہرا مولانا اعظمی کے سر رہا۔ اسی طرح اہلحدیث کانفرنس کے بالمقابل احناف کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۳ء میں بھی آپ شریک رہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اب ہم غیر مقلدین کے رد میں مولانا اعظمی کی چند مناظرانہ تحریروں کو پیش کریں گے، یہاں اس کی بھی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا کی تمام جوابی تحریروں کو ہم نے ’مناظرہ‘ کے عنوان کے تحت جمع نہیں کیا ہے بلکہ کچھ کا تذکرہ ’فقہ‘ کے عنوان کے ذیل میں بھی کیا گیا ہے۔

السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث

مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے فرقہ اہل حدیث کے نقطہ آغاز اور اس کی تاریخ پر بحث کی ہے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس فرقہ کا وجود قدیم ترین اور سینکڑوں سال پیشتر سے ہے۔ مولانا سیالکوٹی نے اپنی تحقیق میں احناف کے ان خیال کی تردید کی ہے کہ فرقہ اہلحدیث کا وجود ۱۸۹۱ء سے قبل نہ تھا۔ مولانا کی یہ تحقیق امرتسر سے شائع ہونے والے اخبار ’اہلحدیث‘ کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی تحقیق پر تنقید کی

اور یہ واضح کیا کہ مولانا سیالکوٹی کے دعویٰ اور دلیل میں قطعاً کوئی مطابقت نہیں ہے؛ کیونکہ مولانا تاریخ لکھ رہے ہیں اہل حدیث (فرقہ غیر مقلد) کی اور دلیل میں پیش کر رہے ہیں اہلحدیث (محمد شین کرام) کو! جن کا اول الذکر اہلحدیث سے کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

مولانا اعظمی نے ’مواقع استعمال لفظ اہل حدیث و مافی معناه‘ کے عنوان کے تحت اہل حدیث پر بحث کرتے ہوئے ان دو جگہوں کا ذکر کیا جہاں اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اس سے مراد محمد شین ہوتے ہیں، وہ مقام یہ ہیں:

(اول): مصنفین کبھی لفظ اہل حدیث کا اطلاق کرتے ہیں اور اس سے مراد محمد شین ہوتے ہیں۔

مولانا نے اس پہلی قسم کے اطلاق پر مسک الختام جلد: ۱ ص ۱۲، ۲۰، مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱، ۳۳۲، مقدمہ فتح الباری ص ۵۷۰، ۵۷۳، مقدمہ صحیح بخاری سے مولانا احمد علی سہارنپوری کا قول، حجة اللہ البالغہ: ۱ ص ۱۱۸، ۱۱۹، بستان المحدثین ص ۶۶-۶۷، نزہۃ النظر کے حوالہ سے حافظ ابن حجر، شرح نزہۃ النظر کے حوالہ سے ملا علی قاری کے اقوال، تاریخ الخلفاء ص ۱۸۱، ۲۲۶ وغیرہ سے دلائل پیش کئے۔ اور یہ ثابت کیا کہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے جہاں کہیں بھی لفظ اہل حدیث کا استعمال کیا ہے اس سے مراد محمد شین ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

”مولانا کے حوالوں میں جہاں کہیں لفظ اہل حدیث اصحاب الحدیث وغیرہما وارد ہیں ان سے بھی محمد شین، ورثہ علم نبوة اصحاب جرح و تعدیل مراد ہیں۔“

لفظ اہل حدیث کے اطلاق پر مولانا اعظمی کی پیش کردہ دلیلوں میں سے

۱۔ السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث، مشمولہ مقالات ابوالمآثر: ۷۷ مرتبہ ڈاکٹر مسعود احمد

صرف ایک دلیل پیش کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو:-

”وقال الحافظ ابن حجر في مقدمة الفتح: وقال (اي اسحاق بن راهويه) يا معشر اصحاب الحديث انظروا الى هذا الشاب (يعني البخاري) واكتبوا عنه (مقدمه فتح ص ۵۷۰)“۱

(حافظ ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ نے کہا کہ اے جماعت اہل حدیث! اس جوان کو دیکھو اور اس سے حدیثیں لکھو، مراد امام بخاری تھے۔)

(ثانی): کبھی اہل حدیث کا اطلاق اہل الرائے کے مقابل میں ہوتا ہے۔

مولانا نے دوسری قسم کے اطلاق پر ابن خلدون کی عبارت پیش کی، جہاں ابن خلدون نے ذکر کیا ہے کہ فقہ کے دو طریقے رائج تھے:

۱- طریقہ اہل حدیث جو اہل حجاز میں رائج تھا اور اس کے امام مالک، شافعی تھے۔

۲- طریقہ اہل الرائے جو اہل عراق میں مروج تھا اور اس کے امام ابوحنیفہ تھے۔

اہل حدیث حضرات نے احناف کو اہل الرائے کے طعنے دیئے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ احناف اپنی رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے مولانا نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ اہل الرائے سے مراد ترجیح ہے نہ کہ وہ رائے جو کتاب و سنت کے معارض ہو؛ کیونکہ ایسی رائے سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

فرقہ اہل حدیث کے وجود کے سلسلہ میں ابن خلدون کی اس تصریح کی بنیاد پر کہ ابن حزم کے بعد روئے زمین پر صرف دو مذہب: اہل الرائے اور اہل حدیث باقی

۱۔ السیر الحسین الی تنقید تاریخ اہل الحدیث، مشمولہ مقالات ابوالمآثر: ۷۰

ہے، ان کے علاوہ تیسرا کوئی باقی نہ رہا۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں:

”ابن حزم اندلسی کا سن وفات ۴۵۶ھ ہے، لہذا اس وقت سے دسویں صدی تک جو ابن خلدون کا عہد ہے ان دونوں مذہبوں کا مقابل و مقادیم کوئی تیسرا کھڑا نہ ہوا (ابن خلدون کا یہ فقرہ قابل غور ہے و لہم یبقی الا مذہب اہل الراي الخ) نظر بریں کسی کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے اور مؤرخین کی تصریحات اس کی مؤید و مشید ہیں کہ اس جدید فرقہ اہل

حدیث کا حدوث ۱۸۹۱ء ہی میں ہوا ہے۔“

مولانا اعظمی آخر میں اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے دعویٰ ودلیل میں کوئی مطابقت نہیں؛ کیونکہ مولانا دلیل میں پیش کرتے ہیں ان اہل حدیث کو جو اجماع اور قیاس کو حجت مانتے ہیں۔ یعنی امام مالک و شافعی وغیرہ کو اور تاریخ لکھ رہے ہیں ان اہل حدیث کی جو نہ مقلد ہیں اور نہ اجماع و قیاس ان کے لئے حجت شرعی ہے۔

مولانا اعظمی نے یہ مضمون اس وقت لکھا جب وہ دورہ حدیث کے طالب علم تھے، مسودہ کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

”قد فرغت من تألیفہ لخمس وعشرین مضت من ربیع

الأول سنة ۱۲۰۵ھ عام قراءتی الصحاح الست.“

(۲۵/ربیع الاول ۱۲۰۵ھ صحاح ستہ پڑھنے کے سال میں اس مضمون کی

تصنیف سے فارغ ہوا۔)

قابل غور ہے کہ مولانا کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں ہوئی اور ۱۳۴۰ھ میں یہ

المسح الحشیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث، مشمولہ مقالات ابوالآثر ۸۲:۱

۱۵ ایضاً ص ۱۵

مضمون لکھا، عمر کا اکیسواں سال اور تنقید کا یہ انداز! گویا کوئی کہنہ مشق نقاد حدیث ہوا مولانا نے جس قدر مواد یا حوالے فراہم کئے اور جو اندازِ تحریر اختیار کیا ہے وہ کسی ماہر فن کا ہی حق تھا۔ مولانا کی یہ تحریر کس رسالہ میں شائع ہوئی، شائع ہوئی بھی یا نہیں اس سلسلہ میں راقم سطور کو کہیں کوئی صراحت یا اشارہ نہیں ملا، البتہ مولانا الاعظمیٰ کی ہی درج کردہ تحریر سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اشاعت کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ مولانا کی وہ تحریر یہ ہے:-

”یہ تحریر ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۷ھ کو دفتر اہلسنت والجماعت میں بغرض اشاعت روانہ کی گئی۔“

اب یہ مضمون مقالات ابوالہماثر مرتبہ ڈاکٹر مسعود احمد میں شائع ہوا ہے۔

الروض المجود فی تقدیم الركبتین عند السجود

اخبار اہلحدیث دسمبر ۱۹۲۴ء میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا ”سجدہ میں جاتے وقت ہاتھوں کو پہلے رکھنے کی سنیت“۔ اس سلسلہ میں مضمون نگار کی تحقیق کا محور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث ہے، جس میں سجدہ کے وقت ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے رکھنے کا ذکر ہے۔ چونکہ مضمون نگار کے مطابق اس حدیث کے رواۃ ثقہ اور معتبر ہیں کسی قسم کی کوئی جرح اس پر نہیں کی گئی ہے، اس لئے یہ حدیث گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کی روایت سے رائج اور افضل ہے، لہذا اسی حدیث (روایت ابو ہریرہ) پر عمل عین سنت کے مطابق عمل کہلائے گا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کو مندرجہ بالا تحقیق سے اختلاف ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے رد میں ایک رسالہ ”الروض المجود فی تقدیم الركبتین عند السجود“ لکھا۔ السیرۃ الخشیہ الی تنقید تاریخ اہل الحدیث، مشمولہ مقالات ابوالہماثر ۱۵:۱

کے نام سے تحریر کیا۔ اس رسالہ میں انہوں نے احناف کے مسلک یعنی گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کو سنت کے عین مطابق قرار دیا۔

مولانا نے اپنے (احناف) کے مسلک کی تائید میں حضرت وائل بن حجر کی حدیث پیش کی اور احادیث کے مستند مراجع کے حوالہ سے رداۃ پر جرح کرتے ہوئے اور الہمدیث کے اصول مسلمہ کو بھی سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث کو مقبول، صحیح اور قابل احتجاج ثابت کیا۔ اسی طرح مولانا نے مستند حوالوں سے اکثر اہل علم کا عمل بھی اسی حدیث پر ثابت کیا۔ امام ابو حنیفہ، امام احمد، امام شافعی، ابراہیم نخعی، مسلم بن یسار، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، امام ابو حنیفہ کے اصحاب اور اہل کوفہ، صحابہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کے ہی قائل اور اسی پر عمل پیرا تھے۔

اس کے بعد مولانا نے اہل حدیث (غیر مقلد) عالم کی پیش کردہ حدیث ابو ہریرہؓ پر جرح و بحث کی اور امام احمد بن حنبل، ابو حاتم، ابو زرہ، ذہبی کے حوالہ سے اس حدیث کے ایک راوی عبدالعزیز بن محمد کے خرابی حافظہ اور ان کے ناقابل احتجاج ہونے کا ذکر کیا۔ اسی طرح اس حدیث کے ایک راوی محمد بن عبداللہ حسن ہیں جن کے بارے میں امام بخاری کا قول: ”لا یتابع علی حدیثہ“ یعنی وہ غرائب کے راوی ہیں ان کی متابعت نہیں کی جاتی، نقل کیا۔

آگے چل کر حدیث ابو ہریرہؓ اور حدیث وائل کے مساوی ہونے کی صورت میں حدیث وائل کی وجوہ ترجیح بیان فرمائی اور حافظ ابن القیم کے حوالہ سے مخالفین کی تاویلات کو تین وجہوں سے فاسد قرار دیا۔ الہمدیث کے مضمون نگار نے حدیث وائل کی مرجوحیت اور حدیث ابو ہریرہؓ کی راجحیت کی جو وجوہ بتائی ہیں، مولانا الاعظمی نے ان کا بھی جواب دیا ہے، اور اہل حدیث عالم کے اس دعویٰ کو سرے سے باطل قرار دیا

کہ حدیث ابو ہریرہ تمام طرح کی جرحوں سے پاک ہے، فرماتے ہیں:-
 ”یہ بالکل غلط ہے کہ اس حدیث کے تمام رواۃ جرح سے بالکل سالم ہیں
 اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ حدیث ابو ہریرہ حدیث وائل سے ارجح
 ہے۔“

مولانا نے اس مختصر تصنیف میں حدیث اور رواۃ حدیث پر بحث کی ہے
 اور غیر مقلدین کے مسلک کا حدیث کی روشنی میں رد فرمایا۔ چنانچہ احناف پر اتباع
 حدیث سے گریز کے الزام کی بھی تردید ہو گئی۔ اگرچہ اس کتاب کی حیثیت جوابی ہے
 لیکن مناظرانہ اسلوب اور طرز ادا سے یہ تحریر پاک ہے، مولانا پر خالص محدثانہ رنگ
 غالب ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کی یہ کتاب ان کی ابتدائی تصنیفات
 میں سے ہے، غالباً ۱۳۳۳ھ میں لکھی گئی۔ ہم اس تصنیف کا تعارف مقالات ابوالہماثر
 کے حوالہ سے پیش کر رہے ہیں۔ راقم الحروف کے مطابق اس سے قبل شاید یہ تحریر کہیں
 چھپی نہیں ہے۔

حنفیہ کرا اور اتباع حدیث

جن علماء کا اشتغال حدیث کے ساتھ زیادہ رہا اصطلاح میں انہیں ’اصحاب
 الحدیث‘ کہا گیا اور جن علماء کا اشتغال فقہ اور استنباط مسائل و احکام سے زیادہ تھا انہیں
 ’اصحاب الرائے‘ کہا گیا۔

اشتغال اور میدان عمل کی اس تفریق کو ایک دوسرے تناظر میں دیکھا گیا اور
 ’اصحاب الرائے‘ کا ایک جدید مفہوم اخذ کیا گیا کہ یہ وہ اصحاب علم ہیں جو احادیث یا
 فی الروض الجود فی تقدیم الرکتین عند السجود وشمولہ مقالات ابوالہماثر ۱۵۴:۱

نصوص کے ہوتے ہوئے قیاس اور عقل کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرتے ہیں اور اسی پر احکام شرعیہ کی تعیین کرتے ہیں۔ چونکہ احناف کا فقہ اور احکام شرعیہ کے استنباط و استخراج پر زیادہ زور تھا؛ اس لئے انہیں اس طرح کے طعنے زیادہ سننے پڑے اور حاضر میں اس کی اتنی تشہیر کی گئی کہ احناف اور قیاس ایک دوسرے کے مرادف ہو کر رہ گئے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے، جنگی حیثیت احناف میں ایک با اثر وکیل کی ہے، ان اعتراضات کا جائزہ لیا اور حنفیہ کے طرز عمل کا ایک مختصر خاکہ کھینچا کہ ان کے یہاں قیاس کا کیا مرتبہ یا حیثیت ہے اور حدیث و سنت کا انہیں کتنا لحاظ ہے۔ چنانچہ ایک مختصر تحریر قلم بند کی، مولانا کی اس تحریر کا مقصد خود انہیں کی زبانی سنئے:

”چونکہ حنفی مذہب ان بیجا الزاموں سے جو اس کے سر تھوپے جاتے ہیں،

یکسر پاک ہے، اس لئے میں اس مختصر تحریر میں مدافعانہ طریق پر اصولی

اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔“ ۱

مولانا اعظمی نے اپنے اس رسالہ کو حنفیہ کرام اور اتباع حدیث کے نام سے موسوم کیا۔ اولاً مولانا نے امام ابو حنیفہ کی شخصیت، کردار کی مضبوطی اور زہد و تقویٰ جن کا اعتراف اہل حدیث کو بھی ہے، کا جائزہ لیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا امام اعظم کی شخصیت سے ایسی امید کی جاسکتی ہے کہ حدیث کو ترک کر کے اپنی رائے اور قیاس کو ترجیح دیں گے۔ مولانا نے امام ابو حنیفہ کی شخصیت اور ان پر عائد الزام میں صریح تناقض پایا۔ اس کے بعد ابن عبد البر، ابن الشحنة وغیرہما کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ کی اپنے مسلک سے متعلق یہ تصریح نقل کی کہ:

”إذا صح الحديث فهو مذهبي.“ ۲

(جب حدیث کی صحت ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تصریحات اور اقوال درج کئے جن کو نقل کرنے کا یہ موقع نہیں۔

مولانا معترضین کو احناف کے اصول فقہ کے مطالعہ کی دعوت بھی دیتے ہیں، تاکہ انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ حنفیہ کے یہاں رائے اور قیاس کے مقابل حدیث کو کس شان کی حیثیت حاصل ہے۔ احناف کے نزدیک تو خبر آحاد کے ہوتے ہوئے قیاس قابل عمل نہیں۔ قاضی ابوزید و بوسی کی کتاب تائیس النظر کی عبارت ملاحظہ ہو:

”الأصل عند علمائنا الثلاثة أن الخبر المروي عن النبي ﷺ من طريق الآحاد مقدم على القياس الصحيح وعند مالك القياس الصحيح مقدم على الخبر الآحاد“

(ہمارے تینوں علماء کے نزدیک اصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بذریعہ آحاد روایت کی ہوئی حدیث قیاس صحیح پر مقدم ہوتی ہے اور امام مالک کے نزدیک قیاس صحیح خبر واحد پر مقدم ہوتا ہے۔)

یہ بھی خوب ہے کہ امام مالک کے نزدیک قیاس صحیح خبر آحاد پر مقدم ہے تو ان پر تو کوئی الزام نہیں! لیکن حنفیہ جو اس قدر محتاط ہیں کہ ان کے اصول فقہ میں یہ بھی ہے کہ: ”قول صحابی جو خلاف قیاس ہو، کے ہوتے ہوئے قیاس متروک اور غیر مقبول ہے، ہمیشہ طعن و تشنیع کے نشانہ بنتے ہیں!“

مولانا نے ہدایہ سے چند جزئیات بھی پیش کئے جہاں حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا۔ البتہ وہ مسائل جن میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام الحنفیہ نے حدیث چھوڑ دی ہے یا قیاس کو ترجیح دی ہے، ان کے بارے میں مولانا نے حنفیہ کی طرف سے صفائی پیش کی کہ:

”ایسے مسائل میں حدیث سے عدول پر اتباع سنت سے زیادہ ضروری اور اہم امر کی رعایت نے مجبور کیا ہوگا۔ مثلاً حدیث پر اس وجہ سے عمل نہ کیا ہوگا کہ کتاب اللہ کے (بظاہر) مخالف ہے یا کوئی خبر واحد اس بنا پر متروک ہوگی کہ وہ خبر مشہور کے معارض ہے۔“

آگے چل کر علامہ ابن حجر مکی شافعی کی اس عبارت کو نقل کرتے ہیں جہاں ان اسباب و دواعی کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا الاعظمیٰ نے پوری تحریر میں اپنا انداز مدافعت ہی رکھا ہے، کافی کچھ اعتراضات کے جوابات اور مباحث اس مختصر رسالہ کے ضمن میں آگئے ہیں لیکن کیا ہی خوب ہوتا! اگر مولانا کچھ اور تفصیل سے کام لیتے۔ کیونکہ موضوع بہت اہم اور نازک ہے، ضرورت تھی کہ اس موضوع پر مولانا حبیب الرحمن الاعظمیٰ جیسے محدث کے ہاتھوں اردو زبان میں ایک مستند اور مفصل کتاب وجود میں آتی!

لیکن اس کا بھی اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ یہ رسالہ ابتدائی تصنیفات میں سے ہے۔ مختصر ہی سہی لیکن مباحث ضرور یہ کو ایسا محیط ہے کہ گویا کوئی پختہ عمر، پختہ کار حنفی لکھ رہا ہو۔

مولانا الاعظمیٰ کا یہ مضمون سب سے پہلے ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء میں مجلہ القاسم (امرتسر) کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد المآثر اگست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ مقالات ابوالمآثر میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔

تحقیق اہل حدیث

آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس اپریل ۱۹۴۳ء میں مؤآئمہ الہ آباد میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت مولانا ابوالقاسم صاحب بنارس نے کی۔ مولانا نے اپنے خطبہ صدارت میں 'اہلحدیث' کے مسلک پر روشنی ڈالی اور اس کا رشتہ براہ راست قرن اول سے مربوط کیا۔ مولانا نے اپنے موقف کی صداقت میں دلائل بھی دیئے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں احناف کی طرف سے سہ روزہ احناف کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی صدارت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے کی۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ اس کے آخری اجلاس میں مولانا کی تقریر ہوئی، مولانا اعظمی نے اپنی تقریر میں اہلحدیث کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۴۳ء کے خطبہ صدارت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پر نقد و تبصرہ کیا اور مولانا ابوالقاسم صاحب بنارس کے دعوے اور دلائل کے حقائق کو واضح گاف کیا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی یہ تقریر پسند کی گئی اور اس کی اشاعت کا خیال ہوا۔ دراصل تقریر میں اہل حدیث عالم کے خطبہ صدارت کے بعض اجزاء پر ہی تبصرہ کیا گیا تھا، لیکن جب بات اشاعت کی آئی تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ بقیہ اجزاء پر بھی تبصرہ ہو جائے، چنانچہ مولانا اعظمی کے سامنے احباب نے یہ تجویز رکھی، جسے آپ نے منظور کر لیا اور خطبہ کے بقیہ اجزاء پر بھی تنقید و تبصرہ تحریر فرمایا، مولانا کا یہ تنقیدی تبصرہ 'تحقیق اہل حدیث' کے نام سے شائع ہوا۔

مولانا ابوالقاسم صاحب نے خطبہ صدارت میں 'حدیث' کی تعریف اس طرح کی ہے:

”حدیث نام ہے کلام اللہ اور کلام الرسول کا۔“^۱

مولانا اعظمی نے حدیث کی اس تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے غیر مقلدیت کا تازہ کرشمہ بتایا، اور اہل حدیث کے ہی ایک مقتدر عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب کی عبارت پیش کی:

”حدیث در اصطلاح مشہور قول و فعل و تقریر رسول مست علیہ الصلوٰۃ والسلام“^۲

مولانا نے مزید اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی عبارت بھی پیش کی جس میں وہ بھی کلام اللہ کو حدیث سے الگ اور حدیث کو قرآن سے دوسرے درجہ کی چیز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح مولانا اعظمی نے مولانا بنارس کی بنیادی گرفت کی اور ان کی کی ہوئی تعریف حدیث کا رد فرمایا۔

مولانا ابوالقاسم صاحب نے یہ دعویٰ کیا کہ اہل حدیث نام پیغمبر علیہ السلام کا مقرر فرمایا ہوا ہے، اور دلیل میں ایک حدیث پیش کی:

”قیامت میں اہل حدیث سیاہی دانوں سمیت آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ

ان سے فرمائے گا تم اہل حدیث ہو جنت میں جاؤ۔“^۳

مولانا اعظمی نے مندرجہ بالا حدیث کو ذہبی، خطیب اور سیوطی کے حوالہ سے جعلی قرار دیا، اور بفرض محال حدیث کے جعلی نہ ہونے کی صورت میں لفظ ”اہل حدیث“ کی مراد پر بحث کی۔ حدیث کے سلسلہ میں غیر مقلدین کے معیار تحقیق کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

”جب آج کل کے تارک تقلید علماء جعلی اور غیر جعلی حدیث میں تمیز نہیں

کر سکتے تو ان کو براہ راست حدیث سے مسائل اخذ کرنے کا حق کہاں

۱۔ خطبہ صدارت ۳۔ بحوالہ تحقیق الہدیت ص ۹

۲۔ مسک الختام ص ۲۱ بحوالہ تحقیق الہدیت ص ۹

۳۔ تحقیق اہل حدیث ص ۹-۱۰

تک حاصل ہو سکتا ہے۔^۱

مولانا حبیب الرحمن صاحب نے 'اصحاب الہدیث' یا 'اہل الہدیث' کی اصطلاح پر بھی بحث کی، قدیم 'اہل الہدیث' اور جدید 'اہل الہدیث' (غیر مقلدین) میں تفریق کی؛ کیونکہ مولانا ابوالقاسم صاحب نے شرف اصحاب الہدیث کے حوالہ سے اہل حدیث کا لفظ دکھا کر یہ باور کرانا چاہا کہ وہ اسی معنی (غیر مقلدیت) میں اہل حدیث تھے۔

اپنے مسلک کو سلف صالحین کی طرف منسوب کرنے کے لئے اہل حدیث حضرات کے بار بار ترجمہ کے انداز کو بدلنے پر بھی 'تحقیق اہل حدیث' میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ منقبت کی جگہ 'اصحاب الہدیث' کا ترجمہ غیر مقلدین جماعت الہدیث کرتے ہیں، اور جہاں برائی مذکور ہوتی ہے وہاں جماعت الہدیث کی جگہ کوئی دوسری تعبیر اپناتے ہیں۔ مولانا نے ترجمہ کے اس فرق کو واضح کرنے کے لئے کئی مثالیں دی ہیں لیکن ہم یہاں ایک مثال پر اکتفاء کرتے ہیں۔ مولانا اعظمی مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ما قوم خیر من اصحاب الحدیث کا ترجمہ تو یوں کرتے ہیں کہ الہدیث سے بہتر کوئی قوم نہیں (۳۳) لیکن امارت اہل الحدیث کیف تغیروا کیف افسدوا کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ دیکھئے تو یہ طالب حدیث کیسے بگڑ گئے ہیں۔"^۲

مولانا نے آخر میں 'الہدیث' کس کو کہتے ہیں؟ کے عنوان کے تحت اہل حدیث کی تعریف پر بحث کی اور یہ دعویٰ کیا کہ الہدیث کی یہ اصطلاح کہ ایک عام

۱۔ تحقیق اہل حدیث ص ۱۰

۲۔ ایضاً ص ۱۵

نہی کسی امام کی تقلید و اتباع کا قائل نہ ہو، بالکل حادث و بدعت ہے، ایسے اہل حدیث کا وجود اس دور متاخر کے علاوہ اور کبھی نہ تھا۔

مولانا اعظمی کی تقریر سے ایک دن پہلے مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کی تقریر ہوئی تھی۔ غیر مقلدین کو سب سے زیادہ اسی تقریر سے شکایت تھی، چنانچہ الحمد للہ حضرات کچھ غلط مضامین ان کی طرف منسوب کر رہے تھے اس لئے مولانا اعظمی نے تحقیق اہل حدیث میں ایک تتر لکھا جس میں مولانا عبدالشکور صاحب کی تقریر کے پانچ مضامین کا مختصر ترین خلاصہ کے ساتھ تذکرہ کیا؛ تاکہ غیر مقلدین غلط مضمون مولانا لکھنوی کی طرف منسوب نہ کر سکیں۔

تحقیق اہل حدیث کا کچھ حصہ مولانا کے ۱۳۴۰ھ میں لکھے ہوئے ایک مضمون 'السیر الحثیثہ الی تنقید تاریخ اہل الحدیث' سے ملتا جلتا ہے، جس کا تعارف گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ تحقیق اہل حدیث کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں احاف دارالاشاعت والتبلیغ ممبئی سے شائع ہوا۔ اور دوسرا ایڈیشن 'المجمع العلمی' ممبئی سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اور تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب

اہل حدیث (غیر مقلد) عالم مولانا یوسف صاحب فیض آبادی نے ایک اشتہار شائع کیا، جس کا عنوان تھا 'دیوبندیوں سے چند سوالات'۔ مولانا نے ان سوالات کے ذریعہ مسلک اہل دیوبند پر اعتراض کئے تھے اور جواب کا مطالبہ کیا تھا۔ اہل دیوبند کی جانب سے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے غیر مقلدین کے سوالات کے جواب دیئے۔ مولانا کے مطابق یہ سوالات تو درخور اعتناء نہ

تھے؛ کیونکہ اس سے قبل بھی دیوبندی علماء نے اس طرح کے سوالوں کے جواب دیئے تھے۔ لیکن مولانا الاعظمیٰ نے صرف اس لئے ان سوالات کے جواب دیئے کہ جواب نہ دینے کی صورت میں کہیں یہ نہ تصور کر لیا جائے کہ مسلک دیوبند پر ہونے والے اعتراضات کو صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کے جواب پر قدرت نہیں۔

مولانا یوسف فیض آبادی کے سوالات اور ان پر مولانا حبیب الرحمن الاعظمیٰ کے جوابات کے دو نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ سوال و جواب کے معیار کا اندازہ ہو سکے:

سوال ہفتم: حنفیہ کے نزدیک صحابی کو گالی دینا یا بغض رکھنا کفر نہیں ہے۔ (شامی جلد: ۳ ص ۳۵۳) کیا یہ عقیدہ حدیث لا یحبہم إلا مؤمن ولا یبغضہم إلا منافق کے خلاف نہیں ہے۔

جواب: صحابی کو گالی دینا یا بغض رکھنا اہل سنت میں کسی کے نزدیک بھی کفر نہیں ہے۔ اہل سنت کے نزدیک گالی موجب کفر نہیں ہوتی، دلیل میں مولانا الاعظمیٰ نے حافظ ابن حجر کے حوالہ سے اس حدیث کی مراد بیان کی، حافظ ابن حجر کے مطابق اس حدیث میں بغض سے مراد خاص نوعیت کا بغض ہے۔ مولانا اعظمیٰ نے ابن حجر کی جو تصریح نقل کی ہے، وہ ملاحظہ ہو:

”هل یكون من أبغضهم منافقاً وإن صدق وأقر فالجواب أن ظاهر اللفظ یقتضیہ لکنہ غیر مراد فیحمل علی تقييد البغض بالجهة فمن أبغضهم من جهة هذه الصفة وهي كونهم نصر وارسول الله ﷺ أثر ذلك في تصديقه فيصح أنه منافق. (فتح الباری ۱: ۴۸) خلاصہ یہ کہ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ان سے بغض رکھے منافق ہے لیکن مراد یہ نہیں ہے بلکہ خاص نوعیت

کا بغض مراد ہے۔ اور یہ کہ ان سے صرف اس وجہ سے بغض رکھے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد کی ہے پس اس خیال سے بغض رکھنا بیشک نفاق ہے۔^۱

مولانا نے مندرجہ بالا عبارت کو پیش کر کے حنفیہ کے مسلک کو واضح کیا کہ صحابیوں سے بغض رکھنا اگرچہ سخت ترین گناہ ہے لیکن کفر نہیں ہے، البتہ اگر اس بغض کی بنیاد نصرت رسول ہے تو بیشک یہ نفاق ہے۔

اس موقع پر لگے ہاتھوں مولانا اعظمی نے مولانا فیض آبادی سے بھی کچھ سوالات کر لئے کہ بخاری شریف کی حدیث ہے: ”سباب المسلم فسوق“ (مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔) اس حدیث میں گالی کو فسق کہا گیا ہے، اگر سب صحابہ کو آپ کفر سمجھتے ہیں تو حدیث صحیح کے خلاف ہے یا نہیں۔ حدیث میں ”وقتاله کفر“ ہے۔ (بخاری) یعنی قتال مسلم کو کفر کہا گیا ہے تو صحابہ میں جو قتال ہوا اس کی بابت آپ کا کیا فتویٰ ہے۔ نیز امام بخاری قتال کرنے والے مومنوں کو قرآن سے مومن ثابت کرتے ہیں اور خود ہی ”قتالہ کفر“ بھی روایت کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

مولانا اعظمی مولانا یوسف فیض آبادی سے سوال کرتے ہیں کہ جب قتال مومن بنص قرآنی (کما زعم البخاری) منافی ایمان نہیں ہے تو سب مومن کیونکر کفر ہو جائے گا؟^۲

سوال نہم: کتا امام صاحب کے نزدیک نجس العین نہیں درمختار نو لکثور صفحہ ۲۰، اس کی دلیل مطلوب ہے۔

۱۔ دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب، مشمولہ مقالات ابوالمآثر ۱: ۱۳۸

جواب: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے اس سوال پر اظہار افسوس کیا کہ سائل کو بخاری کے باب سور الکلاب و ممرھا فی المسجد سے ذہول ہو گیا۔ مولانا نے کتے کے نجس العین نہ ہونے پر جو دلیلیں پیش کیں وہ یہ ہیں:-

۱- امام بخاری کے نزدیک صرف یہی نہیں کہ کتا نجس العین نہیں، بلکہ مطلقاً نجس نہیں ہے۔ چنانچہ امام زہری کا فتویٰ نقل کیا کہ اگر کوئی دوسرا پانی موجود نہ ہو تو اسی پانی سے وضو جائز ہے جس میں کتے نے پیا ہو۔ اس مقام پر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

والظاهر من تصرف المصنف أنه يقول بطهارته (فتح الباری ۱/۱۹۱) یعنی مصنف کے تصرف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی پاکی کے قائل ہیں۔

۲- بخاری میں حدیث ہے کہ ایک شخص نے پیا سے کتے کو اپنے موزہ سے پانی پلایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کو پسند فرمایا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

استدل به المصنف على طهارة سور الكلب (فتح الباری ۱/۱۹۶) یعنی امام بخاری نے اس حدیث سے کتے کے جھوٹے کی پاکی پر استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد شکاری کتے والی حدیث ذکر کر کے اس کو بھی اس کی پاکی کی دلیل بتائی۔

۳- حدیث میں وارد ہے کہ جس برتن میں کتا پانی پی لے اس کو دھویا جائے، برتن کی پاکی کا یہی طریقہ حدیث میں مذکور ہے۔

۴- حدیث میں مذکور ہے کہ عہد نبوی میں کتے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور مسجد میں پانی بھی نہیں چھڑکا جاتا تھا۔

مولانا اعظمی ان دلیلوں کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ کتا نجس تو ہے، مگر نجس العین نہیں اس لئے کہ اگر نجس نہ ہوتا تو جس برتن میں پانی پی

لیا تھا، اس کی پاکی کی ضرورت نہ تھی اور اگر نجس العین ہوتا تو مسجد کا دھونا ضروری ہوتا۔
 مولانا نے بارہ سوالات نقل کئے۔ اور پھر ان کے نمبر وار جوابات دیئے اور
 آخر میں فریق مخالف کو یہ چیلنج دے ڈالا:

”جوابات پر غائر نظر ڈال کر کے اگر کلام کی گنجائش ہو تو کلام کیا جاوے۔“

مرتب 'مقالات ابوالمآثر' کے بیان کے مطابق مولانا حبیب الرحمن صاحب
 الاعظمیٰ کی یہ تحریر ۱۳۳۷ھ یا اس کے بعد کی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ جوابی تحریر عمدة المطالع
 برقی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اور اب یہ 'مقالات ابوالمآثر' جس کو 'الجمع العلمی' مئو
 نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا، میں شامل ہے۔ مولانا کی اس جوابی تحریر میں احناف پر
 ہونے والے بنیادی اعتراضات کا مختصراً مگر جامع رد کیا گیا ہے، اس موضوع پر مطالعہ
 کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہت کارآمد رسالہ ہے۔

مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ نے اپنے اس مضمون میں حنفیت کی
 شہرت و مقبولیت کے اسباب و عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کا یہ مضمون ان عنوانات
 پر مشتمل ہے:

(۱) امام ابو حنیفہ کی مقبولیت خداداد ہے (۲) تلامذہ امام کی تعداد (۳) وہ ممالک
 جہاں امام صاحب کا مذہب مقبول ہوا (۴) ابن خلدون کی شہادت (۵) مقبولیت
 کے اسباب۔

اس مضمون میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، لیکن اس اختصار کے باوجود

۱۔ دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب، مشمولہ مقالات ابوالمآثر ۱۳۶۱:۱-۱۳۶۲

۲۔ ایضاً ص ۱۳۵

مذہب حنفی کی مقبولیت کے سلسلہ میں کافی کچھ اہم اور بنیادی باتوں کا ذکر آ گیا ہے۔ یہ مضمون ۱۲ اشوال ۱۳۳۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ یکم مئی ۱۹۲۷ء کو ارشاد امرتسر میں شائع ہوا۔ مقالات ابوالہماثر جلد اول میں بھی شائع ہوا ہے۔

مثالب ابی حنیفہ کی تنقید

اہل حدیث اخبار محمدی دہلی کے ایڈیٹر نے 'حنفی علماء جواب دیں' کے عنوان سے یکم مئی ۱۹۲۷ء کو ایک مضمون لکھا۔ ایڈیٹر محمدی نے تاریخ خطیب کے حوالے سے امام ابوحنیفہ کی چند باتیں نقل کر کے علماء احناف سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کا جواب دیں، ورنہ وہ احناف کو لا جواب سمجھنے پر مجبور ہوگا۔

احناف کی جانب سے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے جواب کے لئے قلم اٹھایا اور 'مثالب ابی حنیفہ کی تنقید' کے نام سے ایک مضمون تحریر فرمایا۔ مولانا نے ایڈیٹر محمدی کے اعتراضات کا جواب دیا اور مستند حوالوں سے امام ابوحنیفہ سے متعلق روایات خطیب کو ناقابل اعتماد اور حقیقت سے دور قرار دیا۔

'مثالب ابی حنیفہ کی تنقید' میں مولانا نے پندرہ عنوانات قائم کئے ہیں ان

میں اہم عنوانات یہ ہیں:

- (۱) روایات خطیب کی تردید ابن حجر شافعی کے قلم سے (۲) ابن خلکان شافعی کے ہاتھوں روایات خطیب کی رسوائی اور خطیب کی اس کا ردوائی پر اظہار ناپسندیدگی
- (۳) سیوطی شافعی کی زبانی خطیب کا تعصب بے جا، اور ان کی روایات کی بے اعتباری (۴) سبط ابن الجوزی کی رائے میں خطیب سے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں
- (۵) تنقید روایات خطیب۔

احمدیوں کی ذلت و خواری پر محمدیوں کی بیقراری

علامہ سید مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے مرزائیت کی روک تھام اور تردید میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تصنیفات مرزائیوں کے خلاف بہت مشہور ہوئیں، مثلاً 'تحقیق الکفر والایمان بآیات القرآن' اور 'اشد العذاب علی مسلمۃ البشباب' وغیرہ۔ اشد العذاب میں علامہ نے احمدیوں کے عقائد کفریہ شمار کرائے ہیں۔

اخبار 'محمدی' دہلی میں یکم مارچ ۱۹۲۷ء کو ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا 'حقیقت اور مرزائیت کا بعض خصوصی عقائد میں اتحاد و اتفاق' مضمون نگار کا نام ابو محمد عبد الجبار تھا۔ مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے گنائے ہوئے احمدیوں کے عقائد کفریہ میں سے بعض کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ احناف بھی مرزائیوں کے ساتھ ان عقائد میں شریک ہیں۔

اصول فقہ میں احناف کا کیا موقف ہے، استنباط و استخراج مسائل میں ان کا کیا طریقہ کار ہے، احادیث و نصوص کے بارے میں احناف کا کیا عقیدہ ہے؟ مولانا اعظمی نے اپنے اس مضمون میں ان تمام باتوں کا تجزیہ کر کے احناف کا ایک واضح مسلک پیش کرتے ہوئے 'محمدی' کے مضمون نگار کا جواب دیا اور ان کے مضمون کو افتر پردازی اور ابلہ فریبی کا مجموعہ قرار دیا۔ مولانا کا یہ مضمون 'العدل' گوجرانوالہ میں ۲۹ اپریل اور ۷ مئی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ مجموعہ مقالات جلد اول میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔

قادیانی مرتد کی سنگساری

مولوی ثناء اللہ کی غمگساری

کابل میں نعمت اللہ خاں مرزائی کو بسبب ارتداد سنگسار کیا گیا۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مرزائی کی سنگساری شرعی نقطہ نظر سے درست تھی یا نہیں۔ مولانا ثناء اللہ ایڈیٹر 'الہمدیث' نے ۳ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو ایک مضمون لکھا، جس میں مرتد عن الاسلام سے شرعی اصطلاح کی مراد پر بحث کی۔ اپنی تحقیق کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مرزائی کی سزا سنگساری نہیں ہو سکتی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے ایڈیٹر 'الہمدیث' کا رد کیا اور فقہی مراجع کے حوالوں سے ارتداد کی شرعی اصطلاح کی تعیین فرمائی۔ انہوں نے اپنی تحقیق کی روشنی میں نعمت اللہ خاں مرزائی کی سزائے سنگساری کے سلطنت افغانستان کے فیصلہ کو حق بجانب اور شرعی نقطہ نظر سے صحیح قرار دیا۔

مولانا کے اس مضمون کا عنوان 'قادیانی مرتد کی سنگساری مولوی ثناء اللہ کی غمگساری' تھا۔ یہ مضمون ۱۰ نومبر ۱۹۲۴ء میں القاسم امرتسر میں شائع ہوا۔ یہ مضمون مجموعہ مقالات میں بھی شامل ہے۔

مضامین و مقالات (غیر مقلدیت کے رد میں)

غیر مقلدیت کے رد و ابطال میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے حنفی مسلک کی جانب سے بہت اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ آپ کے مضامین و مقالات بھی اس موضوع سے متعلق کثیر ہیں، یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ اگر بنظر ناظر دیکھا جائے تو کچھ کو چھوڑ کر مولانا کے بھی مضامین دفاعی ہیں؛ کسی نہ کسی تصنیف یا مضمون کے جواب اور رد میں لکھے گئے ہیں، جنکے تعارف اور تبصرہ کے لئے مقالہ کے محدود صفحات کافی نہیں۔ لہذا رد غیر مقلدیت یا دفاع حنفیت میں مولانا اعظمی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کی ایک اجمالی فہرست پیش کی جا رہی ہے جس کو دیکھ کر قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا نے ہر موڑ پر اس فرقہ کے لئے رکاوٹیں (Obstacles) کھڑی کیں اور احناف کے خلاف ان کی افتر پردازیوں کو واضح و آشکار کیا:-

- ۱- اخبار محمدی کے بعض مضامین پر ریویو (الفتیہ ۲۸/۱ اپریل ۱۹۲۵ء)
- ۲- امام اعظم اور خطیب بغدادی
- ۳- اہل حدیث اور اس کے ہمنواؤں کی خوش فہمی
- ۴- اہل حدیث کی چیرہ دستیایں
- ۵- ایڈیٹر اخبار 'محمدی' کا شرانگیز مشغلہ، مذہب حنفی پر ناپاک حملہ (القاسم امرتسر ۳۱ جنوری، ۲۸ فروری ۱۹۲۵ء)
- ۶- ایڈیٹر اہل حدیث کی منطق دانی
- ۷- بحث اجماع

- ۸- تاریخ اہل حدیث پر ایک نظر
- ۹- حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۱۰- تحقیق حکم الطلقات الثلاث (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۱۱- تقلید اور غیر مقلدیت، ایک اہم بحث (المآثر ج: ۶: ش: ۲: ربیع الاول تا جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ، مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۱۲- تبصرہ بر حقیقۃ الفقہ
- ۱۳- خطیب بغدادی کی شرف اصحاب الحدیث اور محمد جونا گڑھی
- ۱۴- دفاع حنفیت
- ۱۵- رسالہ اثبات تقلید
- ۱۶- عدد رکعات تراویح (القاسم ۲۵ مئی، ۱۰/ جون ۱۹۲۲ء، مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۱۷- غیر مقلدوں کے اشتہار کا جواب
- ۱۸- کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر محمدی (ارشاد ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۲ء)
- ۱۹- مسئلہ طلاق پر شبہات اور ان کا ازالہ (القاسم ۲۵ اپریل ۱۹۲۳ء)
- ۲۰- واقعہ قفال کی تردید (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۲۱- کشف المعصلمات (الفقیہ ۲۰ فروری، ۵ مارچ، ۱۵ اپریل اور ۲۰ اپریل ۱۹۲۳ء)
- ۲۲- مسئلہ تقلید
- ۲۳- مولوی ثناء اللہ صاحب اور بحث تقلید (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۲۴- حیلہ (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
- ۲۵- نکاح محمدی پر ایک نظر (مقالات ابوالمآثر جلد اول)

رِوِیوِ بریلویت

بریلوی فرقہ کے علماء سے بھی مولانا اعظمی کا تقریری مناظرہ ہوا۔ اس سلسلہ میں ادوی کے مناظرہ نے کافی شہرت حاصل کی۔ یہ مناظرہ ۱۵/۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں موضع ادوی ضلع اعظم گڑھ میں منعقد ہوا۔ بریلوی فرقہ کی جانب سے مولانا نعیم الدین اور مولانا حشمت علی جیسے مناظر نے اس جلسہ میں شرکت کی۔ دیوبندی علماء میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا منظور نعمانی کی رفاقت میں شریک ہوئے۔

ادوی کے مناظرہ میں اسیر ادوی کے بقول:

”مولانا اعظمی بحیثیت سرپرست ہر نشست میں اسٹیج پر بروقت رہنمائی کے لئے موجود رہتے اور جوابات کی نشاندہی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔“

نتیجہ میں بریلوی مناظرین شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غائب ہو گئے۔^۱

بدعت نواز مصنفین کے مولانا اعظمی نے تحریری جواب بھی دیئے، بریلویت کے رد میں مولانا کی تصنیف ’شارع حقیقی‘ کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ بریلویت کے ابطال میں مولانا کے کئی مضامین بھی ہیں۔ ہم یہاں صرف ’شارع حقیقی‘ کا تعارف پیش کرنے پر اکتفاء کریں گے۔

۱۔ ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۳۱

۲۔ دارالعلوم اپریل، مئی ۱۹۹۲ء ص ۱۶

شارع حقیقی

بریلوی فرقہ کے عالم مولانا سید محمد کچھوچھوی نے ایک رسالہ تصنیف کیا، اس رسالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی بھی چیز کی تحلیل و تحریم کا اختیار ہے۔ مولانا کچھوچھوی کے رسالہ کا نام 'التحقیق البارع فی حقوق الشارع' ہے۔ انہوں نے اس رسالہ میں حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کو اس حد تک بلند کیا کہ الوہیت اور رسالت کا امتیاز ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے استاذ محترم مولانا حبیب الرحمن الاعظمی سے اس کتاب کا رد لکھنے کی فرمائش کی، تاکہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں نظام دنیا کے چلانے والے شارع حقیقی اور اس کے رسول کے درمیان فرق کو واضح کیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے شاگرد کی اس نیک خواہش و فرمائش کو 'شارع حقیقی' کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر پورا کیا۔

اس کتاب کے اہم مباحث مسلک حق کی توضیح، مسلک حق کے دلائل، مخالفین کے دلائل وغیرہ ہیں۔ مولانا نے سب سے پہلے تحلیل و تحریم کے سلسلہ میں تحقیقی مسلک بیان فرمایا۔ بریلوی عالم سید محمد کچھوچھوی کے موقف کا رد کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ شارع حقیقی صرف اور صرف باری تعالیٰ کی ذات ہے، تحلیل و تحریم کا مالک وہی ہے، کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں۔

مولانا اعظمی نے اس مسلک کی توضیح شیخ کمال الدین ابن الہمام حنفی، علامہ ابو جعفر نجاشی، علامہ اسنوی شافعی، حافظ بدر عینی، علامہ محبت اللہ بہاری، نیز شرح لابن امیر الحاج، حجۃ اللہ البالغہ، تحفۃ الثنا عشریہ کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ اس کے بعد مولانا قرآن و حدیث سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ پھر کچھوچھوی صاحب کے دلائل کا تجزیہ

کرتے ہیں اور پیش کی گئی آیات و احادیث کے مفہوم و معنی کی تعین فرماتے ہیں۔
 مثال کے طور پر مولانا سید محمد صاحب نے اپنے موقف یعنی آنحضرت ﷺ کی تحلیل و تحریم
 کے مجاز ہیں، کے سلسلہ میں پہلی دلیل ایک حدیث سے پیش کی، وہ حدیث یہ ہے:
 ایک شخص نبی ﷺ کے پاس حاضر ہو کر اس شرط پر ایمان لایا کہ میں صرف
 دو نمازیں پڑھا کروں گا۔ حضور ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا۔ اس حدیث سے مولانا
 کچھوچھوی نے یہ ثابت کیا کہ نبی کو اختیار تھا کہ جس کو چاہیں اور جس حکم سے چاہیں
 مستثنیٰ فرمادیں۔

مولانا الاعظمیٰ کو اس دلیل پر کلام ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اولاً تو حدیث میں
 اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابی کو مستثنیٰ فرمادیا، ممکن ہے
 کہ آپ نے دو نمازوں کو بایں خیال قبول فرمالیا ہو کہ اسلام لانے کے بعد اس کی
 برکت سے یہ خود بخود پنج وقتہ پڑھنے لگیں گے: اس لئے اس سے پہلے ہی اس کے
 اقرار کی ضرورت نہیں سمجھی، ثانیاً آپ نے اس لئے قبول کر لیا ہو کہ کافر رہنے سے تو
 بہر حال یہ اچھا ہی ہے کہ آدمی مسلمان ہو جائے۔

مولانا الاعظمیٰ نے ہاتھ کے ہاتھ مولانا کچھوچھوی سے ایک سوال بھی کر لیا کہ
 اگر جناب کے پاس کوئی غیر مسلم حاضر ہو کر کہے کہ مجھے مسلمان کر لیجئے، مگر میں دو ہی
 وقت کی نماز پڑھوں گا اور فرض کیجئے کہ آپ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے مگر وہ نہیں سمجھا
 بتائیے کیا کریں گے؟ مسلمان کریں گے یا پنج وقتہ کے اقرار کی شرط لگائیں گے۔
 مولانا کچھوچھوی نے اپنے موقف کی تائید میں کچھ اقوال علماء بھی نقل کئے
 ہیں۔ انہوں نے ”التحقیق البارع“ میں ایک جگہ لکھا:

”مولوی اشرف علی کو بھی اپنے ترجمہ قرآن میں تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس

آیت سے احکام شریعت میں بھی اختیار نبوی ثابت ہوتا ہے۔^۱
 مولانا اعظمی نے اس کو مولانا کچھوچھوی کی افترا پر دازی قرار دیا۔ تفسیر بیان القرآن اور مولانا تھانوی کے ترجمہ میں کہیں بھی اس طرح کی عبارت کے ہونے سے مولانا نے انکار کیا۔ اسی طرح مولانا تھانوی کے علاوہ جن اکابر علماء کے اقوال و فرمودات مولانا سید محمد کچھوچھوی نے پیش کئے ہیں، ان تمام پر مولانا اعظمی نے بحث و جرح کی اور ان کے معانی و مغایہیم کی تعیین کر کے ثابت کیا کہ یہ اقوال بریلوی مسلک کی تائید میں قطعاً نہیں ہو سکتے۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے اپنے موقف یا مسلک یعنی حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ شارع حقیقی نہیں ہے بلکہ شارع حقیقی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، کے سلسلہ میں پچیس دلیلیں پیش کی ہیں۔ مولانا نے آخر میں تحقیق بارع کی تقریظ کے کچھ حصہ کو نقل کر کے اس پر بھی نقد و تبصرہ کیا اور اسی پر اپنی بات ختم کی۔
 رد بریلویت میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی دو کتابیں 'شارع حقیقی' اور 'احکام النذر لا ولیاء اللہ' ہیں۔ مؤخر الذکر کا تعارف ہم نے فقہ کے ذیل میں پیش کیا ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ مولانا کے کچھ مضامین بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو بریلویت یا رضا خانیت کے رد میں ہیں۔

شارع حقیقی پہلی مرتبہ الفرقان بریلی میں ۱۳۵۵ھ میں قسط وار شائع ہوئی۔ اس کا کتابی ایڈیشن بھی مکتبہ الفرقان سے شائع ہوا۔ اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۲ھ میں ۲۰۰۱ء میں مجمع علمی مؤن نے شائع کیا ہے۔

تاریخ و تذکرہ

تاریخ صرف کچھ افراد اور ان سے متعلق کچھ واقعات کا ہی نام نہیں ہے، اور نہ ہی یہ بادشاہوں یا حکمرانوں کے انتظام حکومت تک ہی محدود ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ میں عصریت کا دل دھڑکتا ہے، اور اسی لئے علماء و فلسفیوں نے ہر علم ہر فن ہر شے سے متعلق ایک مرتب واقعاتی سلسلہ کو تاریخ کا نام دیا ہے؛ اسی لئے تفسیر و حدیث کی تاریخ بھی ہوگی، فقہ کی بھی تاریخ ہوگی، اور حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ بھی ہوگی۔

کوئی بھی عالم تاریخ سے صرف نظر نہیں کر سکتا، اس کے احاطہ علم میں تاریخ ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب یہ تاریخ کسی مخصوص نظریہ سے متعلق افراد کے تذکرے کی بھی ہو سکتی ہے، حجاج کے تذکرہ کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے، اور اس تاریخ میں کتابوں کے انتساب کی تحقیق بھی ہو سکتی ہے۔ تذکرہ کو تاریخ سے کسی لمحہ بھی الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے، اس کا اپنا مستقل وجود ہوتا ہے، لیکن اس کی پوری ثمارت کے سنگ و خشت تاریخ سے ہی مستعار ہوتے ہیں۔

چنانچہ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے یہاں بھی تاریخ و تذکرہ کے بہت اہم اور معتبر گوشے ملتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت انہیں گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اہل دل کی دل آویز باتیں

دوران مطالعہ مولانا الاعظمی کی نظروں سے بہت سے واقعات، اقوال، زریں اور حکمت و دانائی کی باتیں گزریں، جن واقعات سے مولانا متاثر ہوئے یا جن سبق آموز یا دل آویز باتوں نے ان کے قلب پر اپنے نقوش چھوڑے، مولانا نے ان کا انتخاب کر کے قارئین کے سامنے ایک مختصر مگر مفید مجموعہ پیش کیا۔

یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے، اس رسالہ میں مولانا نے ۷۹ عنوانات قائم کر کے مختصر واقعات، بزرگان دین کے فرمودات اور اہل دل کی دل آویز باتیں جمع کی ہیں۔ اس کتاب کے چھوٹے چھوٹے واقعات و ملفوظات کے مطالعہ سے تصوف اور راہ سلوک کے بعض اہم نکتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس رسالہ کی استناد اور اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسکے واقعات وغیرہ مستند مراجع سے لئے گئے ہیں۔ جیسے اخبار الاخبار، فوائد الفوائد اور تذکرۃ الاولیاء وغیرہ۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے اس رسالہ کو اہل دل کی دل آویز باتیں کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۶۰ھ میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ دوسرا مجمع العلمی، منو سے ۱۳۷۰ء میں طبع ہو کر شائع ہوا۔ مختلف رسالوں میں اس پر تبصرے بھی لکھے گئے، لیکن یہاں صرف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا تبصرہ پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

”رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم و عمل کے لئے

نافع فرمائے و سیفعل انشاء اللہ تعالیٰ طالب علموں اور مبتدیان

طریق کے لئے بہت مفید ہے۔“

اعیان الحجاج

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر ایک ایسا فریضہ عائد کیا، جس کے طفیل میں اس نے ان پر دین و دنیا کے تمام فوائد کھول دیئے، علم و تحقیق، تہذیب و تمدن اور ثقافت کی ترقی اور انکا فروغ اسکے مضمرات میں سے ہیں۔ اس مشہور فریضہ کا نام 'حج' ہے۔ حج ہمیشہ سے اجتماعی منافع کا واسطہ اور وسیلہ رہا ہے۔ اسی فریضہ کے واسطے سے کتنے عالم ربانی، زاہد و مرتاض اور علم و تحقیق کے دیئے روشن کرنے والے وجود میں آئے۔

حج کے مسائل سے متعلق کتابیں لکھی گئیں اور خوب لکھی گئیں۔ لیکن اردو زبان میں ایک ایسے تذکرہ کی ضرورت اب بھی تھی جو حجاج سے متعلق ہو، جس میں حجاج کرام کی سفری مشقتوں، استفادہ و افادہ علمی اور حج کے دوران پیش آنے والے واقعات و حادثات کا تذکرہ ہو؛ تاکہ ناظرین یا قارئین کے دلوں میں ان واقعات کو پڑھ کر حبّ اللہ حج کرنے کا شوق و ولولہ پیدا ہو۔

مولانا الاعظمیٰ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا، جس میں اسلامی تاریخ کے اعیان و اکابر کے واقعات حج کا ذکر ہو۔ 'البلاغ' میں 'طبقات الحجاج' کے عنوان سے قاضی اطہر مبارکپوری کے ایک سلسلہ مضامین کو دیکھ کر مولانا کا یہ داعیہ مزید مضبوط ہو گیا اور پوری قوت سے اس ارادہ نے عملی شکل اختیار کر لی۔

چنانچہ انہوں نے حضرات انبیاء، صحابہ، خلفاء، شاہان اسلام، اکابر امت اور بزرگان دین کے حج کے سبق آموز واقعات و حالات قلم بند کرنے شروع کئے۔ تا آنکہ ۵۶۶ اعیان حجاج کے واقعات حج جمع کر ڈالے، اور ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو گئی۔ مولانا نے اس کتاب کا نام 'اعیان الحجاج' رکھا۔

یہ کتاب تذکرہ کیا، معلومات کا خزانہ ہے، اس کتاب کی ہر سطر سے معلومات میں ایک نیا اضافہ ہوتا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اعظمی نے کہیں بھی موضوع سے ہٹ کر خارجی بات نہیں چھیڑی ہے۔

تذکرہ کا یہ سلسلہ سیدنا محمد ﷺ سے شروع ہو کر حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت یونس، حضرت الیاس، حضرت خضر علیہم السلام سے ہوتے ہوئے 'طغائے خاتون' متوفی ۷۴۹ھ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ۷۴۹ھ تک کے ہی حجاج کا تذکرہ اس کتاب میں ہے، بلکہ ۱۳۲۶ھ تک کی منتخب اور عالمگیر شخصیات کا تذکرہ اعیان الحجاج میں کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک ترتیب پلٹ جانے کی بات ہے تو مولانا نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ صدیوں کی ترتیب کسی وجہ سے قائم نہیں رہ سکی ہے۔

اس کتاب میں تحقیقی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے؛ جیسے وادی روحاء کی تحقیق، ہرشی کی تحقیق، حضرت خضر نبی تھے یا ولی؟ حضرت خضر کی حیات کی بحث وغیرہ۔ حجاج کرام نے اس پاک سرزمین میں جن اساتذہ سے استفادہ کیا، جو کتابیں تصنیف کیں، یا جن کتابوں کی تصنیف کا ان بلند پایہ حجاج نے ارادہ کیا، ان کا بھی اجمالاً تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ جیسے امام بخاری نے اپنی کتاب 'التاریخ' روضہ نبوی کے پاس چاندنی راتوں میں تصنیف کی، اسی طرح سے صحیح بخاری کی تصنیف اور اسکے ابواب کی ترتیب کا آغاز بھی انہوں نے مسجد حرام سے کیا تھا، اسکے مسودہ کو روضہ اقدس اور ممبر شریف کے درمیان صاف کیا تھا وغیرہ۔

کسی شخصیت کے تذکرہ میں اگر اس کا کوئی خاص کارنامہ ہے تو مولانا اس

کی بھی نشاندہی کرتے چلے گئے ہیں، جیسے زبیدہ کے واقعہ حج کے ذیل میں 'نہر زبیدہ' کا بھی ذکر کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ زبیدہ نے دو نہریں کھدوائی تھیں، ایک نہر طائف کی سرزمین سے شروع ہو کر مکہ میں ختم ہوتی تھی، دوسری نہر وادی نعمان سے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ ہوتے ہوئے بیر زبیدہ پر آ کر ختم ہوتی ہے، جہاں سے مکہ بہت تھوڑے فاصلہ پر رہ جاتا تھا۔ زبیدہ نے سترہ لاکھ دینار کے صرفہ سے یہ نہر تعمیر کرائی تھی۔ ۱۲۹۵ھ میں ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ و کوشش سے اس کی اصلاح و مرمت کے لئے ایک کمیٹی بنی تھی جس کے ایک رکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی تھے۔

'طغائے خاتون' کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ وہ الملک الناصر کی حرم تھی، ۷۷۲ھ میں جب اسکے بطن سے ناصر کا لڑکا آنوک پیدا ہوا تو ناصر کو بے انتہا مسرت ہوئی، اسی موقع پر طغائے خاتون نے شاہ سے حج کی اجازت طلب کی، شاہ نے اجازت دیدی اور اس ساز و سامان سے روانہ کیا کہ مدتوں اسکا چرچا رہا، مکہ میں گیہوں کی آمد پر جو کسٹم لگتا تھا شاہ نے اسی خاتون کے کہنے سے اسکو موقوف کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ کسی بادشاہ کی حرم یا ملکہ نے اس شان کا حج نہیں کیا، نہ کسی نے اتنا خرچ کیا جو اس نے اپنے حج میں خرچ کیا۔ اس نے ایک ہزار لونڈیوں کو آزاد کیا تھا۔

آخر میں مولانا الاعظمیٰ نے 'خاتمہ مشتمل بر چند فوائد' عنوان کے تحت دو صفحے

۱۔ اعیان الحجاج ۱: ۲۲۷-۲۲۸

جب بات نہر زبیدہ کی آہی گئی ہے تو اس کے سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بے محل نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا خود نوشت سوانح 'ہماری آزادی' میں لکھتے ہیں کہ: "میرے والد نے اس نہر کی مرمت کرائی، انہوں نے ہندوستان بھر، شام اور ترکی میں بیس لاکھ کانڈ جمع کیا۔" (ہماری آزادی ص ۱۰) مولانا آزاد کی یہ بات محتاج ثبوت ہے، ماہر القادری کی تحقیق کے مطابق "مولانا ابوالکلام آزاد کے والد اس کمیٹی کے رکن بھی نہیں تھے۔" (یاد رفتگاں ص ۳۳۷)

۲۔ اعیان الحجاج ۲: ۳۰۷

میں مزید مفید معلومات درج کی ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح کے تذکرے یا واقعات وہی شخص قلم بند کر سکتا ہے جو تاریخ یا تاریخ کے موڑ پر پیش آنے والے واقعات و حادثات سے بخوبی واقف ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا اعظمی نے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے جو عام طور پر اردو کی کتابوں میں پڑھنے کو نہیں ملتے ہیں، جو چھوٹے تو ضرور ہیں مگر بڑے اہم ہیں۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا الاعظمی کی تاریخ و سیر پر مضبوط گرفت تھی۔ حج کے ساتھ تاریخ و سیر کے امتزاج نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

مولانا نے ۱۲ صفحے میں اس کتاب پر مقدمہ بھی تحریر فرمایا، حج کے فوائد و منافع، علم کی ترقی و اشاعت میں حج کا کیا رول رہا ہے، حج کے موسم میں کتابوں کی تصنیف، تسوید اور تمیض وغیرہ تمام چیزوں کا مولانا نے اجمالاً جائزہ لیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اعیان الحجاج کا تعارف اور پیش لفظ تحریر فرمایا، علامہ ندوی لکھتے ہیں:

”شکر و مسرت کا مقام ہے کہ فاضل گرامی محدث جلیل مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اس سلسلہ کو شروع کیا اور ایک نہایت مفید اور وسیع کتاب تیار فرمادی۔“

مولانا عبداللہ زمزمیؒ کی اس کتاب کی تعریف و توصیف ایک مکتوب میں اس طرح فرماتے ہیں:

”یا صاحب الفضیلة قال فی کشف الظنون عن کتاب

الفوائد لابن رجب: إنها من عجائب الدهر، وإن کتابکم

أیضاً من عجائب الدهر فی بابہ و اسلوبہ و محتویاتہ،

وابتداءؤکم فیہ بأشرف المخلوقات جعلہ من أعجب
العجائب الہاماً من اللہ سبحانہ و تعالیٰ۔“ ا۔

(ابن رجب کی کتاب القوائد کے بارے میں کشف الظنون میں ہے کہ
وہ عجائبات زمانہ میں سے ہے، اسی طرح آپ کی کتاب بھی موضوع،
اسلوب، اور مضامین کے اعتبار سے عجائبات زمانہ میں سے ہے اشرف
المخلوقات ﷺ کے ذکر سے الہاماً اس کی ابتداء نے اس کتاب کو عجائبات
میں سے بھی ایک انجوبہ بنا دیا ہے۔)

ابتداءً اس تذکرہ کی چند قسطیں ’البلاغ‘، ’بہمی‘ اور کچھ ’الصدیق‘ ملتان میں
شائع ہوئیں۔ بعد میں ’اعیان الحجاج‘ کے نام سے یہ کتاب دو جلدوں میں شائع
ہوئی۔ جلد اول پہلی دفعہ ۱۹۵۸ء میں مکتبہ اعظمی منو سے شائع ہوئی، اور دوسری جلد
۱۹۷۱ء میں مکتبہ اعظمی سے ہی شائع ہوئی۔ اب یہ کتاب پاکستان سے بھی شائع
ہو گئی ہے۔ پاکستانی ایڈیشن میں دونوں جلدیں یکجا کر دی گئی ہیں۔

دست کار اہل شرف

جس طرح تاریخ شاہان اولو العزم کی مہم آزمائیوں کا نام نہیں، اسی طرح
تاریخ نویسی بھی کسی عہد کے صرف اہم ترین واقعات کی جمع و تدوین کا نام نہیں۔ کسی
عہد میں پیش آنے والے معمولی سے معمولی واقعات بھی تاریخ میں نقطہ انقلاب کی
حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے تاریخ کی ترتیب عمل میں
آئی، تاکہ زمانہ کے ہر نشیب و فراز پر روشنی پڑ سکے؛ یہی سبب ہے کہ قوس قزح کی طرح
تاریخ کے بھی مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔

اسلام نے ایک بنیادی اصول یہ طے کر دیا تھا کہ: ”ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“ لیکن اس اہم نکتہ کے بعد بھی مسلمانوں میں قبائلی یا پیشہ ورانہ یا نسلی امتیازات باقی رہے۔ ہندوستان کے مخصوص معاشرتی و معاشی پس منظر میں مختلف طبقات نے جنم لیا اور انکے اپنے تعصبات رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان بنیادوں پر طبقاتی و پیشہ ورانہ امتیازات کو سبب ترجیح و فضیلت بنایا۔

ظاہر ہے کہ جب کچھ کو ترجیح دی جائے گی تو جو باقی ماندہ ہوں گے وہ سب سمجھے جائیں گے۔ اس مخصوص تناظر میں ہندوستان کے پیشہ ورانہ نظام میں برطانوی سامراج اور بہت سے دوسرے سیاسی و سماجی عوامل نے ایک خط فاصل کھینچ دیا۔ چنانچہ جاگیردار اشرافیہ نے دستکاروں یا معمولی پیشہ اپنانے والوں کو سبک سمجھنے کا رویہ اختیار کیا۔ اس کا فطری رد عمل بھی ہونا چاہئے تھا، جو ہوا۔ اس رد عمل کا ہم اپنے معاشرہ میں آسانی سے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کو تاریخ و سیر اور تذکرہ نویسی سے خاص شغف تھا، انکے اس ذوق کو حدیث کی تحقیق نے اور نکھار دیا تھا؛ کیونکہ راویان حدیث کے حالات کی چھان بین، قدیم زمانہ کے معاشرہ سے پوری طرح واقفیت و باخبری، اور اس دور کے اعیان و اکابر کے حالات کا علم، یہ تمام چیزیں ایک محدث کے لئے تحقیقی وسائل ہیں۔ اسی لئے تاریخ و تذکرہ کی ترتیب میں بھی مولانا کے حدیث کے تحقیقی رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

وقت یا زمان اور اس میں بدلتے ہوئے واقعات و حالات کے پیش نظر مولانا اعظمی نے اردو زبان میں ایک تذکرہ مرتب کیا۔ اس تذکرہ میں انہوں نے مسلمانوں کے درمیان نسلی بنیاد پر تفاضل اور برتری کی دیوار کو منہدم کر کے اسلامی اخوت کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ مولانا کی اس تصنیف کا

سبب خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:-

”آج مسلمان..... عہدوں کے حصول اور ملازمتوں کو سرمایہ عزت و افتخار اور ہاتھ سے کام کرنے کو معیوب اور پست کام سمجھنے لگے ہیں، اس کا ایک طرف یہ نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے کہ بے شمار اشخاص بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ دینی یا دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہیں یا ان کے پاس پیسے ہیں وہ دست کاروں کو ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں..... انہیں باتوں کے پیش نظر برسوں سے یہ خیال ہو رہا تھا کہ محترف اعیان و اکابر اسلام کا ایک جامع تذکرہ قلمبند کیا جائے، جس میں ایک ایک پیشہ کو لے کر اس کے اختیار کرنے والے نامور حضرات کا حال لکھا جائے۔“

چنانچہ مولانا نے ”پارچہ بانی“ کے پیشہ کو ذریعہ معاش بنانے والے اکابر اسلام یا اس کو اگر وسیلہ معاش نہ بھی بنایا ہو تو بھی کسی نہ کسی شکل میں اپنانے والی اہم شخصیات کا تذکرہ مرتب فرمایا۔ مولانا اعظمی نے پیشہ وارانہ بنیادوں پر بنکروں کی اہمیت، ایک صحت مند سماج اور مذہبی معاشرہ میں ان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس تذکرہ کو مرتب کیا ہے۔

اس سلسلہ کی صرف ایک ہی کڑی یعنی پارچہ بانی کا ہی تذکرہ مرتب ہو سکا، غالباً دوسرے تحقیقی امور اور علمی کاموں نے اس جانب متوجہ ہونے کی اجازت نہ دی۔ اور صنعت و حرفت کے اکابر اسلام وار باب فضل و کمال سے واقفیت کا یہ سلسلہ پارچہ بانی پر ہی موقوف ہو کر رہ گیا۔ اس صنعت کے اعیان کا تذکرہ مرتب کرنے میں ممکن ہے کہ ایک ترجیحی پہلو یہ رہا ہو کہ مولانا اعظمی کا بھی اسی صنعت (پارچہ بانی) سے

تعلق تھا۔ مولانا کی اس کتاب کا نام ”دستکار اہل شرف۔ تذکرہ نسا جین“ ہے۔
اس کتاب کا آغاز انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہوتا ہے، انبیاء میں بھی
حضرت آدم سے۔ حضرت آدم کے تذکرہ میں ”البدایہ والنہایہ“ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

”وکان اول کسوتھما من شعر الضان جزاء وغزلاہ ففسح

لہ آدم جبۃ ولحواء درعاً وخماراً۔“

(آدم و حوا کا پہلا لباس بھیڑ کے بالوں کا تھا، دونوں نے بال کاٹے اور

اسکو کاٹا پھر آدم نے اپنے لئے ایک جبہ کا اور حواء کے لئے ایک درع اور

ایک خمار کا کپڑا بنا۔)

انبیاء کے ذکر کے بعد ان صحابہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے کپڑے بنے،
اسی طرح سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور عہد بعہد حروف تہجی کے اعتبار سے اہم
شخصیات کا ذکر آتا جاتا ہے۔ بعض جگہ ترتیب میں چوک بھی ہو گئی ہے جس کی نشاندہی
مولانا نے خود بھی فرمائی۔ تذکرہ کا یہ سلسلہ عائشہ باعونیہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں
کبیر داس کا بھی تذکرہ ہے۔ آخر میں ایک صفحہ میں تنبیہات و توضیحات اور ایک صفحہ
میں تتمہ ہے۔

موضوع سے مناسبت کی وجہ سے مولانا اعظمی کے ایک مختصر مگر مفید رسالہ کو
بھی کتاب کے آخر میں ملحق کیا گیا ہے۔ اس ضمیمہ کا نام ”دنیا میں پارچہ بانی کے مرکز“
ہے۔ مولانا نے اس کتابچہ میں دنیا کے ان شہروں، علاقوں یا مقامات کا تذکرہ کیا ہے،
جنہوں نے پارچہ بانی کے لحاظ سے ناموری حاصل کی۔

”دنیا میں پارچہ بانی کے مرکز“ میں مدینہ منورہ، یمن، عراق، میسوپوٹامیا،
بخارا، بلاد مغرب، ایشیائے کوچک، ترکی، قسطنطنیہ، البانیہ، چین، ترکستان، تبت، شام،

مصر اور ہندوستان وغیرہ کا ذکر ہے، جہاں پارچہ بانی ہوا کرتی تھی یا ہوتی ہے۔
 اس رسالہ میں تقریباً دنیا کے مشہور پارچہ بانی کے مراکز کا ذکر آگیا ہے۔
 مولانا اعظمی نے سب سے آخر میں ہندوستان کا ذکر کیا۔ ہندوستان نے کپڑے بننے
 میں اس قدر ناموری حاصل کی تھی کہ بقول پروفیسر الیاس برنی کے کہ اٹھارہویں
 صدی کے نصف تک پارچہ بانی کا کاروبار ہندوستان بھر میں اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ
 زراعت کی مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا، انگریزوں نے سب سے پہلے ہندوستان
 کی اسی صنعت پر وار کیا اور اسے تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

”دست کار اہل شرف۔ تذکرہ نساجین“ ایک بہت دلچسپ اور معلومات
 افزا (Informative) کتاب ہے، بلکہ اسے گنجینہ معلومات کہا جائے تو شاید
 مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ کتاب تاریخی اور جغرافیائی حالات سے مولانا اعظمی کی واقفیت کی
 آئینہ دار ہے۔ اس کی جمع و ترتیب میں عربی لٹریچر سے خاص طور سے مدد لی گئی ہے،
 جس سے عربی ادب پر مولانا کی کتنی مضبوط گرفت ہے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔
 اس میں فارسی اشعار بھی ہیں۔ عربی و فارسی اشعار، اکابر کے اقوال و فرمودات،
 سفرنامے، اور مستند مراجع کے حوالوں نے اس کتاب کی زینت، افادیت اور استناد
 میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

”دست کار اہل شرف۔ تذکرہ نساجین“ کا پہلا ایڈیشن ۱۴۰۶ھ ۱۹۸۵ء
 میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۴۲۲ھ ۲۰۰۱ء میں المجمع العلمیٰ منو سے شائع ہوا۔

مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟

مبارق الازہار مشارق الانوار کی شرح ہے، استنبول سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ یہ شرح بہت مقبول ہوئی۔ مبارق الازہار کی نسبت قاضی سید نور الدین صاحب نے معارف جولائی ۱۹۵۹ء میں اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب استاذ شعبہ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے معارف اکتوبر ۱۹۵۰ء میں یہ تحقیق پیش کی کہ یہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے، جو احمد آباد کے باشندہ تھے۔ ان کے والد کا نام عبد الملک بنبانی تھا، اور انکی وفات ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ یعنی فاضل مقالہ نگاروں کے مطابق 'مبارق الازہار' کے مصنف عبد اللطیف بن عبد الملک بنبانی احمد آبادی تھے۔

مولانا اعظمی نے اس تحقیق پر ایک تنقید لکھی جو 'مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟' کے عنوان سے معارف ش: ۱ ج: ۳۷ (جنوری ۱۹۵۴ء) میں شائع ہوئی۔ انہوں نے فاضل مضمون نگاروں کی اس تحقیق و انکشاف کو تاریخی اعتبار سے ناقابل قبول بتایا، اور اسے ایک ایسا دعویٰ قرار دیا جس کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی تحقیق یہ ہے کہ مبارق الازہار شرح مشارق الانوار کے مصنف عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک ہیں، جو نہ بنبانی ہیں، نہ احمد آبادی، اور نہ ان کی وفات ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔

مولانا نے اپنے موقف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل شواہد پیش کئے:

۱۔ جن مصنفین نے بھی ابن فرشتہ یا مبارق الازہار کا ذکر کیا ہے سبھی نے اس کو عبد اللطیف بن الملک کی تصنیف بتلایا ہے۔ مولانا نے الضوء المانع، الشقائق النعمانیۃ، اعلام الاخیار، شذرات وغیرہ کا حوالہ دیا۔

۲۔ مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح کی ہے: "وبعد فيقول العبد

الضعیف العزیز عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک“
(مبارق ج: ۱ ص ۲)

۳۔ الضوء الملاح، الشقائق النعمانیۃ، اعلام الاخیار، شذرات وغیرہ سبھی کتابوں میں مصنف کے والد کا نام عبد العزیز ہے، یا صرف عبد اللطیف ابن الملک لکھا ہوا ہے، ان میں سے کسی میں مصنف کے والد کا نام عبد الملک نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے دادا کا نام کسی نے محمود بھی نہیں بتلایا ہے جیسا کہ مقالہ نگار سید باقر علی صاحب نے لکھا ہے۔

۴۔ کسی مصنف نے ان کو ہندی یا بھانی نہیں لکھا ہے، بلکہ طاش کبریٰ زادہ نے ان کو ترکی کا باشندہ قرار دیا ہے۔ (الشقائق النعمانیۃ ص ۲۳)

ان دلائل کی روشنی میں مولانا اعظمی اس نتیجہ پر پہنچے کہ مقالہ نگاروں کو اشتباہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے جن عبد اللطیف کا ذکر کیا ہے وہ ابن فرشتہ اور شارح مشارق کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہیں جن کے والد کا نام عبد الملک بھانی تھا، وہ نسباً عباسی اور احمد آباد کے باشندہ تھے، مگر غلط فہمی سے ان کو شارح مشارق تصور کر لیا گیا۔

مولانا اعظمی نے سنہ وفات سے بھی بحث کی۔ مقالہ نگار حضرات نے جن عبد اللطیف کا ذکر کیا ہے، ان کا سنہ وفات ۹۱۵ھ لکھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دسویں صدی کے عالم ہیں حالانکہ وہ نویں صدی کے علماء میں ہیں، دلیل میں مولانا نے سخاوی کی الضوء الملاح میں ان کا تذکرہ کئے جانے کو کافی سمجھا اور پھر سخاوی کے انداز تحریر کے ذریعہ بتایا کہ ان کی وفات نویں صدی میں ہو چکی تھی، اور طاش کبریٰ زادہ نے ان کو سلطان بایزید یلدرم کے عہد حکومت کے علماء میں بتایا ہے، اور سلطان بایزید یلدرم کا عہد حکومت ۸۰۵ھ سے ۸۰۵ھ تک ہے۔

سید نور الدین حسین صاحب اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب نے عبد اللطیف احمد آبادی کا جو سنہ وفات ذکر کیا ہے، مولانا اعظمی نے اس کو بھی غلط ٹھہرایا اور دلیل سے

اپنے دعوے کو ثابت کیا۔ تاریخ وفات پر کلام کرتے ہوئے مولانا نے سنہ کی غلطی کی بنیاد یہ بتائی کہ قاضی سید نور الدین حسین نے مبارق الازہار کا مصنف ملک عبداللطیف داور الملک کو سمجھا، اور ان کا سال وفات ۹۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے عبداللطیف ابن عبدالملک جبانی کو مبارق کا مصنف تصور کر کے یہ تخیل قائم کر لیا کہ یہ عبداللطیف وہی ملک عبداللطیف داور الملک ہیں؛ لہذا انہوں نے ان کا سنہ وفات بھی ۹۱۵ھ لکھ دیا حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں، یہ دونوں دو عبداللطیف ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ عبداللطیف بن ملک تیسرے بزرگ ہیں جن کی نسبت شوکانی نے لکھا ہے:

”وله تصانیف منها شرح المشارق، وکان من علماء الروم

الموجودین فی ایام السلطان مراد۔“

(ان کی متعدد تصنیفات ہیں، ان میں سے ایک شرح مشارق ہے، اور وہ

ایک رومی عالم تھے، سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے۔)

(الہدیر الطالع ج ۱: ۳، ۴ بحوالہ معارف: ج ۱: ۷۳)

الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟

کتاب الذخائر والتحف مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی، اس پر معارف (اپریل و مئی ۱۹۶۰ء) میں مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے قلم سے تبصرہ بھی شائع ہوا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کتاب کے مصنف کی نسبت مقدمہ میں لکھا کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، البتہ کتاب کی اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم کی تصنیف ہے۔

معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں قاضی اطہر مبارکپوری نے ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی کہ القاضی الرشید بن الزبیر کا تفصیلی ذکر تاریخ ابن خلکان میں ہے، اور وہ پانچویں صدی نہیں بلکہ چھٹی صدی کے عالم ہیں۔ قاضی صاحب انہیں کو ”الذخائر والتحف“ کا مصنف مانتے ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب اُن القاضی الرشید کی نہیں ہے جن کا تذکرہ ابن خلکان میں ہے؛ اس لئے کہ یہ چھٹی صدی کے عالم ہیں، اور کتاب کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مصنف پانچویں صدی میں تھا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے معارف نمبر ۲ جلد ۸ (فروری ۱۹۶۱ء) میں اس مسئلہ پر ”الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟“ کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مولانا نے ڈاکٹر حمید اللہ اور قاضی اطہر مبارکپوری کے موقف اور دلائل کا محاکمہ و تجزیہ کیا اور اپنی ایک فیصلہ کن رائے پیش کی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ تین شخصیتیں ہیں جن کا لقب القاضی الرشید بتایا گیا ہے۔ ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید ہیں، جن کا نام احمد ہے۔ دوسرے ان کے والد علی ہیں، اور تیسرے ان کے دادا ابراہیم ہیں۔

مولانا کے مطابق آخر والے دونوں القاضی الرشید کا تذکرہ دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا، حالانکہ ان دونوں کا تذکرہ الطالع السعيد مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے۔ علی کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی، اور ابراہیم کی نسبت مرقوم ہے کہ وہ ۴۷۲ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ احمد اور علی کا زمانہ چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے۔

مولانا اعظمی نے ہر دو محققین کی آراء کو دلائل و قرائن کی بنیاد پر پرکھا اور جانچا، جس کا تفصیلی ذکر یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مولانا اپنی تحقیق کی

روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچے کہ 'الذخائر والتحف' کے مصنف پانچویں صدی کے ہیں، اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ارمانوس ۴۶۳ھ میں موجود تھا، اور مصنف ذخائر کی تصریح کے مطابق ابوالفضل ابراہیم نے ارمانوس کو دیکھا ہے، چنانچہ وہ اس کے معاصر ہیں، اور ان کا زمانہ بھی پانچویں صدی ہے۔ مصنف ذخائر کا یہ بھی بیان ہے کہ ابوالفضل نے مجھ سے فلاں واقعہ بیان کیا ہے؛ لہذا مصنف ذخائر ابوالفضل کے معاصر ثابت ہوئے۔

مولانا اعظمی کے بقول جب یہ بات ضروری ہوگئی کہ ذخائر کے مصنف پانچویں صدی کے اعیان میں ہیں، اور ابن خلکان والے قاضی رشید چھٹی صدی کے فاضل ہیں۔ اسی طرح ان کے باپ علی بن ابراہیم کا شمار بھی چھٹی صدی ہی کے فضلاء میں ہے۔ اور ہرچند کہ وہ پانچویں میں بھی موجود رہے ہوں گے، لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ ۴۵۸ھ کے لگ بھگ ان کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو، البتہ ابن خلکان والے قاضی رشید کے دادا ابراہیم چونکہ ۴۷۲ھ میں ولایت قوص کے حاکم تھے؛ اس لئے ۴۵۸ھ میں ان کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو سکتی ہے۔

بہر حال مولانا اعظمی نے ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے کو قرین قیاس قرار دیا اور اپنا رجحان بھی اس کی طرف ظاہر کیا کہ الذخائر والتحف ابن خلکان والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اپنے اس مضمون کے آخر میں چند مفید اور معلومات آفریں نکات کا بھی اضافہ کیا ہے۔

سید مرتضیٰ زبیدی ہندوستانی تھے

سید عبدالسلام احمد فراج نے تاج العروس کی تحقیق کی ہے۔ مقدمہ میں انہوں نے یہ بحث اٹھائی کہ تاج العروس کے مصنف سید مرتضیٰ زبیدی ہندی الاصل ہیں یا نہیں؟

سید عبدالسلام کی تحقیق کے مطابق زبیدی عراقی الاصل ہیں، ہندوستانی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں دلائل و شواہد بھی پیش کئے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ نے سید عبدالسلام کی تحقیق پر عربی میں ایک تنقیدی مضمون تحریر فرمایا۔ انہوں نے اس مضمون میں محقق کی اس بات کی سختی سے تردید کی کہ زبیدی عراقی الاصل ہیں ہندی نہیں ہیں۔ مولانا نے یہ تنقیدی مضمون عربی میں "السید مرتضیٰ الزبیدی ہندی لایحوم حولہ شک" کے عنوان سے تحریر فرمایا۔

مولانا اعظمیٰ کی تحقیق کے مطابق زبیدی ہندوستانی ہیں، ان کا وطن بلگرام ہے، پانچویں صدی کے قریب زبیدی کا خاندان یا آباء واجداد نے بلگرام کو اپنا وطن بنایا تھا، سید غلام علی بلگرامی اور سید مرتضیٰ زبیدی دونوں کا نسب سید محمد صغریٰ واسطی شرم بلگرامی سے ملتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ وجیہ الدین صاحب بحر زار جو زبیدی کے معاصر ہیں، ان کا بیان ہے کہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرام میں ۱۱۴۵ھ میں پیدا ہوئے، ایک زمانہ تک یہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر یہاں سے 'سندیلہ' اور 'خیر آباد' گئے اور وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، اس کے بعد دہلی کا سفر کیا، جہاں انہوں نے شاہ ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی سے اکتساب فیض کیا، پھر سورت گئے، وہاں انہوں نے شیخ خیر الدین بن زاہد سورتی سے استفادہ کیا، ان کے پاس ایک سال

تک قیام کیا، اس کے بعد وہاں سے حجاز کا سفر کیا۔

غلام علی بلگرامی فرماتے ہیں کہ مرتضیٰ زبیدی کو کمسنی میں ہی حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی، مقامات مقدسہ میں حدیث کا علم حاصل کیا، ان ایام میں وہ زبیدی (یمین) میں مقیم رہے اور شیخ عبدالحق زبیدی کی خدمت میں رہ کر سماع حدیث اور قرأت کتب میں مشغول رہے۔ مولانا نے اس تعارف کے بعد محقق غلام سے یہ سوال کیا کہ کیا یہ گفتگو زبیدی کے علاوہ کسی اور مرتضیٰ کے بارے میں ہو رہی ہے؟

مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں زبیدی کی ایک تحریر کا حوالہ دیا جو انہیں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ملی، اس تحریر میں انہوں نے اپنے بھتیجے سید باسط علی بن سید علی بن سید محمد بن سید قادری کو اجازت حدیث دی ہے، اور سید باسط علی بلگرام کے ہیں۔

مولانا ان تفصیلات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زبیدی ہندی الاصل والدین سے ہیں، اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں، اس حقیقت سے انکار مغالطہ پر مبنی ہوگا۔

استاذ سید عبدالسلام کا خیال ہے کہ زبیدی نے زبیدی میں تعلیم پانے کے بعد دہلی کا سفر کیا۔

مولانا اعظمی نے محقق غلام کے اس خیال کی بھی تردید کی؛ کیونکہ مؤرخین و معاصرین کی تصریحات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے شہر سندیلہ، خیرآباد، دہلی اور سورت کا سفر زبیدی نے سفر حجاز سے پہلے کیا۔ زبیدی ۶۳ھ میں مدینہ اور ۶۴ھ میں مکہ میں تھے۔ اس کے بعد زبیدی منتقل ہو گئے اور وہاں ۶۶ھ تک قیام کیا۔ اسی سال حجاز گئے اور طائف میں مقیم ہوئے، اور حج و زیارت کر کے ۶۷ھ میں مصر کا سفر کیا۔ اس میں کہیں سے بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ زبیدی نے زبیدی میں تعلیم پانے کے بعد دہلی کا سفر کیا، بلکہ اس تفصیل میں تو اس کی نفی ہے۔

ان سب سے بڑھ کر اسی تحریر میں جو مولانا اعظمی کو کتب خانہ آصفیہ سے دستیاب ہوئی تھی زبیدی کے ہی قلم سے یہ تصریح موجود ہے کہ انہوں نے دہلی میں شاہ ولی اللہ کے آستانہ پر حاضر ہو کر اکتساب فیض کیا اور سماعت حدیث کی۔ شاہ صاحب نے ان کو اذکار و اوراد کی تلقین کی اور اجازت سے نوازا۔ یہ سب کچھ ۱۱۵۸ھ میں ہوا۔ (ص ۲۶) ایک اور جگہ زبیدی ہی ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے سید یسین عباسی مقیم اکبر آباد سے فیض حاصل کیا، انہوں نے بھی اذکار کی تلقین کی اور خرقہ خلافت سے نوازا اور اجازت دی۔ یہ واقعہ ۱۱۶۰ھ کا ہے۔ زبیدی ان تحریروں میں خود اقرار کر رہے ہیں کہ یہ سارے واقعات حجاز کے سفر اور زبیدی میں تعلیم حاصل کرنے سے پہلے کے ہیں۔ استاذ عبد السلام کا کہنا ہے کہ زبیدی نے (وسط) کے مادہ میں چند مقامات کو شمار کیا ہے، لیکن کسی ایک مقام کی طرف انہوں نے اشارہ نہیں کیا کہ وہ ان کی اصل ہے، بلکہ ایک خط میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی اصل عراق ہے۔

مولانا اعظمی اس کا جواب دیتے ہیں کہ زبیدی نے اگرچہ وسط کے مادہ سے مشتق مقامات میں سے کسی بھی مقام کی جانب اپنی اصل ہونے کا اشارہ نہیں کیا ہے، لیکن کئی جگہ زبیدی نے خود کو واسطی لکھا ہے۔ خود محقق عبد السلام نے زبیدی کا قول نقل کیا ہے (الحسینی الواسطی العراقي الأصل الزبیدی نزیل مصر) اسی طرح انہوں نے زبیدی کے بارے میں کتانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ وہ خود کو مجتم صغیر میں (الحسینی الواسطی) کہہ رہے ہیں۔

مولانا مزید لکھتے ہیں کہ زبیدی کے عراقی الاصل ہونے سے ان کے ہندوستانی نہ ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ بلگرام کے اکثر سادات کا دعویٰ ہے کہ ان کی اصل عراق کے واسط سے ہے، حالانکہ قطعی طور پر وہ ہندوستانی ہیں۔ سید غلام علی مآثر الکرام میں اپنا تذکرہ یوں لکھتے ہیں (الواسطی أصلاً

والبلکرامی منشأ) ج: ۱ ص: ۱۶۱، (الواسطی أصلاً، والبلکرامی مولداً و منشأ) ج: ۲ ص: ۲۹۱۔ مختصر یہ کہ بلگرام کے سادات عراقی الاصل ہیں، اور ان کا مولد اور وطن ہندوستان ہے۔

سید عبد السلام کہتے ہیں کہ اگر یہ بات صحیح بھی ہو کہ زبیدی ہندوستان میں پیدا ہوئے تو بھی ان کا قیام وہاں ایک مختصر مدت کے لئے رہا۔

استاذ عبد السلام کی اس بات پر مولانا اعظمی نے تعجب کا اظہار فرمایا؛ کیونکہ سید عبد السلام نے اپنے مقدمہ میں خود ہی یہ اعتراف کیا ہے کہ زبیدی نے حجاز کا سفر اٹھارہ سال کی عمر میں کیا، کیا یہ مدت مختصر ہے؟

مولانا فرماتے ہیں کہ جب غلام علی بلگرامی وغیرہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے محقق غلام نے بفرض محال ہی سہی یہ تسلیم کر لیا تو انہیں ان تذکرہ نگاروں پر اعتماد کرتے ہوئے یہ بھی مان لینا چاہئے کہ زبیدی حصول علم کے لئے ہندوستان میں پھرے، اور سورت میں ایک سال قیام کیا، پھر وہاں سے حجاز کا سفر کیا، اور یہ کہ وہ ہندوستان میں بلوغ کے بعد طویل مدت تک رہے۔ اس مدت (عمر) تک جس میں ہمارے یہاں کے طالب علم تعلیم مکمل کرتے ہیں اور علوم نقلیہ و عقلیہ میں سند فراغ حاصل کرتے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے مزید دلائل دیئے اور یہ ثابت کیا کہ سید مرتضیٰ زبیدی ہندوستانی ہیں۔ اس حقیقت کا انکار دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہوگا۔ مولانا نے اس مضمون سے تاریخ میں در آنے والی غلطی کا ازالہ فرمایا، اور تاج العروس جیسی مرجعی حیثیت کی حامل کتاب کے مصنف کے بارے میں جو مغالطہ اور شک و شبہ پیدا ہو گیا تھا اسکو دور کیا۔ تاریخ کی یہ ایک اہم خدمت ہے۔ مولانا کا یہ مضمون عربی مجلہ 'البعث الاسلامی' ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ میں شائع ہوا۔

مضامین و مقالات

(تاریخ و تذکرہ سے متعلق)

تاریخ و سیر سے متعلق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے دستیاب مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ مضامین کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے۔

۱- سیرت ابراہیم ابن ادہم اور ان کے مدفن کی تحقیق (الفرقان اپریل ۱۹۷۹ء)

۲- امام شافعی کے دو سفر نامے

۳- پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء)

۴- تصحیح و استدراک بسلسلہ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف جنوری ۱۹۵۵ء، دارالعلوم مئیں، جون ۱۹۶۲ء)

۵- جواد سابط (معارف اپریل ۱۹۲۸ء)

۶- حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (برہان مارچ و اپریل ۱۹۵۴ء)

۷- شیخ الاسلام مولانا مدنی کی حیات مبارکہ کے تین دور (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

۸- دینور اور مشائخ دینور (معارف اکتوبر ۱۹۶۵ء)

۹- صحابہ کے مختصر تذکرے

۱۰- علم و فضل میں خواتین کا حصہ

۱۱- فتوحات حضرت معاویہ تاریخ کی روشنی میں (دارالعلوم اپریل ۶۵ء)

۱۲- مولانا عبد الرحمن جامی اور ان کا سفر حج (الفرقان اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء، ابلاغ

جنوری ۱۹۷۸ء)

۱۳- تذکرہ مشاہیر قوم (المومن شوال، ذیقعدہ، ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ)

- ۱۴- علمائے اہل کمال (المومن جمادی الاولی والاخری اور رجب ۱۳۴۳ھ)
- ۱۵- تذکرہ علماء (نا تمام)
- ۱۶- حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ (المآثر رجب تا رمضان ۱۴۱۹ھ)

ادب

مولانا کی ہشت پہل شخصیت کے کچھ ابعاد ایسے ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ مفسر تھے، محدث تھے، محقق تھے، مفتی تھے، مفکر تھے، لیکن ان تمام اوصاف کے ساتھ ادب کی تخلیقیت ان کے پورے وجود کا لازمہ تھی۔ وہ شاعر، انشاء پرداز اور ادیب بھی تھے، چنانچہ آئندہ صفحات میں ان کی ادبی خدمات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا اعظمی کا یہ پہلو زیادہ تر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے، حالانکہ زندگی کا یہ وہ رخ ہے، جس کے ذکر کے بغیر مولانا کی شخصیت اور علم و ادب سے متعلق ان کی خدمات کا ایک اہم ترین باب تشنہ و نا مکمل رہ جائے گا۔

عربی نثر

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کو عربی زبان و ادب سے ابتداء سے ہی خاص مناسبت تھی، اس دلچسپی اور انس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ انہیں حضرت مولانا عبد الغفار صاحب عراقی منوی جیسے متبحر عالم دین اور عربی زبان و ادب کے ماہر کی شاگردی نصیب ہوئی، مولانا اعظمی بچپن سے ہی آپکی زیر تربیت رہے، شامل نصاب عربی ادب کی کتابوں کے علاوہ ادب کی متعدد کتابیں: بدیع الزماں ہمدانی کی 'مقامات'، زنجیری کی 'اطواق الذهب'، ابن قتیہ کی 'الشعر و الشعراء'، قصیدہ بانٹ سعادت، دیوان ابوالعلاہیہ اور کتب بیان و معانی وغیرہ آپ سے پڑھیں، مولانا اعظمی اعیان

الحاجؒ میں مولانا عبدالغفار صاحب کے تذکرہ میں خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

”ناچیز کو بھی آپ ہی کی خدمت میں کچھ شد بد حاصل ہوئی۔“

عربی زبان میں مولانا کی استعداد، صلاحیت اور پختگی کا اندازہ دار العلوم دیوبند کے امتحان داخلہ میں پیش آئے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، اس واقعہ کو مولانا عبدالحفیظ صاحب رحمانی نے براہ راست مولانا اعظمی سے سن کر نقل کیا ہے، ہم اس واقعہ کو تلخیصاً یہاں نقل کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں مولانا اعظمیؒ کا امتحان داخلہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لیا اور مشورہ دیا کہ ادب کی کوئی کتاب ضرور پڑھ لو، مولانا اعظمی نے جواب دیا کہ: ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ مولانا کے جواب پر مفتی صاحب کو حیرت ہوئی اور مقامات حریری کھول کر ان سے ترجمہ کرنے کو کہا، مولانا نے کتاب بند کر کے وہ مقامہ زبانی سنا دیا، مفتی محمد شفیع صاحبؒ طالب علم کی اس ذہانت و لیاقت سے بہت متاثر ہوئے اور شیخ الادب والتفسیر حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کو یہ رپورٹ بھیجی کہ: ”انکو ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مزید اطمینان حاصل کر لیں۔“ جب یہ رپورٹ مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے یہاں پہونچی تو انہوں نے مقامات حریری دے کر فرمایا کہ کوئی مقامہ پڑھو اور ترجمہ کرو، مولانا نے ایک مقامہ زبانی سنانا شروع کیا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے درمیان میں روک کر نحوی صرفی تحلیل کے ساتھ دو تین الفاظ کے معانی پوچھے، جنہیں مولانا نے بتا دیا، اس پر مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے آخر میں فرمایا کہ:

”ہاں مولوی صاحب تم کو مزید عربی ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم اپنے لئے جو مناسب سمجھو وہ پڑھو۔“

مولانا جب دارالعلوم منو سے فارغ ہوئے تو دورہ کے خاص استاذ حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی نے آپ کو خصوصی سند عطا کی، حمد و ثناء کے بعد اس سند کو یہاں سے شروع کیا: ”ان الفاضل السلیب والأدیب الأریب العالم الیلمعی.....“ اے (فاضل و انا، ادیب اریب، عالم ذکی) مولانا اعظمی کو ادب سے اس حد تک دلچسپی تھی کہ، ہر طرز اظہار اور اسلوب میں بھی جمالیاتی طرز اور نزاکت خیال کا لحاظ رکھتے تھے، یہ درست ہے کہ صرف تشبیہ و استعارہ سے گراں بار تحریر ہی ادب نہیں ہوتی، مگر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تشبیہ و استعارہ، کنایہ و اشارہ یہ سب وہ موتی ہیں جن سے ادبی تاج جگمگاتا ہے۔

مولانا کی ادبی قابلیت کا اندازہ دور طالب علمی کے لکھے ہوئے بعض خطوط سے بھی ہوتا ہے، چند خطوط ہماری خوش قسمتی سے دستیاب ہو گئے، انہیں مکتوبات میں ایک مکتوب حضرت مولانا فیض الحسن صاحب مکی کے نام ہے، مولانا فیض الحسن صاحب مولانا اعظمی کے خاص رفیق اور بے تکلف دوست تھے۔ مولانا نے یہ خط مدرسہ مظہر العلوم بنارس سے ۱۹۳۷ء میں لکھا ہے، وہ خط پیش خدمت ہے:

من المتمادی فی العصیان، عبد اللہ حبیب الرحمن،
إلی السمیدع الأجل، بقیة انکرام الأول صاحب الأخلاق
الزاکیات، والصفات المرضیات

من ذکرہ ینفی الشجن أعنی أخی فیض الحسن
یحمیه ربی ذو المن عن ریع احماء المحن
لا زالت أعلام علومہ منشورة، وعینی باجتلاء محیاه
مقرورة، أهدي إلیہ تسلیمات أرق من ماء الشبیبۃ والذمن

لقاء الحبيبة، يهبط أريجها المسك الأذفر، ويفوت رباها
فوائح العنبر أنهى إليه تحيات أحلى من الشهد والعسل
وأشهى من اجتناء جنى القبل.

وبعد فقد ورد كتابك أيها الصديق المصافي، بعد أن
اشتد شوقي إليه وطال اختفائه عن عيني، فأزاح الهموم عن
قلبي المبتول وكشف البلايل عن فؤادي المبتول، الكئيب
الذي هذه الزمن المسمى بتمنيته بالحصان الكواعب،
والغواني المشرقات الحقائق، فبنفسي كتاب يزري سواده
بذوائب الخرائد، وبدجئات حوالك الصب المعنى بحب
السواهد، ويعبر بياضه على عوارض البيض الخدود وعلى
لوامع ثنابا الرشاق القدود، وكتاب ينبي عن احتلاب كاتبه
من حليب الأدب ووروده مشارع العلم والحسب.

فأشكر لك على أن ثنيت عنان عنايتك نحو هذا العبد
الخامل، وشرفتني بتلك الهدية الثمينة، والحال أنني لست
من أهلها، ثم استطلع منك أنك متى تزمع الترحل إلى دارك
أعلمني، أرحل معك إن شاء الله تعالى وأقرأ السلام مني
على أئمتنا الفاضل المولوي قمر الدين الأعظمي، أنا من
سرى فيه الفتكم مسرى الراح من النشوان.

أقل عباد الله حبيب الرحمن

من بلدة بنارس

وها أنا الآن مشغول بأشغال الامتحان العامي، وليكن آخر

كلماتي أن التمس منك التعجيل في ابلاغ حوار كتابي
بإزاد التشریف بإیراده وأدعو الله الكريم أن يوفقك
لحيازة قصبات السبق في مضامير العلوم. فقط

حرره العامي حبيب الرحمن الأعظمي
من مظهر العلوم الكائن في مدينة بنارس

شعبان ۱۳۹۳ھ

(غرقاب بحر عصیان، بندہ خدا حبیب الرحمن کی جانب سے فاضل مکرم،
بقیۃ السلف کی خدمت میں، جن کے اخلاق پاکیزہ اور اوصاف پسندیدہ
ہیں، جن کی یاد سے رنج و غم کا فورہ ہوتے ہیں، یعنی برادر مکرم جناب مولوی
فیض الحسن صاحب، رب محسن و منعم رنج و غم سے ان کی حفاظت فرمائیں،
اللہ کرے ان کے علم کا جھنڈا لہراتا رہے، اور میری آنکھیں ان کے
چہرے کی زیارت سے ٹھنڈی رہیں، میں ان کی خدمت میں سلام کا ہدیہ
پیش کرتا ہوں، ایسے سلام کا جو رونق جوانی سے بڑھ کر لطیف اور وصال
محبوب سے زیادہ لذیذ ہے، جس کی خوشبو، مشک پر غالب ہے اور غنبر کی
عطر بیزی سے بڑھ کر ہے، میری طرف سے ان کے جناب میں شہد و شکر
سے شیریں، اور بوس و کنار سے زیادہ حلاوت بخش دعائیں!

میرے مخلص دوست! آپ کا خط مجھے عین شدت شوق کے وقت ملا،
جبکہ عرصہ سے آپ کے مکتوب کی زیارت سے میری نگاہیں محروم تھیں، آپ
کے خط نے میرے شکستہ دل سے غموں کی بدلیاں چھانٹ دیں، اور قلب

۱۔ مولانا اعظمی کی حیات و خدمات سے متعلق مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے ۵۴ صفحات پر مشتمل ایک
مضمون مرتب کیا تھا، یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے، خوش قسمتی سے اس کا قلمی مسودہ راقم الحروف کو دستیاب
ہو گیا، یہ خط اس مسودہ میں صفحہ ۱۹ پر ہے۔ اس مسودہ کا حوالہ قلمی تحریر کے عنوان سے دیا جائے گا۔

حزین کے اضطراب کو دور کر دیا، وہ دل جس کو ظالم زمانہ نے پری پکیروں اور نازک انداموں کی آرزو میں الجھا کر برباد کر دیا تھا، بخدا! آپ کے سواد خط نے حسین دوشیزاؤں کے زلف سیاہ کو مات، اور عاشق نامراد کے بخت تاریک کو شکست دے دی، اور آپ کے بیاض خط نے خوبصورت گورے چٹے رخساروں، اور حسینوں کے چمکتے ہوئے دانتوں کی روشنی کو دبا دیا، یہ خط اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا لکھنے والا ادب کے آب زلال سے سیراب اور علم و شرف کی دولت سے مالا مال ہے۔

شکر ہے کہ آپ نے عنان توجہ اس بندہ گنہگار کی جانب پھیری اور یہ قیمتی تحفہ ارسال کیا، حالانکہ میں اس کے لائق نہیں تھا، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ گھر کب تک جائیں گے، مجھے اطلاع دیجئے، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا ان شاء اللہ، میری طرف سے اخونا الفاضل مولوی قمر الدین اعظمی کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

وہ جس کی رگ و پے میں آپ کی محبت اس طرح سرایت کر گئی ہے، جیسے نشہ والے میں شراب سرایت کرتی ہے۔

یعنی بندہ مکترین حبیب الرحمن

(نوٹ) میں اس وقت سالانہ امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں اور آخر میں عرض ہے، اس خط کا جواب جلد دیں گے، میں اللہ کے حضور دعا کرتا ہوں کہ آپ کو میدان علم میں سبقت کی توفیق بخشے رہیں۔

حبیب الرحمن الاعظمی

مظہر العلوم بنارس

یکم شعبان ۱۲۹۳ھ

جس طالب علم کے ادبی ذوق اور انشاء پردازی کا یہ حال ہو، جس کی جمالیاتی حس اور علمی لیاقت کی شہادتیں اساتذہ فن اور مشاہیر علماء دے رہے ہوں، اس طالب علم کے فضل و کمال کا کیا کہنا!

مولانا اعظمی کی عربی زبان میں تین کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے، جن کی تصنیف سے آپ ۲۳ برس کی عمر میں فارغ ہو چکے تھے: التوضیۃ بأسرار التسمیۃ، تذکرۃ ادباء الهند، الاتحافات السنیۃ بذكر محدثي الحنفیۃ۔

ان کے علاوہ مزید تین تصنیفات ہیں: الالبانی شذوذہ وأخطاؤہ، تجرید شواہد أوضح المسالک، الحاوی لرجال الطحاوی۔

عربی قواعد سے واقفیت | مولانا اعظمی نے نحوی، صرفی قواعد وغیرہ کی تعلیم ماہرین درسیات سے حاصل کی، ان اساتذہ سے اکتساب فیض کر کے زبان کی فصاحت و بلاغت سے باخبر ہوئے، تا آنکہ عربی قواعد کے اصول و فروع میں مولانا کو مہارت حاصل ہو گئی، اور ان علوم کے شاذ اور دقیق مسائل بھی انکے حیطہ علم میں آ گئے؛ یہی وجہ ہے کہ نحو و صرف کی تصحیح پر بہت زور تھا، مولانا کے درس میں عبارت خوانی کی صحت کا خاص اہتمام تھا، طالب علم کی ذرا سی غلطی بھی برداشت نہیں کی جاتی، حدیث و فقہ کی دیگر کتابوں کے ساتھ عربی ادب کی بھی کتابیں مولانا کے پاس رہتی تھیں، خاص طور پر حماسہ وغیرہ، حماسہ کا درس تو بہت مشہور تھا، مولانا اعظمی کے شاگرد مفتی ظفر الدین صاحب مولانا اعظمی کے انداز درس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

”عبارت خوانی میں صحت کا پورا لحاظ تھا، اس لئے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے یہاں عبارت اور ترجمہ وغیرہ کا حل کرنا طالب علم کے

لے راقم الحروف کی نظر سے یہ کتابیں نہیں گزری ہیں، سوانح میں ابتدائی تصنیفات کی ایک فہرست دی گئی ہے، اس فہرست میں ان کتابوں کے بھی نام ہیں۔

ذمہ ہوتا تھا، اور ایک زیر زبر کی غلطی بھی معاف نہیں کی جاتی تھی ذرا سی غلطی پر صرف، نحوی ترکیب و تحلیل پوچھنا شروع فرما دیا کرتے تھے..... جن طلبہ کی صرف و نحو کمزور ہوتی تھی وہ عبارت نہیں پڑھ سکتے تھے۔“

نحو پر مولانا اعظمی کی ایک غیر مطبوعہ کتاب بھی ہے، جس کا نام ’تجربید شواہد اوضح المسالک‘ ہے۔ ابن ہشام نحوی متوفی ۶۲۷ھ کی نحو کی مشہور کتاب، ’اوضح المسالک‘ میں بطور شواہد جو اشعار ہیں، مولانا اعظمی نے اپنی اس کتاب میں انہیں جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتب و رسائل کی فہرست میں ’مفتاح النحو‘ نام کی بھی ایک کتاب کا تذکرہ ملتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی عربی قواعد پر اس قدر عمیق نگاہ تھی اور اس سلسلہ میں اتنا وسیع مطالعہ تھا کہ جہاں کہیں بھی غلطی ہو ان کی عقابی نگاہ اسے ڈھونڈ نکالتی! اس کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:

’الرفع والتکميل‘ کے پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۷ پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی عبارت ہے: ”وعدم فرقههم بين الجرح المبهم والجرح الغير المبهم“۔ اس پر شیخ ابو غدہ نے تعلیقاً تحریر فرمایا:

”وهكذا جاء في الأصلين، وهو استعمال خاطئ وغلط

شائع لما جمع فيه من ادخال ’أل‘ على ’غير‘ مع الاضافة

الى ما فيه ’أل‘ وصوابه أن يقال (الجرح غير المبهم)۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں اصولوں میں یونہی ہے، یعنی اضافت کی حالت میں ’غیر‘ پر ’أل‘ کے استعمال کے ساتھ، لیکن یہ استعمال درست نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ ’الجرح غير المبهم‘ کہا جائے، یعنی ’غیر‘ پر ’أل‘ نہ ہو۔

شیخ ابو غدہ کی اس تحقیق پر مولانا اعظمی نے حاشیہ لگایا:

”کیف تقطع بكون هذا الاستعمال خاطئاً مع قول سيبويه
والمبرد ان كلمة (غير) مشابهة لاسم الفاعل بمعنى الحال
وان (غيرك) بمنزلة (مغایرک) فعلى هذا يجوز دخول
ال على (غير) المضاف الى محلى باللام. راجع شرح
التصريح لخالد الأزهری (۲/۲۷) و (۲/۲۹) واجب ان
تزيد كلامك هذا ايضاحاً وتعزيزاً. (الأعظمی)

(اس استعمال کے غلط ہونے کا فیصلہ قطعی طور پر کیسے کر سکتے ہیں، جبکہ
سیبویہ اور مبرد کا یہ قول ہے کہ لفظ ’غیر‘ اسم فاعل کے مشابہ اور حال کے
معنی میں ہوتا ہے، اور (غیرک) (مغایرک) کے درجہ میں ہوتا ہے؛ لہذا
اس صورت میں غیر پر الف لام کا استعمال جبکہ وہ مضاف ہو کسی ایسے لفظ
کی طرف جس پر الف لام داخل ہو درست ہے، حوالہ کے لئے شرح
التصريح خالد ازهری کی جلد ۲ صفحہ ۲۷ و ۲۹ دیکھئے۔ لہذا آپ کے اس قول
کی مزید وضاحت اور تائید ضروری ہے۔)

پھر اپنی اس توجیہ کے سلسلہ میں مولانا اعظمی نے شیخ ابو نعیمہ کے نام ایک خط
میں تحریر فرمایا:

”قد وجدت في (اصلاح الفاسد من لغة الجرائد) كلاماً
مشبعاً على تعريف (الغير) أرجو أن تكونوا قد وقفتم عليه،
وفيه ما يقوي رأيكم، ومع ذلك فيه ما يقوي اعتدائي عن
الشيخ عبد الحي رحمه الله.“

(”اصلاح الفاسد من لغة الجرائد“ میں لفظ ’الغیر‘ کی تعریف
سے متعلق بڑی مفصل گفتگو مجھے ملی، امید ہے کہ آپ بھی اس سے واقف

ہوں گے، اس کے بحث سے آپ کے خیال کی تائید ہوتی ہے، تاہم اس بحث کے اندر مولانا عبدالحی کی جانب سے میری عذر داری کے لئے بھی تقویت کا سامان موجود ہے۔ ۱۔

اس پوری بحث میں مولانا اعظمی کی علمی دیانت کی بھی شہادت ملتی ہے کہ انہوں نے لفظ 'غیر' پر بحث کی اور پھر جب انہیں شیخ ابو غدہ کے موقف کی تائید ملی تو فوراً خط سے مطلع فرمایا۔ اس خط سے یہ اندازہ کرنا کہ مولانا اعظمی کی تحقیق صحیح نہ تھی درست نہ ہوگا؛ کیونکہ مولانا اپنے موقف کے بارے میں خود یہ لکھ رہے ہیں:

”تاہم اس بحث کے اندر مولانا عبدالحی کی جانب سے میری عذر داری کے لئے بھی تقویت کا سامان موجود ہے۔“ ۲۔

زبانِ دانی | حدیث کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ سولہ کتابیں ہیں جن پر مولانا اعظمی نے حواشی و تعلیقات لکھی ہیں، ان کے علاوہ متعدد ایسی کتابیں ہیں جن کی احادیث و آثار کی انہوں نے تحقیق کی یا جن کی اشاعت مولانا اعظمی کی مرہونِ منت ہے، حدیث کا اہم اور قدیم ترین مرجع 'مصنف عبد الرزاق' کی تحقیق ان کے بلند ادبی معیار کی آئینہ دار ہے، 'مجمع بحار الانوار' کی تصنیف حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی کا عظیم کارنامہ ہے، محدث پٹنی نے اس کتاب میں قرآن مجید اور حدیث شریف کے مشکل الفاظ کی تشریح و تحقیق کی ہے۔ مولانا اعظمی نے قرآن و حدیث کی اس لغت پر بھی کام کیا ہے۔

تعلیقات میں مولانا اعظمی الفاظ کی تشریح و تحقیق کرتے ہیں، عبارت کے سیاق و سباق سے سقطات کی نشاندہی فرماتے ہیں، احادیث میں واقع ہونے والی

۱۔ المآثر فروری تا اپریل ۹۸ء ص ۳۸-۳۹

۲۔ مولانا کے علمی توازن کی یہ بڑی اچھی مثال ہے کہ اس عالمانہ بحث میں انہوں نے اعتراض برائے اعتراض کے موقف کو نہ اپنا کر اعتراض مع اعتراف کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔

تعییفات کی گرفت کر کے ان کی تصحیح کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو زبان کے اسرار و رموز سے واقف اور اس کے مخصوص ادب کے ہر نشیب و فراز سے باخبر ہوگا، یہ خوش بختی اسی کا حصہ ہے جو زبان کی خوبیوں و خامیوں کی پرکھ کی صلاحیت رکھتا ہو، جس کا مزاج ادبی تحقیق و تجسس کا ہو، اور جس کی نظر ادبی شہ پاروں اور متفرق ادبی روایات وغیرہ پر ہو۔

علوم عربیہ پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی مضبوط گرفت تھی اور اسی کے ساتھ غریب و مشکل الفاظ کے حل پر بھی قدرت تامہ حاصل تھی۔ مولانا کی زبان دانی کی چند مثالیں یہاں بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں؛ تاکہ قاری کو خود بھی اندازہ ہو سکے:

۱۔ مصنف عبدالرزاق ج: ۱ ص ۲۶۳ پر ایک عبارت ہے: ”..... من غسل رأسه بغسل.....“

مولانا اعظمی ’غسل‘ کی تشریح کرتے ہیں: ”الغسل بالكسر ما يغسل به الرأس من خطمي ونحوه“ یعنی غسل (غ کے کسرہ کے ساتھ) سے مراد وہ چیز ہوتی ہے، جس سے سردھویا جائے، جیسے خطمی (ایک قسم کی گھاس) وغیرہ۔

۲۔ مصنف عبدالرزاق ج: ۱ ص ۴۱۹ پر ایک عبارت: ”كنت غلاماً أعزباً“ ہے۔ مولانا اعظمی ’عزب‘ کی تشریح یوں کرتے ہیں: ”ففي رواية 'أعزب'، و'العزب' والأعزب من لا أهل له“ یعنی ایک روایت میں ’عزب‘ ہے، عزب اور اعزب اس شخص کو بولتے ہیں جس کے اہل و عیال نہ ہوں۔

۳۔ مجمع بحار الانوار ج: ۱ ص ۳۱۸ پر ایک عبارت ہے: ”نفسى عنه جبرية التكبر بفتح جيم وسكون باء الكبير“ یعنی ’جبریہ جیم کے فتح اور باء کے سکون کے ساتھ کبر کے معنی میں ہے۔

اس پر حاشیہ ملاحظہ ہو:

”فی هامش الفتية: وفي اللغة هو بفتحين. قال الأعظمي
أما بمعنى التكبر فكلاهما معروف في اللغة وأما الفرقة
الجبرية فالصواب فيها بفتحتين، راجع القاموس.“

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مجمع بحار الانوار کے پٹنی نسخہ کے حاشیہ میں ہے
کہ لغت میں ”جبرية“ جیم اور باء دونوں کے فتح کے ساتھ کبر کے معنی میں ہے۔
مولانا اعظمی نے اس پر حاشیہ لگایا کہ کبر کے معنی میں لغت میں دونوں معروف ہیں،
البتہ ’الفرقة الجبرية‘ جب کہیں گے تو اس وقت جیم اور باء دونوں پر فتح ہوگا،
قاموس سے مراجعت کیجئے۔

۴۔ مجمع بحار الانوار ج: ۱ ص ۲۷۵ پر ایک لفظ ہے: ”حديا الناس“ مولانا اعظمی
حاشیہ میں اسکی تشریح فرماتے ہیں: ”حديا الناس ممن يتعدهم، يقال: أنا
حدياك في هذا الأمر، أي معارضك.“

یعنی ’حديا الناس‘ اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں سے جھگڑا اور مقابلہ کرتا
پھرے، کہا جاتا ہے ’أنا حدياك في هذا الأمر‘ میں اس بارے میں تجھ سے مقابلہ
کرنے والا ہوں۔

۵۔ ابو حفص عمر بن خلف بن مکی صقلی تونسلی متوفی ۵۱۰ھ کی کتاب ’تخفيف اللسان وتبسيط
البيان‘ ڈاکٹر عبدالعزیز مطر کی تحقیق سے لجنۃ احیاء التراث الاسلامی القاہرہ سے شائع
ہوئی ہے، یہ کتاب لغت کے موضوع پر ہے، مولانا اعظمی نے اس پر چند حواشی رقم کئے
ہیں، ایک حاشیہ ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۴۹ پر عربوں کا ایک مقولہ ہے: ’املاک العجین أحد الربیعین‘
ڈاکٹر عبدالعزیز مطر نے اسکی تشریح میں لکھا:

”فی غریب الحدیث (ورقة ۴۲۵): وقول عمر بن الخطاب: املكوا العجین فانه أحد الربعین، ای اچیدو! عجنہ، والربع الزیادۃ، فالربع الاول الزیادۃ فی الطحن والثانی فی العجین“

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ آٹا اچھی طرح گوندھنے سے اس میں زیادتی ہوتی ہے؛ اس سلسلہ میں حضرت عمر کا قول ہے کہ اچھی طرح آٹا گوندھو کہ وہ دو زیادتیوں میں سے ایک ہے، ربع زیادتی کے معنی میں ہے، پہلی زیادتی آٹا پیسنے کی اور دوسری گوندھنے کی۔

مولانا اعظمی نے محقق کے اس حاشیہ پر حاشیہ لگایا کہ: ”الربع بالفتح النماء“ ڈاکٹر مطر نے اسکو ’ب‘ کے ساتھ لکھا ہے، مولانا اعظمی نے اسکو ’بی‘ کے ساتھ لکھا اور یہ بتایا کہ اسکے معنی زیادتی کے ہیں۔

۶۔ کتاب نسب قریش للوزیر بن بکار، ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ محقق علامہ محمود شاہ مصری کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ منظر عام پر آئی، جب یہ کتاب مولانا اعظمی کے ہاتھوں میں پہونچی تو انہوں نے دوران مطالعہ جہاں جہاں اس کتاب کی تحقیق و تشریح یا کسی لفظ کی لغوی بحث میں علامہ محمود شاہ مصری سے ذہول یا سہو ہو گیا تھا، انکو قلم بند فرمایا اور ایک مضمون کی شکل میں ان استدراکات کو مرتب کر کے مجلہ ’الحج‘ مکہ مکرمہ اور ’البعث الاسلامی‘ ہندوستان میں بھیج دیا۔ آپ کی اس تنقید یا استدراک کو علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا، ان استدراکات کی تعداد گیارہ ہے۔ یہاں بطور نمونہ ایک استدراک پیش خدمت ہے:

کتاب میں ایک عبارت ہے: ”أظنها صدقة علی المخدمین

بمکة“ علامہ محمود محمد شاہ نے اس پر تعلق لکھی:

”المخدمون هم المخدومون يكثر خدمهم وحشمهم“

مخدم سے مراد مخدوم ہیں، جنکے خدام اور نوکر چاکر بہت ہوں، پھر آگے لکھتے ہیں: ”يشبه أن يجعل معنى المخدمين هم الخدم“ (ص ۲۲۳) ممکن ہے کہ مخدوم سے مراد خدام ہی ہوں۔

مولانا اعظمی نے علامہ محمود محمد شاہ کی گرفت کی اور لکھا:

”أقول هذا كله تعسف وتكلف، والصواب أن تلك الكلمة

أخطأ المحقق في قراءتها، ولا شك أن صواب العبارة:

أظنها صدقة على المجذمين بمكة، يعنى المجذمين

(المصابين بالجذام)“

(یہ تمام باتیں تعسف و تکلف ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ محقق نے اس کلمہ کی

قرأت میں غلطی کی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح عبارت ”أظنها

صدقة على المجذمين بمكة“ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مخدومین نہیں

ہے بلکہ مجذومین (جذام زدہ لوگ) ہے۔)۱

۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۵۶ پر یہ عبارت ہے: ”عن ابن عمر أنه كره أن

يتلثم الرجل في الصلاة“ مولانا اعظمی نے حاشیہ میں ’تلثم‘ کی تشریح کی: ”شد

الفم باللسان، واللسان: ما كان على الأنف وما حوله من ثوب أو نقاب“

تلثم منہ پر کپڑا (ڈھانٹا) باندھنے کو بولتے ہیں، لسان اس کپڑے یا نقاب کو کہتے ہیں جو

ناک اور اس کے ارد گرد باندھا جائے۔

اسلوب نگارش | اسلوب نگارش میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مولانا کی عبارت

موضوع کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، فقرے موزوں و مرتب ہوتے ہیں، اور چونکہ مختلف موضوع پر لکھتے ہیں؛ اس لئے ہر موضوع کی مناسبت سے انکا جداگانہ طرز ہوتا ہے۔ انکا طرز ایسا نہیں کہ عربی زبان تک ہی محدود ہو بلکہ اردو زبان میں بھی یہی اسلوب ہے۔

مولانا اعظمی کے متفرق مضامین و مقالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں افہام و ابلاغ کی پختہ صلاحیت تھی، ان کی تحریر میں سلاست، سادگی اور متانت ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضمون کو پڑھ کر قاری کے سامنے وہ مخصوص موضوع یا مسئلہ جس پر وہ لکھ رہے ہوتے ہیں آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ ابن المقفع کے مطابق بلاغت کا یہی مزاج اور تعریف بھی ہے کہ :

”ہی التي اذا سمعها الجاهل ظن انه يحسن مثلها“

(جاہل جب سنے تو سمجھے کہ وہ بھی اسی طرح بہترین کلام یا عبارت پیش کر سکتا ہے۔)

مولانا کی انشاء پر داری کی ایک دوسری اہم خصوصیت 'ایجاز' ہے۔ مطول اور مفصل بات کو مختصر انداز اور چھوٹے پیرائے میں بڑے سلیقہ سے پیش کرتے ہیں۔ ایک جملہ میں وہ مفہوم قاری تک پہنچا دیتے ہیں جو کبھی کبھی طویل عبارت میں بھی ادا نہیں ہو پاتا۔ محدث اعظمی کی تعلیقات، تحریرات، خطوط اور بیاض میں انکی تحریر کی یہ خوبی نمایاں ہے۔ حدیث کی کتابوں پر مولانا کے جو مقدمے ہیں وہ ان کی بہترین عربی نثر کی غماز ہیں، عربی زبان کے ادیبوں نے ان مقدموں کی تعریف و توصیف کی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مجمع بحار الانوار کے مقدمہ کی بہت تعریف کی، جسے ہم مجمع بحار الانوار کے تعارف میں نقل بھی کر چکے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات ہیں جنہوں نے مولانا کے عربی طرز نگارش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

دوسری تحریروں کو چھوڑیے! صرف ان تحریروں کو دیکھ لیجئے جن میں مولانا نے اہل علم حضرات اور مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے، کتنا مختصر ہے یہ تذکرہ! لیکن اس کے باوجود اس شخصیت سے متعلق تمام پہلوؤں پر کس قدر حاوی ہے! ان تحریروں میں مولانا اعلیٰ نے متعدد شخصیات کی وفات پر اپنے تاثرات، خیالات اور تعلقات کا اظہار کیا ہے، اس موقع پر مولانا کی نثری تحریر کے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں؛ تاکہ عربی نثر کا اسلوب قاری کے سامنے خود آشکار ہو جائے۔

۱- ابو الکلام آزاد: منشی مجلۃ الهلال والبلاغ ومصنف تذکرہ اولاً، ووزیر معارف حکومت مرکزیہ ہند آزاد آخراً، ولاشک انہ کان نابغۃ جید الحافظۃ، قوی الفکر، ذا بلاغۃ رالعة، کاتباً قدیراً! ابتدع اسلوباً جدیداً فی الإنشاء الأردوی، رأیتہ مراراً وسمعت خطباتہ، وکان من أركان مجلس العمل لجمعية علماء الهند المركزية وأنا من أعضائه أيضاً، فجالستہ فی ذلک المجلس عدة مرات، أصيب بالفالج وتوفي فی أوائل شوال سنة ۱۳۷۷ھ۔

(ابو الکلام آزاد اولاً مجلہ الهلال والبلاغ کے بانی اور تذکرہ کے مصنف اور آخر میں آزاد ہندوستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم تھے، بلاشبہ وہ جوہر حافظ، قوت فکر اور حیرت انگیز زور بیان میں نابغہ روزگار اور پختہ انشاء پرداز تھے، اردو انشاء پردازی میں انہوں نے نیا طرز ایجاد کیا، میں نے انہیں بار بار دیکھا اور انکی تقریریں سنیں، وہ مرکزی جمعیت علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، اس وقت میں بھی ممبر تھا؛ لہذا مجلس میں بار بار

میں ان کا ہم نشیں رہا، فالج کا حملہ ہوا اور شوال ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں رحلت فرما گئے۔)

۲- مولانا سید أبو الاعلیٰ المودودی: أبو الاعلیٰ المودودی، کان کتاباً بلیغاً، وله اطلاع واسع وتفكير قوي، وله تصانيف كثيرة في مختلف الموضوعات، أجاد في بعضها وأصاب، وأخطأ في بعضها فزاع عن منهج الصواب، ونجست فتنة في الإسلام لبعض آرائه الشاذة، توفي في سبتمبر سنة ۱۹۷۹ في أمريكا، ونقلت جثته إلى باكستان ودفن هناك، وبإلتهام لو استنوا بسنة الإسلام في التجهيز والتكفين۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی زور آور انشاء پرداز تھے، وسیع معلومات اور قوی تفکیر کے حامل تھے، مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے بعض اچھی اور صحیح ہیں، لیکن بعض میں انھوں نے غلطیاں کیں اور صحیح راستے سے ہٹ گئے، ان کے چند شاذ خیالات کی وجہ سے اسلام میں ایک فتنہ پیدا ہو گیا، ستمبر ۱۹۷۹ء میں امریکا میں وفات پائی اور ان کی لاش پاکستان لائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے، کاش کہ تجہیز و تدفین میں اسلام کے طریقے کی پابندی کی گئی ہوتی۔)

۳- عبد الرزاق ملیح آبادی: منشی مجلات عديدة في كلكته، وصديق أبي الكلام آزاد، ومنشی ثقافة الهند في دهلي أخيراً، زار مصر وصحب الأستاذ رشيد رضا

المصري منشی المنار، وترجم کتاباً عديدة، منها: "العلم والعلماء" صادفته في دهلي وغيرها مرات، فلم يعجبني حبه للتجدد وانحرافه عن مسلك الصالحين من العلماء، كان يحلق لحيته وشاربه، توفي في ۲۳ / جون (يونيه) سنة ۱۹۵۹، ۲۵ / ذي الحجة سنة ۱۳۷۸ في بمباي، وكان مقيماً هناك يتداوى من مرض السرطان۔

(عبدالرزاق بیچ آبادی، کلکتہ میں مختلف مجلات کے بانی، ابوالکلام آزاد کے دوست، اور آخر میں دہلی میں ثقافت الہند کے بانی تھے۔ مصر کا سفر کیا اور المنار کے بانی استاذ رشید رضا مصر کی صحبت پائی، متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں سے ایک 'العلم والعلماء' ہے، دہلی وغیرہ میں بارہا ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، مگر انکی تجدد پسندی اور علماء صالحین کے مسلک سے انکا انحراف مجھے پسند نہیں آیا، وہ ڈاڑھی مونچھ منڈواتے تھے۔ ۲۳ / جون ۱۹۵۹ء ۱۵ / ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کو بمبئی میں وفات پائی، وہاں وہ کینسر کے علاج کے لئے مقیم تھے۔)

عربی نظم

ہندوستان کے علماء نے علوم و فنون اور تحقیق و تنقید میں ہی اپنی امتیازی حیثیت پیدا نہیں کی بلکہ شعر و سخن میں بھی طبع آزمائی کی، اور اس میں اس حد تک آگے آگئے کہ ان کا شمار کہنہ مشق اور صاحب طرز شاعروں میں ہونے لگا، یہی نہیں کہ مادری زبان اردو میں ہی شاعری کی بلکہ عربی و فارسی میں بھی ان کے کلام سے دفتر شعر و سخن بچے پڑے ہیں۔

عربی زبان کے اسرار و رموز سے آگاہ ان علماء کا ذوق سلیم اس قدر نکھرا ہوا تھا کہ عربی میں بلا تکلف اشعار کہتے، داخلی کیفیات و جذبات کو بآسانی قصیدہ، غزل اور مرثیہ وغیرہ مختلف اصناف و پیرایوں میں پیش کرتے۔

ان کی شاعری لہو و لعب اور فحشیات سے بے نیاز ہے، ان کی نغمہ سرائی میں جذبات و احساسات کی پاکیزگی اور جہا لیاقتی حس کا ایک خوبصورت امتزاج دکھتا ہے، علماء کی شاعری میں اخلاق کی بلندی اور حکمت و دانائی کی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

چونکہ ان علماء کے پیش نظر اسلامی علوم و فنون کی بقاء و ارتقاء تھی، اس لئے اس جانب بطور خاص توجہ نہ ہوئے اور اسے تختہ مشق نہ بنایا، یہ حضرات اگر اس جانب بطور خاص توجہ فرماتے تو یقیناً عربی زبان کے بلند پایہ شعراء میں ان کا شمار ہوتا!

ان علماء نے پھر بھی ہر صنف میں طبع آزمائی کی، قصیدہ، غزل، مرثیہ وغیرہ تمام میں، تفصیل میں نہ جاتے ہوئے مثال کے طور پر دیوبند کے علماء کو ہی لے لیجئے، ان علماء میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے داخلی کیفیات کو اشعار کے قالب میں ڈھالا، مثلاً شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ان دونوں بزرگوں نے اشعار کہے ہیں۔ حضرت

مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، عربی میں انہوں نے مرثیے اور قصیدے دونوں کہے، انکا قصیدہ 'دعاء المضطر' بہت مشہور ہے، علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے بھی قصیدے کہے ہیں، حضرت مولانا یوسف بنوری عربی کے برجستہ گو شاعر تھے، ان کا قصیدہ 'الاسراء والمعراج' کافی مشہور ہے۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر عربی میں مرثیہ کہا، مفتی کفایت اللہ صاحب نے حکیم اجمل خاں کا مرثیہ کہا، حضرت قاری محمد طیب صاحب نے 'قاسم العلوم والخیرات' کے عنوان سے قصیدہ لکھا، مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے اساتذہ و شیوخ کی وفات پر عربی میں مرثیے کہے، ان کے کئی مرثیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے بھی شاعری کے لئے موزوں طبیعت پائی تھی، یہ موزونی طبیعت ایسا نہیں کہ صرف ایک ہی زبان میں رہی ہو بلکہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں طور پر تھی، مولانا نے شاعری کب سے شروع کی، خواہ وہ عربی میں ہو، فارسی یا اردو میں، اس بابت کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا، البتہ ان کے کاغذات میں انہیں کی تحریر کردہ ایک فارسی عبارت ضرور ملتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ذوق شعرو سخن عنقوان شباب سے ہی تھا۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں:

”درفدیم ایام بہ اختر تخلص میگردم، در اں وقت سن حقیر ہفتدہ سال بود“
(دورگزشتہ میں میں اختر تخلص کیا کرتا تھا، اس وقت اس خاکسار کی عمر سترہ برس تھی۔)

مولانا اسیر ادروی مولانا اعظمی کے شاعرانہ رخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

”مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک رخ شعرو شاعری بھی ہے، جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، شعرو شاعری انسانی فضل و کمال کا ہی ایک حصہ ہے، اس سے ذوق سلیم اور موزونی طبع کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن مولانا اعظمی کے

عظیم الشان علمی کارناموں کے ساتھ شعر و شاعری کا تذکرہ کچھ غیر موزوں ہے۔
 سا معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے، لیکن..... مولانا
 کی..... زندگی کا اگر یہ رخ چھوڑ دیا جائے تو تصویر ناقص رہ جائے گی۔

غزلیں

بہر حال اس سے اتنی بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ شعر و شاعری کا مشغلہ
 طالب علمی کے زمانہ سے ہی تھا، کسی زبان میں شاعرانہ کلام پیش کرنا کوئی آسان کام
 نہیں، چہ جائیکہ مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں مشق سخن کی جائے!
 مولانا کے کلام کا جو حصہ ہاتھ لگ سکا اس میں متعدد عربی غزلیں ہیں، انہیں
 میں ایک عید (عید الاضحیٰ) کے موقع کی وہ تہنیتی نظم ہے جو مولانا نے اپنے دوست
 مولانا فیض الحسن کو دارالعلوم دیوبند سے دور طالب علمی میں بھیجی تھی، اس نظم کا عنوان
 'تہنئة العید' ہے، وہ نظم ملاحظہ ہو:

هنيئاً لكم عيد اظل عليكم	هنيئاً نجوم السعد اذ ذاك طلع
فجاء بافراح وبهجة انفس	يفرج عن حبي الهموم ويقطع
واني وان افاني العيد لم ازل	كئيباً شجي البال والعين تدمع
بهبج فؤادي منزل وتشوقني	ديار عهدت الحب فيها واربع
ويلتاع قلبي حين اذكر رفقة	احبة صدق لي، بهم انا مولع
فدعني على حالي وعش انت سالماً	وغيم هموم عن فؤادك مقشع
ودمت حبيبي في نعيم ونعمة	ولا زلت بالعيش الرغيد تمتع

۱۔ ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء، ص ۴۴-۴۵

۲۔ حیات ص ۶۱۹-۶۲۰

(میرے دوست! آپ کو عید مبارک ہو، جو آپ پر سایہ فگن ہے، مبارک ہو کہ سعادت کے ستارے اس وقت روشن ہیں، یہ عید خوشیاں لائی، دلوں کی فرحت لائی، یہ میرے دوست کے تمام رنج و غم کو دور کر رہی ہے، عید کا یہ دن مجھے بھی نصیب ہوا ہے، لیکن ہنوز رنجیدہ اور مضطرب ہوں، آنکھیں اشکبار ہیں، میرا دل وطن اور دیار میں الجھا ہوا ہے، جہاں کی محبت سے میں مانوس رہا ہوں، جب میں اپنے سچے اور مخلص دوستوں کو یاد کرتا ہوں، جن پر میں فدا ہوں، تو میرا دل محبت میں بے قرار ہو جاتا ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور تم سلامتی کے ساتھ زندہ رہو، رنج و غم کی بدلیاں تمہارے دل سے چھٹی رہیں، میرے دوست! خدا کرے تم ہمیشہ نعمت اور آسائش میں رہو، اور خوش عیشی سے بہرہ اندوز ہو۔)

اس نظم کے خاتمہ پر مولانا نے یہ لکھا تھا:

”کتبتہ الی صدیقی المولوی فیض الحسن وانا اذ ذاک

متعلم فی دار العلوم الدیوبندیہ و سنی تسع عشرۃ سنۃ“

(میں نے اپنے دوست فیض الحسن کو یہ نظم اس وقت لکھی جب میں دار

العلوم دیوبند میں طالب علم تھا، اس وقت میری عمر ۱۹ برس تھی۔)

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ محبت و الفت میں ترشی و تلخی بھی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ کبھی کبھی دو دلوں کی دوری کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ مولانا اعظمی کو بھی اپنے دوستوں سے کوئی تکلیف پہونچی ہو، یا کسی سے کوئی بے وفائی صادر ہوگئی ہو اور اس سے متاثر ہو کر چند اشعار موزوں ہو گئے ہوں، اس جدائی و بے وفائی کا اُن پر کیا اثر ہوا، یہ اشعار اس کیفیت کی غمازی کرتے ہیں:

الحب مدعاه إلى البغضاء والود مرجعه إلى الشحناء
فلقد رأيت أحبة لم يصرموا حبل الوداد ولا رموا بجفاء
لم يحدثوا في حبهم ذمّاً ولا هجوا به ولم يعرفوا بمراء
داموا على هذا فالقى بينهم ابليس ما ألقى من الشحناء
فتصدعوا كل التصدع مبدلين ودادهم من فرقة وتناء

(محبت) (کبھی) دشمنی کا سبب ہوتی ہے، دوستی کا انجام (کبھی) بغض ہوتا

ہے، میں نے ایسے احباب بھی دیکھے ہیں، جنہوں نے دوستی کی رسی کو کبھی نہیں توڑا، اور نہ ان پر جفا و ستم کا الزام ہے، ان کی محبت میں کبھی کوئی قابل مذمت بات نہیں ہوئی، اور نہ انہوں نے اس کا کبھی قصد کیا، اور نہ کبھی انہوں نے کوئی جھگڑا جانا، اسی حال پر تھے کہ اچانک ابلیس نے ان کے درمیان عداوت کا طوفان کھڑا کر دیا، پھر وہ اپنی دوستی کو جدائی اور دوری میں تبدیل کر کے پوری طرح انتشار کا شکار ہو گئے۔)

مولانا نے ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۸ھ کو کسی جشن کا پروگرام رکھا تھا، مگو میں بے تکلف دوستوں کا آپس میں کبھی کبھی کھانے کا پروگرام ہوتا ہے، اس میں مگو کی ایک خاص چیز جسے انگشتی کہا جاتا ہے، پکتی ہے، ایسا ہی کوئی جشن رہا ہوگا، اس کا منظوم دعوت نامہ تحریر فرمایا تھا:

سلام سلام کمسک الختام علیکم اجیبا بنایا کرام
ہلموا إلى الناد واستمتعوا بأحلى كلام وأشهى طعام
ہلموا نرحب بکم سادتی ونشکرکم، دمنم، بالسلام
(دوستو! تم کو مشک و عنبر جیسا سلام، جشن میں تشریف لاؤ اور شیریں گفتگو

اور لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہو، تشریف لاؤ، ہم استقبال کریں گے،
اور تمہارے شکر گزار ہوں گے، تم ہمیشہ سلامت رہو۔)

کسی صاحب نے ایسے ہی کسی جشن میں مدعو کیا، تو انہیں جواب لکھا:

ایسا شائق! اسمع سمعناک أجنناک إذ جئتنا داعیا
ألا إنها دعوة لا ترد ولا سيما اليوم يوم الشتاء
فنشکر مسعاک یا شائق ونأتي قبیل صلوة العشاء

۳۰ / رجب ۱۳۲۸ھ

(حضرت شائق! ہم نے آپ کا ارشاد سنا، جب آپ نے دعوت دی ہے،
تو ہماری طرف سے قبول ہے، یہ تو ایسی دعوت ہے، جسے رو نہیں کیا جاسکتا،
بالخصوص جبکہ آج سردی بھی خوب ہے، ہم آپ کی تکلیف فرمائی کے
شکر گزار ہیں، انشاء اللہ عشاء سے ذرا پہلے حاضر ہوں گے۔)

اسی طرح ایک غزل چھ اشعار پر مشتمل ایک پرانے بوسیدہ کاغذ پر لکھی ہوئی
ملی، غالباً یہ بھی زمانہ طالب علمی کی ہی ہے، وہ چھ اشعار یہ ہیں:

ألا یا لوعة الحب المبرح أقصري كأنک قد أوقدت ناراً بمجمر
حریق بنار الہجر قلبی وأضلعي فیما عین رشیہا بمائک وافر
غداة غدت لیلی تأهب ظعنہا وشدت لها العیسا لأمر مقدر
رمتني بعینہا فخلت كأنما رمتني بسهم فوق قوس موتر
بقلبی جروح من أسنة جفنها فہا ہی أنکی من أسنة سمہر

۱۔ شائق سے مراد منو کے مشہور اہلحدیث عالم مولانا عبداللہ شائق ہیں، جو مدرسہ فیض عام کے
صدر مدرس تھے۔ اس مدرسہ سے الگ ہو کر انہوں نے دارالحدیث کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد
رکھی جس کا نام بعد میں جامعہ اثریہ دارالحدیث ہو گیا۔

غدت بفؤادي ثم صبري بفجأة فما قول وعاظ يقولون لي اصبر!

(اے دیر پا محبت کی سوزش! تو رک جا، گویا کہ تو نے انگیٹھی میں آگ جلا رکھی ہے، ہجر کی آگ میں میرا دل اور پہلو جل رہا ہے، اے آنکھ! تو ان پر اپنے پانی کا چھینٹا ڈال کر اسے ٹھنڈا کر دے، جس صبح کو لیلیٰ اپنے کجاوے کو تیار کر کے چلی اور جدائی کے لئے جو مقدر ہو چکی ہے، اس نے اپنی سواری کسی، اور میرے اوپر نگاہ ڈالی تو ایسا لگا کہ کمان سے مجھ پر تیر چلایا ہو، میرے دل میں اسکی آنکھوں کے نیروں کے زخم ہیں، جو سمہر کے بنے ہوئے نیروں سے زیادہ کاری ہیں، میرا دل چھیننا پھر اچانک میرا صبر و قرار چھیننا، ایسے میں واعظوں کی صبر کی تلقین کیا فائدہ دے گی۔)

مولانا اعظمی نے ایک عربی نظم دارالعلوم یا مفتاح العلوم مئو کے کسی جلسے کے موقع پر کہی، اس جلسہ میں معروف علمی شخصیتیں: مولانا مرتضیٰ حسن، مولانا عبدالشکور فاروقی، مولانا عبدالشکور مرزا پوری، سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہ، مدعو تھیں۔ اس نظم میں سولہ اشعار ہیں، مولانا نے ابتدائی اشعار میں حمد بیان کی ہے، اور اس کے بعد مذکورہ بالا شخصیات کا نظم کے پیرایہ میں تعارف پیش کیا ہے۔ وہ نظم یہ ہے:

لک الحمد اللهم رب البرية	فإنک اهل الحمد من غیر شرکة
فأنت الذي يقضي لنا كل حاجة	وأنت الذي ندعوه عند المصيبة
تتابع النعماء حتى تجاوزت	عن الحصر والاحصاء وامت وطمت
فأعجزت الآلاء يا رب أن نفی	بشکر لما قد دق منها وأعیت
فكيف بما قد جل منها وإنما	جلالها مما عن الوصف جلت

وصل علی قطب الوجود محمد
 ارانا الہدی بعد الضلالة والعمی
 واصحابہ الغر الکرام وآلہ
 وبعد فہذی حفلة سنویہ
 فمنہم رئیس *** مرتضیٰ حسن
 وعید الشکور القرم قامع فتنة الـــــ
 یذب عن القرآن ثم یذب عن
 و آخر یدعی باسمہ من بلیدة
 سلیمان ملک العلم سید اہلہ
 وأستاذنا شبیر أحمد حائز الـــــ معالی وأنواع المزايا السنية
 وأحمد سعید الدهلوی المقلد الـــــ ظامة للجمعية المركزية

(اے پروردگار! تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے، بیشک تو تنہا تعریف کا
 مستحق ہے، تو ہی ہے جو ہماری ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے، تجھ ہی سے ہم
 ہر مصیبت کے وقت فریاد کرتے ہیں، تیری نعمتیں پیہم ہیں، تا آنکہ وہ بے
 اندازہ بے شمار اور بے حد و حساب ہو گئیں، خداوند! تیری نعمتوں نے اس
 سے عاجز و درماندہ کر دیا کہ ہم چھوٹی سی نعمت کا بھی شکریہ ادا کر سکیں، تو ہم
 کیسے بڑی بڑی نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں، وہ نعمتیں تو بیان سے بالاتر
 ہیں، خداوند! رحمت نازل فرما مکہ میں پیدا ہونے والے مرکز کائنات
 ابو القاسم محمد ﷺ پر، جنہوں نے ہمیں ضلالت و گمراہی کے بعد ہدایت کا
 راستہ دکھایا اور تاریکی سے باہر نکالا، اور اس کے روشن جنہیں کریم ساتھیوں

اور اہل بیت پر جو بلند ہمت اور شریف طبیعت والے تھے، یہ ایک سالانہ جلسہ ہے جس کے لئے ہم نے ہر سمت سے بڑے بڑے لوگوں کو بلا رکھا ہے، ان میں سردار مولانا مرتضیٰ حسن ہیں جو آگے بڑھنے والے بہادر شیر ہیں، اور شیعوں اور رضا خانی بدعتیوں کے فتنوں کا استیصال کرنے والے مولانا عبدالشکور ہیں، وہ قرآن اور صحابہ کرام کا جو خدا کی بہترین مخلوق اور لوگوں کے رہنما ہیں، دفاع کرتے ہیں، ایک اور انھیں کے ہم نام جو کثمت کے قریب مرزا پور سے آئے ہیں، سید سلیمان ندوی ہیں جو دنیائے علم کے تاجدار اور اہل علم کے سر تاج ہیں، علامہ شبلی کے جانشین اور سیرت کے مصنف ہیں، اور ہمارے استاذ مولانا شبیر احمد عثمانی ہیں جو بلند یوں کے مالک اور بہت سی بلند خوبیوں کے حامل ہیں، اور مولانا احمد سعید دہلوی ہیں جو مرکزی جمعیت علماء کی نظامت کے عہدہ دار ہیں۔

۱۹۷۹ء میں مشہور محقق و محدث شیخ ابو غدہ کی منو تشریف آوری ہوئی تھی، اس

مبارک موقع پر یہ تہنیتی قطعہ کہا:

أهلاً بمقدمك الهني و مرحباً يا عالم الشهباء إمام الشام
لم يحو علم الفقه و الآثار شامی كجمعك بعد ذاك الشاہ
(اے عالم شہبائے حلب) اے امام شام! تیرا آنا مبارک ہو کہ علامہ شامی
کے بعد تیری طرح کسی شامی نے حدیث و فقہ کے علم کو جمع نہیں کیا۔

مراثی

مرثیہ ادب کی ایک اہم صنفِ سخن ہے، عرب کی شاعری میں قصیدہ اور مرثیہ کو خاص اہمیت و حیثیت حاصل تھی، ان سے عربوں کے حالات و واقعات اور انکی تاریخ کے اہم ترین پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ قصیدہ میں مدح و توصیف ہوتی ہے، اور مرثیہ میں مرنے والے کی اچھائیوں کو بیان کر کے درد و غم کا اظہار کیا جاتا ہے۔

غم کا خاصہ ہے کہ وہ احساسات میں شدت اور جذبات میں نزاکت پیدا کر دیتا ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں رقت کے ساتھ ساتھ جوش و روانی بھی پیدا ہو جاتی ہے، نتیجہ آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ دل سے اشعار بھی امنڈنے لگتے ہیں: یہی وجہ ہے کہ شعراء اس موضوع پر ہر زمانے میں اظہار خیال فرماتے رہے ہیں۔

چنانچہ مولانا اعظمی کے قلب پر بھی اساتذہ، اکابر، اصحاب علم کی وفات اور اپنوں کی جدائی کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اور آنسوؤں کے ساتھ دل سے اشعار بھی پھوٹے لگے، مولانا نے نہایت پرسوز مرثیے کہے ہیں، انہوں نے قطعات بھی کہے ہیں اور مادہ تاریخ بھی نکالے، اس فن میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔

مولانا اعظمی نے شاعری میں زیادہ تر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، کہیں کوئی غم پہونچا، دل کو کبھی کوئی ٹھیس لگی تو گویا خود بخود اشعار کی آمد ہونے لگی۔ اسیرِ ادروی نے مولانا کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ ایسا ہی لکھا ہے:

”مولانا اعظمی کی شاعری اسی طرح کی ہے، جس طرح ایک انسان کے دل و دماغ پر کوئی حادثہ گزرتا ہے اور اس سے متاثر ہوتا ہے، کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے کوئی غم لاحق ہوتا ہے تو دوسروں سے بیان کر کے اپنے غم کو

ہلکا کر لیتا ہے، مولانا کی شاعری بھی اسی قبیل سے ہے، مولانا نے اپنے
تاثرات دوسروں سے بیان کر نیکے بجائے انکو شعر کا قالب دے دیا اور
اپنے تاثرات کی شدت کو ہلکا کر لیا۔^۱

مولانا عبدالغفار صاحب عراقی کا مرثیہ | مولانا اعظمی کے مرثیہ خاص اور
محبوب استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مکی کی ۱۳۴۱ھ میں وفات
ہوئی، مولانا کو اس سے سخت صدمہ پہونچا، اس حادثہ سے متاثر ہو کر انہوں نے عربی
میں مرثیہ کہا:

علیک سلام اللہ یا ثاوی القبر ورحمته أعطیت من أوفر الأجر
لقد كنت أيم الله سلوى لنا عن الغـ طارفة الماضين في سالف العصر
لكنك وكانت حين غبت تغيب فنحن إذا يا شيخنا فاقدوا الصبر
رزايا عظام فاجعات كثيرة مصاب أبي الأنوار علامة الدهر
محطّر حال المستفيدين ملجأ الأمم ——— نائل مأوى كل أشعث مغبر
فقيه ديار الشرق مسند وقته و مرجع أعلام الهدى رحلة العصر
إليه جزاه الله خيراً قد انتهت رئاسة أصحاب الإمام بذا القطر
أديب أريب ينثر الدر نطقه وفي الشعر يأتي بالحلال من السحر
وفيه خلال لو ذهبت أعدها وجدت نطاق القول ضاق عن الحصر
قد ابتلى أسقاماً فما زال حامداً لمولاه فيها واستقام إلى القبر
ثوى في خيام الحمد أرخت ملهماً اذ ارميت علم الفتى والألم بالصدر^۲
(اے قبر کے اقامت گزریں! آپ پر اللہ کی جانب سے سلامتی ہو، حق

تعالیٰ آپ کو اجر کثیر سے نوازے، بخدا آپ ہمارے لئے عہد گزشتہ کے اکابر کے بعد سامان تسلی تھے، آپ تھے تو وہ بھی تھے، آپ گئے تو وہ بھی گئے، اس وقت ہم صبر و قرار کھو چکے ہیں، علامہ ابوالانوار کا سانحہ وفات تھا ایک مصیبت نہیں ہے بلکہ بڑی سنگین مصیبتیں (اس کے جلو میں) ہیں، استفادہ کرنے والوں کی منزل، علمائے افاضل کی پناہ گاہ اور دروازے کے سفر سے آئے ہوئے غبار آلود اور پراگندہ طلبہ کے ماویٰ و طباء تھے، دیار مشرق کے فقیہ، مسند وقت اور ان علماء و اسلاف کے مرجع تھے جو ہدایت کے مینار اور سیاح زمانہ تھے، اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے، اس علاقہ میں علمائے احناف کی ریاست انہیں حاصل تھی، وہ ایک باکمال ادیب تھے، جن کا تکلم گہر ریز تھا، اور ان کے اشعار تو سحر حلال تھے، ان میں وہ فضائل حمیدہ تھے کہ اگر میں انہیں شمار کرنا چاہوں تو تکلم کا دائرہ ان کے احصاء سے تنگ پڑ جائے، وہ بیماریوں میں مبتلا رہے اور اپنے مولیٰ کی حمد و ثناء میں رطب اللسان رہے، میں نے جب چاہا کہ ان کی تاریخ وفات نکالوں تو میرے دل میں یہ بات آئی: "ثوی فی خیام الحمد" یعنی ہمیشہ کی نعمتوں میں مقیم ہوئے۔

علامہ انور شاہ کشمیری کا مرثیہ | حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری کی وفات پر مولانا اعظمی نے یہ اشعار کہے:

سقى جدثاً في ديوبند يضم في	جوانبه شيخ الحديث الهواطل
مفيد واستاذي وشيخي وسيدي	ومفتي الوري الحبر المطاع الحلال
وكان تقياً طاهر النفس حائزاً	فضائل شتى قد تلتها فضائل
وما في الوري من ينكر قدره	ولا فضله إلا ظلوم و جاهل

اناف علی ستین و هو ملازم
یراجع اهل العلم من کل بلدة
علی کل فرد من ذوی العلم منہ
من الصين من أرض الحجاز و کابل
وفي کل عام عن بخاری و روسيا
مضی و مضی الشیخ لیس بهین
و اکبادهم مرضوضه و قلوبهم
ولکن إلا ما لیس بد من الفنا
فصبراً بهاء الحق صبراً فبانه
وان سأل الأصحاب عن عام موته
لدرس و افتاء إذا جاء سائل
إليه إذا أعیت علیهم مسائل
له و ایاد فی الرقاب سوائل
ومن مسقط زمت الیه الرواحل
و أمثالها تأتي إلیه القوافل
لدى الناس بل خطب فطیع و هائل
بذلک کلمی و الدموع سوائل
وان الذی قد حل لا بد راحل
مضی من مضی ما فی جزو عک طائل
فقل لهم تاریخه مات فاضل
۱ ۳ ۵ ۲

(بارش رحمت، دیوبند کی اس قبر کو سیراب رکھے، جس نے اپنی آغوش میں
حضرت شیخ الحدیث کو لے رکھا ہے، وہ میرے استاذ، میرے شیخ، میرے
آقا، مجھے فوائد عطا فرمانے والے، مفتی، زبردست عالم، مقتدا اور سردار
تھے، وہ متقی تھے، پاکیزہ نفس تھے، بے شمار فضائل و کمالات کے مالک
تھے، مخلوق میں کوئی نہیں جو ان کے مرتبہ کا انکار کرے، بجز ظالم و جاہل
کے، ساٹھ سال سے زیادہ عمر پائی، اور وہ برابر درس و افتاء میں مشغول
رہے، اہل علم جب کسی مسئلہ میں عاجز ہوتے، تو ہر طرف سے ان کی
خدمت میں حاضر ہوتے، تمام علماء کی گردنوں پر ان کے مسلسل احسانات
ہیں، چین سے، ملک حجاز سے، کابل سے، اور مسقط سے، ان کے پاس

طلبہ آتے تھے، اسی طرح بخاری اور روس وغیرہ سے بھی ہر سال قافلے آیا کرتے تھے، شیخ چلے گئے، لیکن شیخ کا جانا معمولی حادثہ نہیں ہے، بلکہ لوگوں کے نزدیک بڑا ہولناک اور تکلیف دہ حادثہ ہے، لوگوں کے جگر شق ہو گئے، دل زخمی ہو گئے، اور آنکھوں سے سیل اشک رواں ہے، لیکن چونکہ موت سے کسی کو کوئی چارہ نہیں ہے، جو بھی یہاں آیا ہے لامحالہ اسے جانا ہے، اس لئے صبر، اے مولانا بہاء الحق صبر! جانے والا جا چکا ہے، اب جزع و فزع سے کوئی فائدہ نہیں، اگر میرے دوست انکا سن وفات پوچھیں تو بتا دیجئے کہ انکی تاریخ مات فاضل ہے۔)

علامہ شبیر احمد عثمانی کا مرثیہ | علامہ شبیر احمد عثمانی سے مولانا اعظمی کو خاص تعلق تھا، علامہ آپ کے استاد تھے، علم و تحقیق میں باہم ایک دوسرے کے رابطہ میں رہتے تھے، جیسا کہ خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب علامہ عثمانی کی وفات ہوئی تو ان کے شاگرد مولانا اعظمی نے اس موقع پر ۳ اشعار کا ایک مرثیہ عربی زبان میں قلم بند فرمایا، یہ مرثیہ بہت مقبول ہوا، اس کا عنوان ”البشر یا شبیر بلطف ربک“ تھا۔ مولانا اعظمی کا یہ مرثیہ پہلی مرتبہ برہان ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، پھر برہان سے مستعار لے کر حیات ابوالماثر میں اسے شائع کیا گیا۔ یہ مرثیہ بہت طویل ہے، اس لئے بطور مثال یہاں اس کے چند اشعار پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

ارانی و قلبی دائماً شوجع	ولست أرى دمعی عن العین یقلع
یفجعنی دھری فلا یکتفی بوا	حد بل بحبر بعد آخر یفجع
خلیل، و محمود، عزیز، و أنور	و أشرف كانوا بیننا ثم أفسعوا
و من بعدهم مولای شبیر احمد	الإمام الہمام القرم أمسی یودع
منار الہدی، طود العلی، قدوة الوری	به یوتسی شیخ له القوم خضع

افاد طلاب العلم درساً و خطبة و خطاً و تصنیفاً له الفضل أجمع

(میں خود کو اور اپنے دل کو رنجیدہ پاتا ہوں، اور آنکھوں سے اپنے آنسوؤں کو رکے نہیں دیکھتا ہوں، مولانا خلیل احمد، مولانا محمود حسن، مولانا عزیز الرحمن، مولانا انور اور مولانا اشرف علی تھانوی ہمارے درمیان تھے، پھر ہم سے جدا ہو گئے، اور ان بزرگوں کے گزرنے کے بعد ہمارے سردار امام ہمام مولانا شبیر احمد نے الوداع کہا، وہ رشد و ہدایت کا مینار، شرافت کا پہاڑ اور خلق خدا کے لئے نمونۂ عمل تھے، ان کے سامنے گردنیں جھکی رہتی تھیں، طالب علموں کو درس و تقریر اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ فائدہ پہنچایا، ان کی ذات فضائل و کمالات کا مجموعہ تھی۔)

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی علامہ شبیر احمد عثمانی پر مولانا اعظمی کے اس مرثیہ کو دیکھ کر اظہار خیال فرماتے ہیں:

”تدل هذه المراثية على أن للشيخ قدرة كاملة على قرص الشعر باللغة العربية، غير أنه قلما اعتنى بذلك، فلا توجد له قصيدة أو مراثية غير هذه التي تحتوي على ۳۷ بيتاً،“^۱
(یہ مرثیہ اسکی دلیل ہے کہ شیخ (مولانا اعظمی) کو عربی زبان میں شعر گوئی پر کامل قدرت حاصل تھی، البتہ اس جانب انہوں نے توجہ کم دی، اس مرثیہ کے علاوہ جو ۳۷ اشعار پر مشتمل ہے، انکا کوئی اور قصیدہ یا مرثیہ نہیں ہے۔)

۱۔ حیات ص ۶۲۸-۶۲۹

۲۔ ثقافت الہند ج: ۳۷ ش: ۱-۲ ص ۶۴

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی کا یہ کہنا کہ مندرجہ بالا مرثیہ کے علاوہ مولانا اعظمی کا کوئی دوسرا مرثیہ یا قصیدہ نہیں ملتا، انکے علم و اطلاع کی بناء پر ہے، ورنہ تو مولانا کے کہے ہوئے عربی قصائد و مرانی کی تعداد اچھی خاصی ہے، جیسا کہ گزشتہ اور آئندہ صفحات سے عیاں ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا مرثیہ | مولانا اعظمی کے زمانہ طالب علمی
میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا وصال ہوا، مولانا نے حضرت شیخ الہند
کی وفات پر بھی عربی میں مرثیہ کہا اور تاریخ نکالی، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

أنباء ما السمع ينبو عنه فائضة	أعني به نعي شيخ الهند محمود
فالناس مضطرموا الاحشاء واعينهم	تسيل دمعاً وهل من غير مكمود
تكداد تنصدع الأكباد من حزن	والقلب يشبهه لحم بمسفود
و طار لبي إذ وافاني الخبر	فصرت لست أميز البيض من سود
وانطوي أو كاني قابض جمرأ	أقول للعين غيضي الدمع أو جودي
فقدت فرداً وحيداً في مناقبه	والله ما مثله فينا بمعهود
و كنت أفكر في تاريخه فإذا	بجنة الخلد محمود ثوى.....

۱ ۳ ۳ ۹

آخری شعر میں کاغذ کا اتنا حصہ پھٹا ہوا ہے، جس میں نقطے لگا دیے گئے
ہیں۔ ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ:

(آج کچھ ایسی خبریں آئی ہیں، جن سے سماعت کو سخت دھکا لگا، معلوم
ہوا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا وصال ہو گیا ہے، اس خبر سے
لوگوں کے جگر میں آگ سی لگ گئی اور آنکھ سے آنسو برس پڑے، ایسا
معلوم ہوا کہ رنج و غم کی وجہ سے جگر پھٹ جائیں گے، اور دل کی تو وہ
مثال ہے، جیسے تیغ پر کیا ب ہو، جب اندوہناک خبر مجھے ملی، تو میرے
ہوش اڑ گئے، اور میں نے سیاہ و سفید کی تمیز کھودی، میں تڑپ رہا ہوں،
یا ایسا ہو گیا ہوں جیسے منشی میں انگارہ لے لیا ہو، میں آنکھ سے کہتا ہوں

کہ آنسو پی جاؤ یا بہاؤ (کچھ مضائقہ نہیں)، کیونکہ ایسا شخص میں نے
 کھودیا ہے، جو اپنے فضائل و مناقب میں یگانہ تھا، بخدا! ہمیں معلوم
 نہیں کہ اس جیسا کوئی شخص ہم میں ہے، میں ان کی تاریخ وفات میں
 غور کر رہا تھا کہ یہ سامنے آئی ”بجنتہ الخلد محمود ثوی“ محمود
 نے جنت میں اقامت اختیار کی۔

مولانا سید حسین احمد مدنی کا مرثیہ | مولانا اعظمی کے کاغذات میں ایک عربی
 مرثیہ ملتا ہے، جس میں کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ کس کی شان میں کہا گیا ہے، لیکن
 ڈاکٹر مسعود احمد نے اس مرثیہ کے مضمون سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ شیخ الاسلام مولانا
 حسین احمد مدنی کا مرثیہ ہے، اور اسکو ”مولانا سید حسین احمد مدنی کا مرثیہ“ عنوان لگا کر
 پیش کیا ہے، چنانچہ ہم بھی اسی پر اعتماد کرتے ہوئے اس مرثیہ کو یہاں نقل کرتے ہیں:

رء عظیم دھا الإسلام و اکربا شیخ الحدیث و قطب العصر قد ذہبا
 و لست أحسب إلا أن ناعیه نعی المکارم و الأخلاق و الأدبا
 قد کان مجتمعاً فیہ الفضائل من علم و حلم و عرفان و لا عجباً
 فإِنَّه قد تربی عند سیدنا رشید أحمد یسعی عنده دأبا
 و عند مرشد أهل العصر قاطبة کانوا هم العجم أو کانوا هم العربا
 شیخ المشائخ إمداد الإله و قد قضی سنین طوالاً حینما صحبا

(ایک بڑی مصیبت نے اسلام کو صدمہ پہنچایا اور بے چین کر دیا، کہ شیخ

الحدیث اور قطب وقت اس دنیا سے چلا گیا، میں یہی سمجھتا ہوں کہ ان کی

موت کی خبر دینے والے نے شرافت، اخلاق و ادب کی موت کی خبر

سنائی، علم و معرفت اور بردباری جیسی بہت سی خوبیاں ان میں ایک ساتھ

جمع تھیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں تربیت پائی، عرب و عجم کے مرشد شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ مہاجر کی خدمت میں کئی برس رہے۔)

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کا مرثیہ | مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کا ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں وصال ہوا، مولانا عظیمی کو ان کی وفات سے شدید جھٹکا لگا اور مرثیہ کے یہ چند اشعار موزوں ہو گئے:

کان الفقید اخونا حفظ الرحمن	شہماً نبیلاً عظیم القدر والشان
عاش الفقید نقی العرض عن دنس	فمالہ عائب فینا ولا شانی
ولیس یوم رزننا فیہ صاحبنا	بیوم حزن ولكن یوم احزان
فمن لمجلس شوری دیوبند ومن	لمسلمی الہند من قاص ومن دان
یحسب حقوقہم بالانتصار لہم	فی البرلمان بتصریح و اعلان

(ہمارا گم شدہ بھائی حفظ الرحمن بہادر، شریف، بلند مرتبہ اور عظیم الشان شخص تھا، مرحوم پاکدامن، با آبرو تھے، انکا کوئی عیب جو اور دشمن نہ تھا، ہمارے ساتھی کی وفات کا دن کسی ایک غم کا دن نہیں بلکہ یوم احزان (بہت سے غموں کا دن) ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اور دیوبند کی مجلس شوری کے لئے دور نزدیک کہاں سے ایسا شخص آ سکتا ہے؟ جو پارلیمنٹ میں علی الاعلان مسلمانوں کی حمایت کر کے ان کے حقوق کی حفاظت کر سکے۔)

کاغذ کے جس ٹکڑے پر مندرجہ بالا اشعار لکھے ہوئے تھے، اسی کی دوسری جانب دو شعر کا ایک قطعہ بھی لکھا ہوا تھا جس کے بارے میں ڈاکٹر مسعود احمد کا خیال ہے کہ غالباً یہ قطعہ بھی مولانا عظیمی نے اسی موقع پر کہا تھا۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

لو انهم رت عيني دما، وتقطعت
 لكان حقيقاً، ان رزءاً أصابني
 أسي كبدي، والقلب مني تفتطرا
 بدھلي غذاة الامس اعظم ما جئري
 (اگر میری آنکھ خون کے آنسو بہاتی، جگر غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اور
 دل پھٹ جاتا، تو یہ سب لائق سزا تھے! اس لئے کہ دہلی کے حادثہ کا وہ
 صدمہ جو کل مجھے پہونچا سب سے بڑا صدمہ تھا۔)

مولانا عبدالقادر رائے پوری کی وفات کا قطعہ تاریخ | مولانا رائے پوری
 کا وصال ۱۹۶۲ء میں ہوا، انکے انتقال پر مولانا اعظمی نے مادہ تاریخ نکالا:

قضى الشيخ عبدالقادر اليوم نحبه
 و كان أجل العارفين و أكرمها
 بكيت و ما يغنى البكاء فليل لي
 ومن دارزئتم، قلت شيخاً معظماً
 ۱۹۶۲ء

(شیخ عبدالقادر کی وفات ہو گئی، آپ عارفین میں بزرگ تر اور برتر تھے،
 مجھے رونا آیا لیکن میرا یہ رونا بے سود ہے، لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کس
 کی وفات کا صدمہ ہے؟ میں نے کہا، ایک عظیم شخصیت کی وفات کا۔)
 مولانا عبداللطیف نعمانی کا قطعہ تاریخ | آپ کی وفات ۱۳۹۲ھ میں ہوئی
 تھی، مولانا اعظمی نے مادہ تاریخ نکالا:

صاحبی عبد اللطیف الألمعی
 قال تلمیذ له أرخ لنا
 نال في الفردوس أعلى منزله
 موتہ، قلت: اكتب المغفور له
 ۱۳۹۲ھ

(میرے ذہن دوست عبداللطیف جتہ الفردوس میں اعلیٰ مقام پائیں،
انکے ایک شاگرد نے مجھ سے تاریخ وفات نکالنے کو کہا، تو میں نے کہا
المغفور لہ سے ان کی تاریخ وفات نکالو۔)

ان شعری تخلیقات سے جہاں مولانا کے شعری اکتسابات کا اندازہ لگایا
جاسکتا ہے، وہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظر اپنے دور کی سیاسی شخصیات کے
سلسلہ میں بھی دور رس تھی، انہوں نے اس دور میں یہ تصور دیا کہ سیاست کا اگر علم سے
رشتہ ہو تو وہ شجر ممنوعہ نہیں ہے، اور سیاسی شخصیتیں بھی اپنے علم و فضل کی وجہ سے محبوب
ہو سکتی ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کے
لئے عربی کو وسیلہ اظہار بنایا اور اس طرح یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عربی ان کی اختیاری یا
اکتسابی زبان نہ تھی بلکہ مادری زبان تھی۔

اردو نثر

گزشتہ صفحات میں مولانا اعظمی کی عربی نثر و نظم کے ادیبانہ طرز اور شاعرانہ کلام کے چند نمونے پیش کئے گئے، جس سے عربی زبان و ادب میں مولانا کی مہارت کا اندازہ ہوا، اب ہم مولانا اعظمی کے اردو ادب کا جائزہ لیں گے، یعنی مولانا کی اردو نثر کا کیا معیار تھا اور ان کی اردو شاعری کس انداز کی تھی، ہم اس فصل میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سترہ برس کی عمر سے ہی مولانا کے ذوق شعر و سخن کو جلا ملنے لگی تھی، اور اس قدر طبعی مناسبت ہو گئی کہ اسی دور میں اشعار کہنے لگے تھے، اردو ادب سے اس فطری لگاؤ اور مشق سخن کا یہ اثر ہوا کہ ان کی نثر بھی اسی معیار کی ہوتی تھی، مولانا کی اردو زبان سہل و سلیس ہوتی، الفاظ مختصر مگر معانی و مفہام کو محیط ہوتے، تفہیم کا انداز بہت صاف ہوتا، پیچیدہ اور دقیق سے دقیق موضوع پر بھی اگر قلم اٹھاتے تو ایسا لکھتے کہ قاری کے سامنے بات بالکل آئینہ ہو جاتی، مولانا کی تحریر میں ایجاز کو خاص دخل ہے، اردو کے مشہور ادیب و انشاء پرداز عامر عثمانی مولانا اعظمی کے اردو اسلوب نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق و نازک نکات فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی

کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے۔“

مولانا اعظمی کے رشحات قلم میں اردو زبان میں ایک سواٹھارہ مضامین و مقالات ہیں، ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں، اور بعض غیر مطبوعہ۔ اور تقریباً چالیس کی

تعداد میں مولانا نے اردو میں کتابیں اور رسائل لکھے، اردو تصنیفات میں اعیان الحباج، دستکار اہل شرف، الاعلام المرفوعہ، نصرۃ الحدیث، دارالاسلام ودارالحرب اور تعدیل رجال بخاری وغیرہ مولانا کی اعلیٰ نثر کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا نے ۱۳۳۹ھ میں تذکرہ کے نام سے ایک علمی رسالہ بھی جاری کیا تھا، مولانا خود اسکے مدیر تھے، لیکن اسکا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔ اس مجلہ کا قلمی نسخہ مکتبہ حبیب الرحمن الاعظمی منو میں محفوظ ہے۔

مولانا کی اردو عبارت پوری طرح چست و درست رہتی ہے، جس موضوع پر لکھتے ہیں اس پر اس قدر مضبوط گرفت رہتی ہے کہ اس سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹتے ہیں، چونکہ عبارت میں متانت و صلابت کا رنگ غالب ہے؛ اس لئے آپ کی تحریر پر شکوہ معلوم ہوتی ہے۔ اور چونکہ مولانا محقق، نقاد اور مناظر ہیں؛ اس لئے اردو میں تنقیدی و تردیدی مضامین زیادہ ہیں اور ظاہر ہے کہ جوابی مضامین میں کچھ نہ کچھ تنقیدی اثر رونما ہو ہی جاتے ہیں، چنانچہ ان کے یہاں بھی یہ اثر دکھتا ہے، مولانا اعظمی نے خود بھی ایک دو جگہ عبارت یا تحریر میں تلخ نوائی کا اعتراف کیا ہے، لیکن یہ تلخی خال ہی خال نظر آتی ہے۔

جناب ماہر القادری اردو زبان و ادب کے مشہور محقق و بے باک نقاد ہیں، 'قاران' کراچی میں کتابوں پر ماہر القادری کے فاضلانہ تبصرے انکے علم، دقت نظر اور سخن فہمی کے غماز ہیں۔ زبان پر ان کی مضبوط گرفت اور سخن فہمی کی ہی یہ دین تھی کہ جوش ملیح آبادی جیسے مشاق شاعر و ادیب نے جب خود نوشت سوانح 'یادوں کی برات' ماہر القادری کے پاس تبصرے کے لئے ارسال کی تو اپنی کتاب پر یہ لکھا:

”حضرت ماہر لیجئے، بکرا حاضر ہے، شوق سے ذذبح (کذا) فرمائیے، سر

دوستاں سلامت۔“

راقم سطور کی نظر سے مولانا اعظمی کی دو کتابیں گزریں، جن پر مولانا ماہر القادری نے تبصرے لکھے: 'نصرة الحديث' اور 'رکعات تراویح مذیل'۔ دونوں کتابوں میں ماہر القادری نے کہیں بھی مولانا اعظمی کی زبان، اسلوب اور طرز نگارش پر تنقید نہیں کی ہے، بلکہ اپنا تاثر رکعات تراویح کے بارے میں یہ دیا کہ:

”جہاں تک کتاب کے عمومی تاثر کا تعلق ہے اس میں متانت، تہذیب اور شائستگی پائی جاتی ہے۔“

ماہر القادری جیسے سخت نقاد کے تیشہ نقد سے مولانا اعظمی کی اردو نثر کا محفوظ رہ جانا ان کی اردو نثر کی صحت کی روشن دلیل ہے۔

مولانا نور عالم خلیل امینی تعدیل رجال بخاری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اعظمی کی اردو نثر کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہیں:

”..... يدل على قدرته الفذة بالكتابة باللغة الأردية

المسهلة العذبة المحكمة النسيج، وهي مزينة قلما بمائله

العلماء الهنود من فارعي الأقدام في العلم والفضل.“ ۲

(..... یہ کتاب شگفتہ، سلیم، پر شوکت، اور مربوط اردو نثر نگاری و انشاء

پردازی پر مولانا اعظمی کی قدرت کا پتہ دیتی ہے، مولانا کی یہ ایک ایسی

خصوصیت ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اہل علم و فضل حضرات میں

کم ہی ایسے ہوں گے جو ان کے ہم پلہ ہوں۔)

بہر حال مولانا ایک بہترین نثر نگار تھے، جیسا کہ اس کی دو شہادتیں بھی پیش

کی جا چکی ہیں۔ اگر یہ شہادتیں نہ بھی ہوتیں تو بھی مولانا اعظمی کی اردو تحریروں،

مضامین اور مقالات سے اردو نثر کی خوبیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردو نظم

مولانا اعظمی کی فائلوں، کاغذات اور نوٹس میں بکھرے ہوئے منتشر اشعار دیکھے گئے تو زیادہ تر غزلیں، نظمیں ۱۳۳ھ سے ۱۹۱۹ء سے ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء تک کی ملیں، ان میں بھی بیشتر ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کی ہیں، یہ اطلاع اس سرمایہ سخن کے بارے میں ہے جو ناقلین، محققین اور تلاش کرنے والوں کے ہاتھ لگ سکا اور جسے وہ محفوظ کر سکے۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے قدیم ترین کرم خوردہ کاغذات بھی ملے جن پر مولانا کی نظمیں یا غزلیں وغیرہ تھیں، لیکن افسوس کہ ان کے پورے اشعار نہیں پڑھے جاسکے، جتنا حصہ پڑھا جاسکا انہیں محفوظ کر لیا گیا۔

ان کاغذات میں مولانا اعظمی کا تخلص کہیں اختر، کہیں شوق اور کہیں حبیب لکھا ہوا ملتا ہے۔ بعض اشعار میں تخلص معجز بھی نظر آتا ہے، لیکن زیادہ تر غزلوں میں اختر ہی تخلص ہے۔

مولانا اعظمی کے یہاں اپنے کہے ہوئے اشعار کو محفوظ رکھنے کا کوئی خاص اہتمام نظر نہیں آتا، اگر ان کی حفاظت کا اہتمام برتا جاتا تو یقیناً ہمارے سامنے مختصر سی مگر ایک قیمتی مجموعہ کلام ہوتا۔ طبیعت میں جولانی تھی، ذوق سلیم پایا تھا اور صلاحیت بھی تھی چنانچہ سترہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے، عمر کی سترہویں بہار میں شعر و سخن کا طوفان بڑے زوروں سے اٹھا لیکن جلد ہی مولانا نے اس پر قابو پا لیا اور اس سیل رواں پر بند باندھ دیا، اور خود کو سنجیدہ علمی و تحقیقی مشاغل کی طرف موڑ لیا۔

تجربہ سے یہ بات ثابت بھی ہے کہ یہی عمر ہوتی ہے، جسمیں جذبات جوان اور احساسات براہینتہ ہوتے ہیں، اور فطری شعراء کے یہاں اسی بہار حیات میں آمد شروع ہو جاتی ہے۔ عربی زبان کے مشہور ادیب احمد حسن زیات کے بقول:

”عهدنا بالشعراء الوجدانیین ینبغون فی زهرة الشباب و
ربیع العمر۔“ ۱

(ہمارا تجربہ ہے کہ فطری شعراء عین شباب اور بہار عمر میں ہی مقام بلند
حاصل کر لیتے ہیں۔)

غزلیں

شعر گوئی کے لئے بھی مولانا نے دیگر علوم کی طرح استاذ کے سامنے زانوئے
تلمذ نہ کیا؛ تاکہ اشعار کی پرکھ ہو سکے اور اس فن کی باریکیوں سے مکمل آگاہی
ہو جائے۔ اس زمانہ میں غزل کی دنیا میں داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شہرت زیادہ تھی،
اور تازہ واردان ہوئے دل انہیں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ مولانا اعظمی نے
امیر مینائی کے حلقے کی طرف رخ کیا، اور انکے مشہور شاگرد سید محمد عسکری و سیم خیر آبادی
کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ۲

چنانچہ مولانا کی غزلیں و سیم صاحب کے پاس جاتیں اور وہ بڑے اہتمام
سے اصلاح کر کے واپس کرتے، تین چار غزلیں جن پر و سیم صاحب کے قلم سے
اصلاح ہے، مولانا کے بوسیدہ کاغذات میں محفوظ ہیں۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
نے ان کاغذات سے و سیم خیر آبادی کے چند خطوط اور مولانا حبیب الرحمن صاحب
اعظمی کی اصلاح شدہ غزلیں نوٹ لگی تھیں۔ مولانا اعجاز احمد صاحب کے شکریہ کے
ساتھ و سیم خیر آبادی کے خطوط اور مولانا کی اصلاح شدہ غزلوں کے چند اشعار پیش
کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ تاریخ الادب العربی ص ۴۹

۲۔ فراق گورکھپوری نے بھی و سیم خیر آبادی سے اصلاح لی تھی۔

وسیم خیر آبادی مولانا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”مجی و شفقی، سلام مسنون، آپ نے طبع سلیم اور فکر رسا پائی ہے، چند ہی غزلوں کے بعد آپ شیوا بیان ہو جائیں گے۔“

وسیم خیر آبادی ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

”قدردان و مہربان من، شفقی اختر سلمہ اللہ الاکبر

بعد سلام مسنون، مدعا یہ ہے کہ یہ غزل آپ کی ڈاکخانہ لکھنؤ کی سیر کرتی ہوئی ڈاکخانہ خیر آباد سے میری عدم موجودگی میں میرے گھر تک آئی، کسی نے یہ خط مرسلہ آپکا لے کر طاق پر رکھ دیا تھا، اور بھول گیا تھا، پرسوں کسی طرح سے مجھ کو ملا، میں نے کل سے آج تک اس غزل کو دیکھا..... میں نہایت شرمندگی اور انفعال کے ساتھ یہ غزل آپ کو بھیج کر معافی کا خواستگار ہوں، خدا نے آپکو طبع رسا اور فکر پیدا دی ہے، مضمون آفرینی کی طرف بہت آپکو توجہ ہے، امید ہے اگر آپ اپنا کلام مجھ کو دکھاتے رہے، تو بہت جلد آپ کو فائدہ پہونچے گا، اور اپنے ہم چشموں سے گوئے سبقت لے جائے گا، میں آپ کی یہ غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا، کیا کیا شعر نکالے ہیں، آپکا کلام میں بشوق دیکھا کروں گا۔ آپ ہونہار ہیں۔“

وسیم خیر آبادی کے اس خط سے واضح طور پر اشارہ ملتا ہے کہ ان کو مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے بڑی توقعات تھیں، وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے اس ہونہار شاگرد میں شعر و سخن کا جو ہر موجود ہے، اسی لئے خصوصی توجہ فرما رہے تھے، استاذ گرامی کا یہ مکتوب شاگرد کی اعلیٰ صلاحیت اور فکر بلند کا پتہ دیتا ہے۔ دو غزلیں ہمارے

۱۔ قلمی تحریر

سامنے ہیں جن کی استاذ نے اصلاح کی ہے، ان کے چند اشعار اور چند اصلاح سے ناظرین بھی محفوظ ہوں، ہمارے سامنے یہ بات بھی ہوئی چاہئے کہ یہ ایک نوخیز طالب علم کی کاوش ہے۔

لا ادھر ساقی، یہ کیوں رکھی ہے پیانوں میں چھا گیا ابر، بہار آئی گلستانوں میں
اس قدر جوش جنوں ہے، ترے دیوانوں میں گھر میں ایک پاؤں ہے، اک پاؤں بیابانوں میں
ان دونوں کے بارے میں وسیم صاحب نے لکھا ہے کہ:
”کیا خوب مطلع ہے“

دل ویران کو وہ آباد کریں تو کیونکر گھر بنایا نہیں کرتے کہیں ویرانوں میں
محو ہیں لذت آزار میں آزار پسند وہ نہیں جانتے کیا لطف ہے احسانوں میں
ہے میرے عشق کے افسانے میں جو سوز و گداز وہ نہیں کوہ کن و قیس کے افسانوں میں
اس شعر میں استاذ نے اصلاح کی ہے، پہلا مصرعہ یوں کر دیا ہے۔
ع ہے مرے قصہ درد میں جو سوز و گداز

اور اس پر تحریر فرمایا کہ:

”دونوں مصرعوں میں افسانے کی تکرار بے سود تھی۔“
پاس داران کا ہے دل کہنے کو ہے پاس مرے سمجھوں اپنوں میں اسے یا کہوں بیگانوں میں
استاذ نے دوسرا مصرعہ یوں کر دیا ہے۔

ع سمجھوں اپنوں میں کہ سمجھوں اسے بیگانوں میں
دیکھا عشاق نے کیا چاک گریباں تیرا ایک دھجی نہیں اب انکے گریبانوں میں
اسکے پہلے مصرعہ میں استاذ نے اصلاح کی۔

ع کیا تراوشیوں نے چاک گریباں دیکھا

اس پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

”دیکھا اور آیا وغیرہ کا الف سب کے یہاں دبا، الا استاذ مرحوم، اس پر

نظر رہے۔“

فخر کرنے کو میرے کم نہیں اتنا اختر میں ہوں خمخانہ مینائی کے مستانوں میں
اسکو وسیم مرحوم نے بدل کر اس طرح کر دیا:

کیا مئے تند ہے میخانہ مینائی کی میں ہوں اختر اسی خمخانے کے مستانوں میں
اس پر تحریر فرمایا:

”مینائی کی یاد بانا غلط تھا، یہ عیب نکل گیا، آپ نے مقطع لا جواب کہا تھا،

اب شان اور بڑھ گئی۔“

دوسری غزل کے چند اشعار جن کی استاد نے اصلاح کی ہے ملاحظہ ہوں:

دل جلے عاشق نے آہ لہسی دم تعزیر کی تیغ پگھلا کر بہادی قاتل بے پیر کی
اصلاح:

اڑ گئی آب اے ستم پرور تری شمشیر کی

”قاتل بے پیر نہیں بت پیر مستعمل ہے۔“

فکر زخموں کو ہوئی جو چارہ و تدبیر کی کیا نمک پاش ان پہ ہے خندہ زنی تقدیر کی
بیڑیاں اپنی رگڑتا رہ گیا بیمار غم ہائے آنے میں قضا نے بے طرح تاخیر کی
اصلاح:

بیڑیاں اپنی رگڑتا ہے کوئی بیمار غم لکھی جو میں نے شراب زعفرانی کی صفت
ہے زمین شعر بھی گویا زمیں کشمیر کی مے کدہ کے زیر سایہ بادہ خواروں کے لئے
ہم نے تو ڈیڑھ اینٹوں کی اک مسجد الگ تعمیر کی
اصلاح:

ہم نے تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کی

مے کدے

خود ہی بے پردہ ہیں ہر اک نکتہ آیات حسن مصحف رخ کے لئے حاجت نہیں تفسیر کی
اصلاح:

”ہر اک کے ساتھ واحد کہنا چاہئے“
محو حیرت، منہ کھڑے تکتے ہیں اختر واہ رے دلفریبی، دلکشی، ظالم تری تصویر کی
اصلاح:

محو حیرت سب ہیں، کہتا ہے یہ اختر سے وہ شوخ دلفریبی، دلکشی، دیکھی مری تصویر کی؟

مولانا کی کہی ہوئی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:
روشن ہے ایک داغ دل داغدار کا جلتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا
اتنی کڑی ٹھہی، ہو گئی مدت پئے ہوئے ساقی ہے آج تک وہی عالم خمار کا
چوری گیا جو میکدے میں جام سے تو رند کہتے ہیں کام ہے یہ کسی ہوشیار کا
اختر گنا کیا ہوں میں تاروں کو صبح تک
اچھا یہ مشغلہ تھا شب انتظار کا

نہ بھولی ہے، نہ کبھی دل سے آہ بھولے گی ادا کسی کے دبے پاؤں چپکے آنے کی
صبا کی چھیڑ پہ جھلا کے بول اٹھا غنچہ یہ بار بار بری لت ہے گد گد آنے کی
سمجھ سکے گا وہی مرے دل کی حسرت کو جو تکتا رہتا ہو راہیں قضا کے آنے کی
کہاں میں اور کہاں دیو بند اے اختر کشش نے کھینچ کے پہنچایا آب و دانے کی
ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ ۱۵ نومبر ۱۹۱۹ء

کھلے بندوں نظر کا گھومنا ہی تو قیامت ہے
 کسی مسجد میں ہم بھی بیٹھ کر ذکر خدا کرتے
 تپ غم میں ترے بیمار کو ہے تشنگی از بس
 جلا کر خاک کر دیتی مجھے گر آتش فرقت
 بھلا کیوں ہوتی یہ رسوا اگر پردہ نشیں ہوتی
 جو تیری بات زاہد درخور صدق و یقیں ہوتی
 پئے جاتا ہے خون دل، مگر سیری نہیں ہوتی
 کفن کی فکر ہوتی اور تربت ہی کہیں ہوتی
 گل سوسن سے پیدا اک صدائے آفریں ہوتی
 اگر گلشن میں ہوتا جا کے میں نکتہ سرا اختر

بزم طرب میں یکسو چھڑا تار ساز تھا
 ہم کو بھی اک زمانے میں اے شیخ معترف
 شمعوں پہ ایک عالم سوز و گداز تھا
 مسجد سے انس، دل میں مذاق نماز تھا
 اختر بھی کوئی متقی و پاکباز تھا
 بہر جنازہ ٹوٹ پڑے ہیں ملائکہ

ملا نہیں تم سا حسین یار ہمیشہ
 اے دل! نہ کہا تھا، نہ اٹھانا غم الفت
 ملتے نہیں ہم سے وفادار ہمیشہ
 آرام میں رہتے ہیں سبکسار ہمیشہ
 ہے باغ میں ہم پہلوئے گل خار ہمیشہ
 آباد رہے خانہ خمار ہمیشہ
 کہتا ہے خفا ہو کے جفا کار ہمیشہ
 کہتا ہوں کہ کب تک یہ تم ڈھاؤ گے صائب

اگر ساقی اٹھائے آنکھ مستو
 یہاں رہتے ہو، کیونکر قبر والو
 شراب ناب بھی گردوں سے برے
 نہیں ہوتی ہے وحشت اس کھنڈر سے؟
 کوئی آنے کو ہے اس رہ گزر سے
 ڈرے بلبل کی آہ ہر شر سے
 نسیم صبح تنکے چن رہی ہے
 مکاں صیاد کا پھونکے گی کھدو

آب کیا چہرہ پہ ہے اس بت شعلہ رو کے معجزہ ہے کہ جہاں آگ وہیں پانی ہے
 قدر داں بول اٹھے سن کے کلام اختر کوئی اعجاز ہے یا طرز خندانی ہے

سے کی اپنے سزا پائی دل لگا کر کے جنوں نے مجھ کو پھرایا برہنہ پا کر کے
 گلے میں ڈال دے باہیں جو شوق میں آکر تو بولے، دیکھنا صاحب! ذرا بچا کر کے
 مرید پیر مغاں خود بھی ہو گئے جا کر گئے تھے شیخ جی کیا کرنے آئے کیا کر کے

چھوڑ دے باتیں کہ باتیں تو بہت کیں تو نے اب ہو سرگرم عمل پیکر کردار تو بن
 زندگی کی طلب تھکو ہے، تو مرنے سے نہ ڈر شاہی چاہے تو گدائے شاہ ابرا تو بن

بوسہ لیا ہے میں نے چراتے ہیں آنکھ وہ کوئی کرے قصور کوئی شرمسار ہو

مرثیہ وقطعہ تاریخ

مولانا نے اردو میں بھی مرثیے کہے ہیں، ہمیں ایسی بہت سی شخصیات نظر آتی
 ہیں جن پر مولانا عظمیٰ نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مرثیے کہے۔ مولانا کو مادہ
 تاریخ نکالنے میں بھی کمال حاصل تھا، جیسا کہ اسکے چند نمونے عربی مرثی کے ضمن میں
 آپ دیکھ بھی چکے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اس موقع پر نمونہ کے طور پر صرف ایک
 مرثیہ اور ایک قطعہ تاریخ پیش کیا جا رہا ہے۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کا مرثیہ:

دارث علم نبی، حضرت استاذ جلیل وائے برما کہ ہوا آج جہاں سے رخصت

وہ کہ تھا اپنے زمانہ میں بخاری کا مثیل
وہ کہ تھا فقہ میں بو یوسف قاضی کی نظیر
ما تریدی زماں، اشعری وقت تھا وہ
جس سے تازہ ہوئی یاد ذہبی و مزنی
وہ کہ آئینہ پیکر میں تھے جس کے بخدا
وہ کہ تھی منبر ارشاد کو جس پر نازش
جس پہ نازاں عرب و مصر و عجم شام و عراق
وہ کہ تھا لخت دل قاسم خیرات علوم
آہ صد آہ ہوا نیر انور روپوش
قہر ہے بزم معارف ہوئی درہم برہم
وہ کہ تھا ابن معین پایہ و سفیاں شوکت
وہ کہ تفسیر میں اس وقت تھا حبر الامت
وہ کہ فارابی دوران تھا بفن حکمت
ابن تیمیہ کی زندہ ہوئی جس سے سیرت
جلوہ گر زلیعی و ابن حجر کی صورت
وہ کہ تھی مسند تدریس کو جس سے زینت
ہند کی خاک کو تھی جس کے قدم سے عزت
وہ کہ تھا مردک چشم رشید الملت
حیف بر حیف کہ عالم میں ہے پھیلی ظلمت
اور سونی ہے پڑی مجلس درس حکمت

علامہ سید سلیمان ندوی کا قطعہ تاریخ وفات:

فاضل علامہ سلیمان آج ہو گئے افسوس کہ ہم سے جدا
آہ کہ اب ہند میں کوئی نہیں فاضل و علامہ سلیمان سا
ماہر تاریخ و حدیث و سیر واقف اسرار کتاب خدا
اردو تو اردو عربیت میں بھی ان کو بہت دخل بڑا درک تھا
کیا نظر آتا ہے کہیں وہ کمال ان کو جو انشاء و کتابت میں تھا
حیف یہ گنجینہ علم و ادب دفن تہ خاک کراچی ہوا
فقرہ تاریخ کا جو یا تھا میں دل نے کہا، فاضل یکتا گیا ۲

۱۳۷۳ھ

نعتیہ کلام

یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کو ارشادات نبویہ سے کس قدر شغف تھا، ان کا مقصد حیات ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے ایک ایک پہلو اور رخ کی تحقیق کرنا تھا، انہوں نے حضور کے کلام میں در آنے والی زیروز بر تک کی زیادتی کی نشاندہی کر کے انکی اصلاح کی۔

ظاہر ہے جس نے اپنی زندگی اس میں وقف کر دی ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی محبت والفت کا کیا عالم ہوگا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی کا ہی یہ اثر تھا کہ جب بھی نام نامی آتا، عقیدت سے دل میں رقت اور تڑپ کے ساتھ اشعار پھوٹ پڑتے! اور جب یہ سلسلہ شروع ہوتا تو پھر کیا تھا اشعار موزوں ہوتے جاتے اور اوراق پر نقوش چھوڑتے چلے جاتے!

مولانا اعظمی کے سرمایہ شعر و سخن میں چار اردو نعتیں ملتی ہیں، کچھ ابتدائی زمانہ کی ہیں، اور کچھ اس زمانہ کی ہیں جب وہ شاعری چھوڑ چکے تھے۔ مولانا کی نعت میں عقیدت و محبت کی معراج کے ساتھ ساتھ تلمیح، واقعہ نگاری اور اسلامی تاریخ کے پس منظر کی جھلک نظر آتی ہے۔ مولانا کا نعتیہ کلام حیات ابولما آثر سے مستعار لے کر ذیل میں پیش خدمت ہے۔

نعت میں رطب اللسان ہے احمد مختار کی	دھوم ہو کیونکر نہ میرے خامہ دربار کی
ہو غلامی کا مجھے تمنہ عطا روجی فداک	عزت افزائی ہو اتنی شاعر دربار کی
کھاتی تھی موج ضلالت کے تھپڑے دم بدم	آپ نے آکر سنبھالا اور کشتی پار کی
جس نے دیکھا ہو گیا وہ کشتی تیغ ادا	کیا ضرورت آپکو خنجر کی اور تلوار کی
اک نگاہ لطف سے دیکھا جہاں سرکار نے	بھر گئی جیب مراد اس اختر نادار کی

ابتدائی عمر کی ایک اور نعت ملاحظہ ہو:

مرے ماں باپ مری جان رسول عربی ترے صدقے، ترے قربان رسول عربی
 ہر ادا پر تری اور سنت بیضا پہ تری میں ہوں جان سے قربان رسول عربی
 حق تعالیٰ کا تو محبوب ہے اللہ اللہ کیا نرالی ہے تری شان رسول عربی
 کہیں بڑھ چڑھ کے تھے میرت میں ملائک حضور اور صورت میں تھے انسان رسول عربی
 شب معراج سر عرش بریں پہونچے نبی ہو کے اللہ کے مہمان رسول عربی
 اس سے بڑھ کر کوئی بد بخت نہیں دنیا میں جو بھلا دے ترے احسان رسول عربی
 آرزوئے دل بے تاب ہے مدت سے یہی بنوں میں آپکا مہمان رسول عربی
 صرف اک تیری غلامی و محبت کے سوا مغفرت کا نہیں سامان رسول عربی
 مدعا ہے کہ رہے آپ کا ذکر محمود ورد ہر لحظہ ہو ہر آن رسول عربی
 شوق پر اک نظر لطف و کرم ہو شاہا! آپ کا ہے یہ ثنا خوان رسول عربی!

مزید ایک نعت پیش خدمت ہے:

وہ جہاں کا رمز وجود ہے، وہ مدارِ کارِ نظام ہے
 وہ خدا کی شانِ جمال کا بخدا کہ مظہرِ تام ہے
 کرو یادِ معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ
 وہ خدا کا قبر و جلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
 کبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
 وہ ہلالِ چرخِ کمال تھے مرا شاہِ بدرِ تمام ہے
 جو غذائے روح و سکونِ دل ہے انھیں کی پاکِ حدیث ہے

۱۔ یہ نعت فلمی تحریر میں دستیاب ہوئی، حیاتِ ابوالہماثر میں یہ نعت چھ اشعار پر مشتمل ہے، اور اس میں دس اشعار ہیں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

جو مریض دل کے لئے شفا ہے انھیں کا پاک کلام ہے
جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہ لطف و کرم سے ہے
قلم و زبان حبیب کیا ہے انھیں کا فیض دوام ہے

آپ پر دل کا دورہ پڑا، حالت ناگفتہ بہ ہو گئی، موت و حیات کے کشمکش میں
تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا:

میں والد و شیدا ہوں نبی عربیؐ کا مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا
ایماں ہے میرا زمزمہ خواں صدر خلافت صدیقؓ، عمرؓ، حضرت عثمانؓ و علیؓ کا
ہیں بیت کا مصداق نساء اقدم و اول اور ثانوی ہے اہل عباؑ نبویؐ کا
جو آنکھیں تھیں انوار نبوت سے منور خاک کف پاہوں میں ہر اک شیخ و صبی کا
بیروت و کویت اور حلب میں نہ کشش تھی یہ جاذبہ تھا جب حدیث نبویؐ کا
ہے خلق نبیؐ خاصہ ختم رسالت دنیا میں علم لے کے اٹھو خلق نبیؐ کا
کشتی اثر انگیز تھی ہجرت کی وہ تاریخ بس تین ہی فقرے کا تھا یہ خطبہ نبیؐ کا
تھے ابن سلامؒ اک بڑے ذی علم یہودی موجب ہوا اسلام کا یہ خطبہ نبیؐ کا
آمد کی صدا کانوں میں اک نخل پہ آئی بے خوف و خطر کودے سنا کلمہ نبیؐ کا
کھلاؤ مساکین کو پھیلاؤ سلام آپ اٹھ جاؤ کہ جب غلبہ ہو خواب سحری کا
چہرے پہ نظر پڑتے ہی بے ساختہ بولے ممکن نہیں یہ چہرہ ہو کذاب شقی کا
اس انس و تعلق کی بنا پر ہوں پر امید

دیوانہ ہوں مدت سے حدیث نبویؐ کا

مولانا کی یہ نعت سوز دروں، پاکیزگی فکر اور حضور کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی
و فریفتگی کا مرقع ہے۔ خلفاء اور صحابہ کرام کے لئے احترام بے پایاں کی روشن مثال
ہے۔ مولانا نے اس نعت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے واقعہ اسلام کو بھی مختصر

پیرایہ میں بڑے سلیقہ سے ذکر کیا ہے۔

موج کوثر اور داد تحسین | مشہور شاعر اقبال سہیل کی ایک شاہکار تخلیق 'موج کوثر' ہے، سہیل کا یہ نعتیہ کلام ہے، اس میں ۸۶ اشعار ہیں، "یہ نعت دراصل نعتیہ شاعری کے خزانے میں گویا ہر شب چراغ کی حیثیت رکھتی ہے۔" اس نعت کی خوبی اسیر ادروی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"اس نعت کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رات کی رانی کی خوشبو نرم رو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اپنے بے آواز پروں سے اڑتی ہوئی چلی آرہی ہے، مشام جاں معطر ہو جاتا ہے، روح سرشار ہو جاتی ہے، پورا وجود کیف و سرور میں ڈوب جاتا ہے۔"

اس نعت کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

احمد مرسل فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
 مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
 جسم مزکی روح مصور قلب مجلی نور مقطر
 حسن سراپا خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
 کفر کی ظلمت جس نے مٹائی دین کی دولت جس نے لٹائی
 لہرایا توحید کا پرچم صلی اللہ علیہ وسلم
 باغ جہاں کا حارس نامی جس نے مٹائی رسم غلامی
 پھر سے سنوارا گلشن آدم صلی اللہ علیہ وسلم
 بزم ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی
 اس نے کئے سب آ کے منظم صلی اللہ علیہ وسلم

سہیل کی یہ نعت بہت مشہور و مقبول ہوئی، اس پر مشاہیر فن اور ادباء و علماء نے ان کو کھل کر داد دی۔ مولانا اعظمی نے بھی سہیل کو ان کی مدح نگاری پر داد تحسین دی، اور نایاب ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار حسب ذیل خط میں کچھ اس طرح کیا:

”مدرسہ مفتاح العلوم منو“

۲۸ فروری ۱۹۴۴ء

مکرم!

السلام علیکم!

آپ کی تازہ نعت نبوی اتقاہ ایک صاحب سے مل گئی، اسکو پڑھ کر میں اتنا محظوظ ہوا کہ بے ساختہ یہ چند اشعار موزوں ہو گئے، اب نہ میں شاعر ہوں نہ یہ شاعری ہے بلکہ میرے تاثرات ہیں جو موزوں ہو گئے ہیں۔

اے اقبال! اے شاعر ملت، نازش قوم اور فخر جماعت

مدح نگار مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

لکھی تو نے کتنی سچی، کتنی بلند، اور کتنی پیاری

نعت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نے روحوں کو گرمایا، جوش عقیدت اس نے بڑھایا

سب کی زبانوں پر ہے پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

تجھ کو مبارک مدح نگاری، تجھ پر سایہ رحمت باری

تجھ سے راضی ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم

انک ان تقرأه علیہ یوم المحشر حین تراہ

أرجو منه أن یتبسم صلی اللہ علیہ وسلم ۱

(حبیب الرحمن الاعظمی) ۲

مولانا اعظمی کا یہ شاعرانہ کمال ہی تھا کہ اقبال سمیل نے جس رنگ و آہنگ اور آب و تاب میں یہ نعتیہ کلام پیش کیا ہے بالکل اسی آہنگ اور شوکت الفاظ کو برقرار رکھتے ہوئے مولانا نے انہیں داد دی۔ آخر میں عربی شعر نے مولانا کے اس ہدیہ تبریک میں اور جان پیدا کر دی۔

فن شاعری | مولانا اعظمی کی شاعری تک بندی نہ تھی بلکہ وہ اپنے کلام میں زبان کی صحت، بندش الفاظ، اوزان و بحر اور عروض وغیرہ کی پوری رعایت برتتے تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا کا مطالعہ بھی وسیع تھا، فن شاعری سے واقفیت و باخبری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ، علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات پر مولانا اعظمی نے ایک تعزیتی نظم کہی، اور اشاعت کے لئے 'انقلاب' کے مدیر مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس ارسال فرمایا۔

قاضی صاحب کو اس نظم میں کچھ فنی نقص معلوم ہوا، اور انہوں نے اپنی طرف سے اس میں کچھ تصرف کر دیا اور پھر 'انقلاب' میں شائع کیا۔ جب مولانا اعظمی نے اپنی یہ نظم بدلی ہوئی صورت میں دیکھی تو قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس مندرجہ ذیل تحریر بھیجی:

”آپ کے 'تصرفات' کی نسبت گزارش ہے کہ اصلاح اگر موجب ہو تو میں

۱۔ آخری شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور روز محشر اگر یہ نعت آپ پڑھیں گے، تو مجھے امید ہے کہ آپ ﷺ سن کر مسکرا دیں گے۔

۲۔ اقبال سمیل حیات اور شاعری ص ۲۹۱

صرف خوش نہیں بلکہ شکر گزار بھی ہوتا ہوں، مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا روم کے وزن پر بحر رمل مسدس محذوف میں خیال کیا، اس لئے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے، آپ نے اس وزن پر بنا ڈالا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم قرآن السعدین، مخزن اسرار، مطلع الانوار اور سبحة الابرار کے وزن پر بحر سرلیح مطوی سے موقوف ہے، جسکا عروض و ضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف فاعلان ہو سکتا ہے، اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے، اس کے بعض شعریا مصرعے بحر رمل بھی پڑھے جاسکتے ہیں، جیسے مولانا جامی کے یہ اشعار

- | | | |
|-----|--------------------------|--------------------------|
| (۱) | زفتن او جستن تیر از کماں | جستن او جت طے مکاں |
| (۲) | توبہ دہ از سرکشی ایام را | ماز خرازا خوشی اسلام را |
| (۳) | دیدہ عالم بتو روشن شود | ظلمت گیتی بتو گلشن شود |
| (۴) | ظلمت بدعت ہم عالم گرفت | بلکہ جہاں جامہ ماتم گرفت |

مصرعہ اولی بحر رمل میں پڑھا جاسکتا ہے۔

- (۵) چوں نہ بزرگست و شمرش سخن منبر او بر سر او خورد کن
- اس میں صرف مصرعہ ثانیہ بحر رمل میں پڑھا جاسکتا ہے، حالانکہ سبحة الابرار جامی بحر سرلیح میں ہے اور اس کا پہلا مصرعہ نہست صلائے بر خوان کریم ہے، اور اسی مثنوی کا یہ مشہور شعر ہے۔

اے مبرا پردہ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب“

قاضی صاحب نے مولانا الاعظمی کی اس فنی تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور

۳۰ دسمبر ۱۹۵۳ء کے 'انقلاب' میں "ایک علمی اور ادبی مکتوب گرامی، بحر سرلیح اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح" کے عنوان سے شائع فرمایا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے شعری اکتسابات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے نعت ہو یا غزلیں اس دور کے مزاج و مذاق کے مطابق زبان پر دسترس ہے۔ مضمون آفرینی، نزاکت خیال، قافیہ پیمائی اور مشکل زمینوں میں جو ہر سخن کو نمایاں کرنے کا انداز نظر آتا ہے۔ یہاں یہ لکھنے کی بھی جسارت کی جا رہی ہے کہ مولانا کو شاعری سے فطری مناسبت تو ضرور تھی مگر کہاں مدرسہ اور کہاں میکدہ! اس لئے بہت دنوں تک اردو میں مشق سخن جاری نہ رکھ سکے۔

فارسی نثر

مولانا اعظمی فارسی زبان کی بھی واقفیت رکھتے تھے، فارسی سے ان کا تعلق واقفیت تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ باقاعدہ فارسی میں پوری روانی کے ساتھ لکھا بھی کرتے تھے، ہمیں مولانا کی بہت سی ایسی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں، جو خالص فارسی زبان میں ہیں۔ مولانا کی لکھی ہوئی بیاض میں 'وفیات الاعیان' کا جو حصہ ہے اس میں بیشتر تحریریں یا تذکرے فارسی میں ہیں۔

مولانا ایک ذہین شخص تھے، انہیں زبان کی باریکیوں کے سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی تھی؛ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا مزاج عربی فارسی اور اردو ادب سے پوری طرح وابستہ تھا، انہیں ان زبانوں سے فطری انس تھا؛ کیونکہ جب آنکھیں کھولیں تو گرد و پیش جو ماحول پایا اس میں یہی تینوں زبانیں لکھی، پڑھی اور بولی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ ذہین ہو، جس کا ذہن زبان کے ادب کو قبول کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، تو اس کے لئے فارسی زبان کو اوڑھنا بچھونا بنانا تعجب کی بات نہیں! جی چاہتا ہے کہ مولانا کی فارسی نثر کے بھی ایک دو نمونے اس موقع پر پیش کر دیئے جائیں۔

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وحی اللہ صاحب فتحپوریؒ | وفیات الاعیان
میں مولانا اعظمی نے حضرت شاہ صاحبؒ کا تذکرہ فارسی میں کیا ہے۔ اسکی چند ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:

”از خلفائے حضرت مرشدنا حکیم الامت تھانوی بود، زاد بوم او فتحپور تال
نرجا کہ از مسوہشت یا نہ میل دور جانب شمال واقع است، در مح ۱۳۳۲ھ از
دارالعلوم دیوبند سند فراغ یافت، وبعد فراغ بہ دامن دولت پیر مرشدنا

وابستہ گردید، مدتہا در خانقاہ امدادیہ اقامت کرد و فیضہائے فراواں برد، باز
بفتحپور آمدہ پائے عزلت شکست، ابتداء بغایت عسرت زندگی بسر می برد،
چندے در مبارک پور و سالہائے در کانپور بتدریس قیام نمود، و آخر ہا باز
بخانہ خود منزوی شدہ بارشاد طالبین و اصلاح اوشاں مشغول گشت، در چند
سال چنان حسن قبول یافت کہ طالبین اصلاح از مسافتہائے دور دراز
رخت سفر بسوئے فتحپور بستند و داخل حلقہ اوشدند، و از انجا کہ در مزاج
شریف وے حدت بود بارے از اہل فتحپور چنان رنجید کہ تاب اقامت
نداشت و در کوپانج منتقل گردید، بارے دیگر در گور کھپور بخانہ مولوی نثار
اللہ اقامت گزید، و بعد چندے از انجا بالہ آباد منتقل شدہ، و ہانجا مستقلاً
طرح اقامت انداخت، حویلی بزرگ و یک قطعہ زمین خرید کرد۔

باز برائے تبدیل آب و ہوا بہ بمبئی رفت، و ایں سفر او بسیار مبارک
و سودمند افتاد، بسیارے از تجار بمبئی راہ ہدایت یافتند، در کرلا بخانہ یکے از
متمولان بمبئی اقامت می کرد، و ہانجا نیز یک قطعہ زمین خریدہ بود کہ
در اں عمارت خانقاہ و مسجد خواہد کرد، در ۱۳۴ھ شوق زیارت حرمین
غالب آمد، و تاریخ نوزدہم شعبان ۱۳۸ھ بباخرہ مظفری روانہ حجاز
شد، ایں فقیر بہ تقریب مشایعت و تودیع او در جہاز با او ملاقات کرد و دو
ساعت ہانجا ماند و وقت رخصت تا دیر معانقہ کرد، و حضرت شیخ از غایت
محبت و شفقت سر و دست فقیر را بوسہ دادند، و یک شیشی عطر عود ہدیہ نمودند،
فقیر ہما نروز از بمبئی روانہ شد و بروز جمعہ وارد موگر دید، و بروز شنبہ بساعت
ہشتم بعد مغرب ایں خبر رسید کہ مولانا در جہاز جان بجان آفریں سپردند،
ایں خبر بذریعہ ٹیلیگرام از بمبئی آمدہ بود، پیرس کہ ازیں خبر بر من چہ

گزشت، بعد ازیں بذریعہ اخبارات معلوم شد بھر ۲۵ شعبان بعد از نماز تہجد بحق واصل شدند، و در اں لمحہ کسے دیگر حاضر نبود، چوں خادم چائے آورد، دید کہ روح از قفس عنصر پرواز کردہ است، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

پس تحقیق رسید کہ بتاریخ ۲۴ شعبان بعد نماز مغرب بمرض فالج مبتلا شدند، بیچ تدبیر و علاج سودمند میفتاد، بہماں شب بوقت ساعت دوازدهم روح از قفس عنصری پرواز نمود، خواستہ شدہ بود کہ در مکہ یا مدینہ مدفین سرانجام پذیرد لیکن نزدیک جدہ رسیدہ جسہ مبارکہ وے سپرد آب دریائے شور کردہ شد۔

(حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتنپوری، ہمارے مرشد حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے، مئو سے آٹھ یا نو میل شمال میں واقع تال نرجان کی جائے پیدائش ہے، بح ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اور فراغت کے بعد ہمارے مرشد کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے، خانقاہ امدادیہ میں مدتوں قیام رہا، وہاں انہوں نے فیوض و برکات حاصل کیں، پھر واپس فتنپور آ کر خلوت نشیں ہو گئے، شروع میں بہت جنگی کی زندگی گذاری، چند برس مبارکپور اور کئی سال کانپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، اور ایک بار پھر اپنے گھر میں گوشہ نشیں ہو گئے اور سالکین و مریدین کی اصلاح میں مشغول ہو گئے، چند سالوں میں ہی آپ کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ راہ سلوک کے سالکین نے دور دراز علاقوں سے اپنا رخت سفر فتنپور کے لئے باندھا، اور آپ کے حلقہ

عقیدت میں داخل ہوئے۔ چونکہ آپ کے مزاج شریف میں حدت تھی ایک بار اہل فتحپور سے اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ وہاں اقامت کی تاب نہ رہی اور کوپانگنج منتقل ہو گئے، دوسری بار گورکھپور میں مولوی ثار اللہ کے گھر پر اقامت گزری ہوئے، اور کچھ ہی مدت بعد وہاں سے الہ آباد منتقل ہو گئے اور وہاں مستقل طرح اقامت ڈالی اور ایک بڑی حویلی اور قطعہ زمین خریدا۔

پھر آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے بمبئی گئے، آپ کا یہ سفر بہت مبارک اور سودمند ثابت ہوا، اور بمبئی کے بہت سے تاجروں نے راہ ہدایت پائی، کرلا میں بمبئی کے ایک مالدار آدمی کے گھر قیام فرمایا اور وہیں ایک قطعہ زمین خرید لیا کہ اس میں خانقاہ اور مسجد کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ ۱۳۸ھ میں حرمین کی زیارت کا شوق غالب آیا اور ۱۹ شعبان ۱۳۸ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا اور دو گھنٹے وہاں رہا، رخصت کے وقت دیر تک معافہ کیا، حضرت شیخ نے اپنی حد درجہ محبت و شفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھوں کا بوسہ لیا اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی، ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا اور جمعہ کے دن مسکو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب کے بعد ۸ بجے یہ خبر پہنچی کہ مولانا نے جہاز میں جان جان آفریں کے سپرد کردی، یہ خبر بمبئی سے بذریعہ ٹیلی گرام موصول ہوئی تھی، مت پوچھو کہ اس خبر سے مجھ پر کیا گزری، اس کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ ۲۵ شعبان کو سحر کے وقت نماز تہجد سے فراغت کے بعد واصل بحق ہوئے، اس وقت کوئی دوسرا شخص حاضر

خدمت نہیں تھا، جب خادم چائے لایا تو دیکھا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمت کا سایہ فرمائیں۔
 پھر تحقیق سے یہ خبر ملی کہ ۲۴ شعبان کو نماز مغرب کے بعد فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے، کوئی تدبیر و علاج سودمند نہیں ہوا، اور اسی رات ۱۲ بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، یہ چاہا گیا کہ مکہ یا مدینہ میں تدفین انجام پائے لیکن جدہ کے قریب پہنچ کر جسد مبارک سمندر کے سپرد کر دیا گیا۔)

جگر مراد آبادی | سکندر علی جگر مراد آبادی اشہر و اشعر شعرائے عصر بود، بارہا مرا اتفاق صحبت و سماع غزلیات اوفتادہ، در گوئدہ رخت اقامت انداخت، و مدتے دراز کہ بیش از سی سال باشد ہما نجا ماند، و بالآخر ہما نجا پیوند خاک شد، ستمبر ۱۹۶۰ء (۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ) روز جمعہ بود کہ ازیں جہاں در گذشت، من ابیات المستحسنہ قولہ:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی!

(سکندر علی جگر مراد آبادی اپنے زمانے کے سب سے مشہور اور بڑے شاعر تھے، بارہا مجھے ان کی صحبت اور غزل سننے کا اتفاق ہوا، گوئدہ میں رخت اقامت ڈالا، اور عرصہ دراز یعنی ۳۰ سال سے زیادہ وہاں فروکش رہے، اور بالآخر وہیں پیوند خاک ہوئے، ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء (۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ) جمعہ کے دن اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے پسندیدہ اشعار میں یہ شعر ہے:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

فارسی نظم

فارسی میں بھی مولانا اعظمی کا شاعرانہ کلام دیکھنے میں آتا ہے، فارسی نظموں میں بھی وہی خوبیاں، وہی سلاست زبان اور نزاکت بیان ہے، جو عربی اور اردو کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ فارسی میں مولانا کی ایک نعت شریف اور متعدد قطععات تاریخ ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ایک فارسی نعت اور ایک قطعہ تاریخ پیش خدمت ہے:

نعت شریف

ز استانت با سرائشک غم بیادت می روم بادل صد چاک با صد یاس و حسرت می روم
گر تو آستم نمی بودم ز پائے تو جدا می روم لیکن بقصد و عزم عودت می روم
می روم سوئے وطن و زور و دل بے اختیار ناله دارم کہ می گوئی بہ غربت می روم
یا رسول اللہ جشنا اذ ظلمنا فلنجد رہنا با ہر دو وصف ختم آیت می روم

اُنْعِشْنِ اِیَّاهُ یا مَوْلی الْحَبِیبِ الْاَعْظَمِی

خستہ افتادہ نماید چوں زکویت می روم

مولانا ابوالکلام آزاد کا قطعہ تاریخ وفات | مولانا اعظمی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا:

وزیر دولت جمہوری ہند زعیم انقلاب ہند آزاد
نہ گفتارش کہ گوہر ہائے تاباں نہ تحریرش کہ یاد از سحر می داد
دریغ از جہاں رخت سفر بست بر او صد رحمت و رضوان حق باد

اگر تاریخ او خواہی نوشتن بگو سہ بار آخر موت آزاد
 مولانا عظمیٰ نے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کو ”گوہر ہائے تاباں“ اور
 ”گوہر ہائے شہوار“ دونوں طریقوں پر لکھا ہے، اسی طرح آخری شعر کا پہلا مصرع اس
 طرح بھی لکھا ہے ”اگر پرسد کسے سال وفاتش“ موت آزاد کی گنتی ۳۵۹ آتی ہے، اگر
 اس کو تین سے ضرب کریں ”بگو سہ بار آخر“ سے جس کی طرف اشارہ ہے، تو مجموعی
 اعداد ۱۳۷۷ آئیں گے۔

مولانا نے عربی فارسی اور اردو میں اپنی تخلیقات کو پیش کیا ہے، وہ بہت عظیم
 شاعر یا ادیب تو نہ تھے، شاید وہ اپنی شناخت اور پہچان اس حیثیت سے چاہتے بھی نہ
 تھے، لیکن ادب پر ان کی گرفت اور ان کا خوبصورت طرز اظہار اور ان سب سے بالاتر
 فن پر ان کی عمیق نظر (جس کا ثبوت قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ان کا خط ہے)، ان
 کا وسیع مطالعہ، ان کے اندر چھپی ہوئی ایک تخلیقی شخصیت مندرجہ بالا مثالوں میں دیکھی
 جاسکتی ہے، چاہے وہ نثر ہو یا نظم، عربی ہو یا فارسی، یا پھر اردو، ان تمام زبانوں میں
 مولانا کو دسترس حاصل تھی۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک مرد باخبر اور عالم حق آگاہ کی
 حیثیت سے انہوں نے اپنے لئے اور اپنی دنیاوی اور اخروی زندگی کے لئے جو
 شناخت اور پہچان اور انفرادیت بنائی وہ دین و مذہب کی وسیع دنیا تھی۔



باب چہارم

متفرقات

باب چہارم

متفرقات

اقبال نے جب کہا تھا

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جنکا نہیں کوئی نام

تو انہوں نے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ اگر بے نام زمانے ہیں تو بے عنوان افسانے بھی ہیں۔ اور جب کسی گراں قدر علمی شخصیت پر قلم اٹھایا جاتا ہے، تو یہ بے عنوان افسانے کثرت سے سامنے آتے ہیں، اس لئے انہیں کوئی عنوان نہ دے کر متفرقات کی صف میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

ان میں باہمی ربط صرف مصنف کی شخصیت ہوتی ہے، اور انہیں اس لئے جگہ دی جاتی ہے کہ گلزارِ تخلیق میں صرف پھول، کانٹے، پتیاں اور رنگ ہی نہیں ہوتے بلکہ کیاریاں اور تھالے اور اڑتا ہوا سبزہ کارنگ، یہ سب بھی اہم ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر تحقیق و تعلیق اور تشریح و تبصرہ وغیرہ کی اہمیت ہے تو وہ نقل و حواشی بھی اہم ہیں جو کسی کتاب کے متن کے سلسلہ میں تصحیح کرتے ہوئے لکھوائے گئے، مختلف موضوعات پر لکھے گئے وہ رسالے اور کتابچے بھی اہمیت کے حامل ہیں جو اگرچہ حجم میں چھوٹے ہیں مگر موضوع کے اعتبار سے گراں قدر ہیں، اسی علمی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ”متفرقات“ کے عنوان کے تحت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی

اس طرح کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے مولانا کی کتاب ”حسن ادب اور اسکی اہمیت“ کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

حسن ادب اور اسکی اہمیت

اسلام جس اعلیٰ تہذیب و تمدن اور جن پاکیزہ اخلاقی قدروں کا داعی ہے، وہ اسی وقت وجود میں آسکتے ہیں، جب ہم صالح معاشرہ کی تعمیر کریں اور پاکیزہ ماحول کو تشکیل دیں، اور پاکیزہ معاشرہ کی تعمیر و تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب زندگی کا سلیقہ جانتے ہوں، اور اسکے آداب و اطوار سے واقف ہوں، اور ہم زندگی کا سلیقہ اور اس کے اصول و آداب اسی وقت جان سکتے ہیں، جب ہم اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے۔

اس تیز رو ترقی کے ماحول میں جب ہم ارد گرد دیکھتے ہیں، اور اپنے معاشرہ کا جائزہ لیتے ہیں، تو پوری انسانیت بڑی تیزی سے تنزلی کی طرف ڈھلکتی نظر آتی ہے، اسکی صرف اور صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہم اسلام کے بتلائے ہوئے نظام حیات کو چھوڑ چکے ہیں۔

بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ جس قوم مسلم نے دنیا کی تاریک رہ گزر پر ترقی کی قدیلیں روشن کیں، جس نے اقوام عالم کو پستی و پسماندگی کے گڈھے سے نکال کر ترقی کی سطح پر گامزن کیا، آج وہی قوم مسلم سب کی نظروں میں پست سمجھی جا رہی ہے! بلاشبہ ہمیں پست کہنے والے خود پستی کے دلدل میں ایسے پھنسے ہیں کہ ہزار ہا کوششیں بھی ان کو اس دلدل سے نہیں نکال سکتیں، لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کامیاب زندگی کا جو لائحہ عمل پیش کیا تھا،

اور جس کو ہمارے اسلاف نے عملی زندگی میں برت کر دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کی تھی، آج اس پاکیزہ دستور زندگی کا دامن ہم سے چھوٹا نظر آ رہا ہے۔

تواضع، انکساری، بڑے چھوٹوں کا ادب و لحاظ، ہمدردی، نرم خوئی اور ایثار و قربانی وغیرہ جن میں ہماری کامیابی کا راز پنہاں تھا، اب ہم میں یہ خوبیاں اس طرح کہاں، جس طرح ہمارے بزرگوں اور اسلاف میں تھیں! غرض کہ ہمارے اخلاق و عادات مائل بہ زوال اور انحطاط پذیر ہیں، بڑے ادب کے ساتھ ہم یہ کہنے کی بھی جرأت کریں گے کہ یہ اخلاقی انحطاط عوام تک ہی محدود نہیں بلکہ حلقہ خواص بھی اس مرض میں مبتلا ہے۔

معاشرہ کی اصلاح اور سماج کی بہتر سے بہتر تعمیر و ترقی کے لئے ہر دور میں غور و فکر کیا جاتا رہا ہے، اور زندگی کے اسلامی آداب کی روشنی میں اس انحطاط و زوال کا حل پیش کیا جاتا رہا ہے، چنانچہ آداب زندگی پر بہت سی کتابیں بھی لکھی جاتی رہیں، انہیں کتابوں میں ایک کتاب ”حسن ادب اور اسکی اہمیت“ بھی ہے، جسکو مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے تصنیف فرمایا ہے۔

مولانا اعظمی نے اس کتاب میں ان چیزوں کو ذکر کیا ہے، جن پر ایک طرح سے معاشرہ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کتاب کے عنوان یہ ہیں: استاذ کا مرتبہ، استاذ اور ہر عالم کے حقوق، اجلال علم و علماء، اجلال علم و تعظیم، استاذ کا لحاظ پہلے لوگوں میں، استاذ کے ساتھ عقیدت، بات چیت میں تمیز اور ادب کی تعلیم، تذکرۃ السامع کی ایک فصل کا خلاصہ، حضرت علی کی نصیحتیں طلبہ کو۔

مولانا اعظمی مدارس دینیہ کے طلبہ کے گرتے ہوئے اخلاق کو دیکھ کر بہت مایوس تھے، ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کی فکر دامنگیر رہتی؛ اس لئے اس کتاب میں ان کو اپنے اخلاق کی اصلاح کی طرف بطور خاص متوجہ فرمایا ہے۔ اس

کتاب کا دوسرا نام ہی مولانا نے ”الهدیۃ السنیۃ لطلاب العلوم الدینیۃ“ رکھا۔

مولانا کی یہ تحریر پہلی دفعہ دارالعلوم دیوبند شعبان ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئی، ’دارالعلوم‘ نے دوبارہ اسکو ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ میں شائع کیا، تیسری مرتبہ مجلہ ’الماثر‘ نے محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۱۵ھ میں شائع کیا، اور اب ۱۳۲۲ھ م ۲۰۰۱ء میں اس رسالہ کو مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ منو نے شائع کیا ہے۔

اسرار المحبۃ

حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (۱۱۶۳ھ-۱۲۳۳ھ) سرچشمہ علم و فن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے ہیں۔ شاہ رفیع الدین دہلوی بڑے پایہ کے محدث و محقق اور فقیہ ہیں، ادب اور فنون لطیفہ میں بھی آپ کو ملکہ تامہ حاصل تھا؛ گرانقدر اور مرجعی حیثیت کی حامل کتابیں آپ کی تصنیفی یادگار ہیں، ان تصنیفات میں ایک اہم نام ’اسرار المحبۃ‘ کا ہے۔

’اسرار المحبۃ‘ موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم اور انوکھی تصنیف ہے، یہ کتاب محبت کے موضوع پر لکھی گئی ہے، جیسا کہ اسکے نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے، اس میں محبت کے ہر نشیب و فراز سے بحث ہے، اقسام، نتائج اور اثرات وغیرہ پر کلام کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس کتاب میں صرف محبت کی ہی بات ہو بلکہ اس موضوع کے ذیل میں بہت سے مسائل دقیقہ اور اسرار غامضہ سے بھی بحث ہے، اس میں ولی اللہی فکر و حکمت کی بعض الجھمی ہوئی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہیں۔ شیخ محسن تریقی نے اس کتاب کی اور اسکے مصنف کی خوب تعریف کی ہے، اور آخر میں لکھا کہ:

”قللما اتفق مثله ممن تكلم عليها“۔ یعنی شاہ رفیع الدین کے علاوہ چند ہی لوگ ایسے ہو گئے جنہوں نے محبت کے اسرار و رموز پر اس طرح کلام کیا ہو۔

”اسرار المحبۃ“ کے تین اجزاء ہیں: (۱) تحصیل (۲) تذیل (۳) تفصیل۔

پھر ان اجزاء کے بھی ذیلی اجزاء ہیں۔ آخری جزو ”تفصیل“ میں عربی قصائد بھی ہیں ان میں سے کچھ دوسرے شعراء کے ہیں اور کچھ خود حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے ہیں۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت بھی بلند ہے، ادبی نقطہ نظر سے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالحمید سواتی مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ لکھتے ہیں:

”اس کتاب کا شمار یقیناً ادبیات عالیہ میں ہوگا، اس لئے کہ موضوع کی

عظمت کے علاوہ اس میں زبان کی پاکیزگی اور سلاست انتہائی درجہ کی

پائی جاتی ہے، فصاحت و بلاغت اور اظہار مافی الضمیر کے لئے جس قسم

کے الفاظ شاہ صاحبؒ نے چنے ہیں وہ نہایت ہی قیمتی ذخیرہ ہے۔“ ۱

یہ کتاب اب تک نایاب تھی، اسکے نسخے بھی دسترس سے باہر تھے، کچھ ملے

بھی تو کرم خوردہ یا بوسیدہ۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ کو جنہیں نادری قلمی نسخوں

اور قدیم علمی کتابوں کے سلسلہ میں ہمیشہ تجسس رہتا تھا، ”اسرار المحبۃ“ جیسی اہم کتاب کا

ایک نسخہ دستیاب ہو گیا، جسے انہوں نے نقل کر کے مجلس علمی کراچی روانہ فرمایا، مولانا

اعظمیٰ نے ایک مکتوب میں اسکے بارے میں یوں انکشاف فرمایا ہے:

”اسرار المحبۃ کی نقول بھی مجلس علمی کے پاس میری ہی بھیجی ہوئی ہیں، جسکو

مجلس کے سرپرستوں کی خواہش پر میں نے نقل کرایا اور بھیجا ہے۔“ ۲

۱۔ البیان الجہنی۔ علی ہاشم اسماء رجال الطحاوی ص ۷۶

۲۔ اسرار المحبۃ ص ۱۱

ص ۱۵ ایضاً ص ۱۵

مولانا اعظمی نے 'اسرار الحجبۃ' کے قلمی نسخہ کو حاصل کر کے نہ صرف یہ کہ اسکو نقل کرایا بلکہ اس نسخہ کی جا بجا تصحیح بھی کی۔ ان کی تصحیحات اس کتاب میں کافی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اسکے باوجود اس نسخہ کی مکمل تصحیح نہ ہو سکی۔ مولانا مذکورہ بالا خط میں آگے لکھتے ہیں:

”اسرار الحجبۃ کے حاشیہ پر بھی جگہ جگہ میرے قلم سے تصحیحات ہیں فرصت نہیں تھی ورنہ اس سے زیادہ مکمل تصحیح ہو گئی ہوتی۔“

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ مغربی پاکستان نے جب اس کتاب کی نشر و اشاعت کا ارادہ کیا تو مجلس علمی کراچی سے ہندوستان سے بھیجے ہوئے مولانا اعظمی کے نسخہ کو مولانا عبد الحمید صاحب سواتی نے حاصل کیا، اسکے علاوہ ایک نسخہ ڈاکٹر محمد شفیع ڈاکٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام سے بھی انہیں ملا۔ اسرار الحجبۃ کی تصحیح و تنقیح میں مولانا سواتی نے مولانا اعظمی کی تصحیحات سے فائدہ اٹھایا، اور جہاں جہاں مولانا اعظمی کے حواشی تھے انکو کتاب کے حاشیہ میں 'الاعظمی' کے رمز کے ساتھ نقل فرمایا۔ مولانا عبد الحمید سواتی مولانا اعظمی کا شکر یہ اس انداز میں ادا کرتے ہیں:

”حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے بھی ہم از حد ممنون ہیں، جنکی تصحیحات سے ہم نے فائدہ اٹھایا اور جو اپنے گرانقدر علمی مشوروں سے ہم جیسے کم علم لوگوں کو نوازتے ہیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، ادام اللہ فیوضہم و برکاتہم۔“

اس طرح سے مولانا اعظمی 'اسرار الحجبۃ' جیسی اہم اور نایاب کتاب کی اشاعت کا بھی وسیلہ بنے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ مولانا عبد الحمید سواتی کی تصحیح اور مقدمہ

کے ساتھ ۱۲۸۳ھ میں اشرف پریس لاہور سے چھپ کر ادارہ نشر و اشاعت مدرہ
نہرۃ العلوم گوجرانوالہ سے شائع ہوئی۔

تکمیل الاذہان

”تکمیل الاذہان“ شاہ رفیع الدین دہلوی کی غالباً آخری تصنیف ہے۔ یہ
کتاب عقلیات اور منطق و فلسفہ کے موضوعات سے متعلق ہے، منطق کی کیا
ضرورت ہے، علوم میں علم منطق کی کیا اہمیت ہے ان تمام امور پر کلام کیا گیا ہے۔ یہ
کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے: باب اول منطق کے بارے میں، باب دوم فن
تحصیل کے بارے میں اور باب سوم امور عامہ کے ان خاص مباحث کے بارے
میں ہے جو کثیر الاستعمال ہیں، جن میں انسان کو اکثر اشتباہ ہو جاتا ہے۔ باب چہارم
تطبیق الآراء کے سلسلہ میں ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلوی نے اس کتاب میں پیچیدہ اور اہم نکات و مسائل
دقیقہ پر بحث کی ہے، اس کتاب کو دیکھ کر شاہ صاحب کے علم کی رفعت و بلندی کا اندازہ
ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایسے پر پیچ مسائل جمع کئے ہیں اور ایسے مباحث سے
بحث کی ہے کہ مولانا عبد الحمید سواتی نے صاف لفظوں میں یہ تنبیہ فرمادی کہ:
”یہ کتاب شاہ رفیع الدینؒ نے مبتدی حضرات کے لئے نہیں تصنیف کی
بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ذہنی بالیدگی اور تکمیل کے لئے اسے تصنیف
کیا ہے، اور اصلی غرض اس سے امام ولی اللہ کے فلسفہ کو ہمہ گیر کرنے اور

۱۔ کتاب کے شروع میں طباعت کا سنہ محرم الحرام ۱۲۸۲ھ درج ہے، لیکن یہ سنہ صحیح نہیں ہے، صحیح
۱۲۸۳ھ ہے۔ یہاں تصحیف ہو گئی ہے؛ کیونکہ عبد الحمید سواتی مقدمہ کے آخر میں جو سنہ درج
کرتے ہیں وہ شوال ۱۲۸۲ھ کا ہے۔

اس کی مشکلات کو آسان کرنے کے لئے تقریب اذہان کی خاطر یہ اہم کتاب تصنیف فرمائی ہے۔“

”تکمیل الاذہان“ کے کچھ حصے ’ابجد العلوم‘ میں شائع ہوئے تھے لیکن اب تک یہ کتاب مکمل طبع نہیں ہو سکی تھی، اس کتاب کی بھی تصحیح و تحقیق مولانا عبد الحمید سواتی نے کی ہے۔ اسکے قلمی نسخے جو مولانا سواتی نے حاصل کئے ان میں ایک نسخہ مجلس علمی کراچی کا بھی تھا، مجلس علمی کو یہ نسخہ بھی مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے ذریعہ حاصل ہوا تھا، اس نسخہ کی بھی مولانا اعظمی نے تصحیح کی ہے۔ مولانا سواتی اس نسخہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”تکمیل الاذہان کا نسبتاً ایک بہتر اور جامع قلمی نسخہ ہمیں مجلس علمی کراچی کے ناظم حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ سے حاصل ہوا، یہ بڑا صحیح اور مکمل نسخہ ہے، دراصل یہ نسخہ فخر المحدثین، سید الفقہاء و تاج العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی دیوبندی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کیا گیا ہے، اور آپ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔“

مولانا اعظمی نے جو تصحیحات کی ہیں، مولانا عبد الحمید سواتی نے انکو حاشیہ میں ’م‘ کی علامت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کتاب پر سنہ اشاعت تو درج نہیں ہے، لیکن مولانا سواتی نے تکمیل الاذہان کے مقدمہ میں جو تاریخ درج کی ہے وہ ۲۹ شعبان ۱۳۸۳ھ ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی کے آس پاس ’تکمیل الاذہان‘ کی اشاعت ہوئی ہوگی۔ اشرف پریس لاہور سے یہ کتاب پہلی مرتبہ مکمل چھپی ہے۔

فیض الحق ملقب بہ دمع الباطل

شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ نے اس کتاب میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مسئلہ پر کلام کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس مسئلہ کی اصل حقیقت اور عقائد میں اسکی اہمیت و ضرورت سے بحث کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں ایک ہی چیز ہے، صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔

مولانا غلام یحییٰ بن نجم الدین بہاری نے بھی اس موضوع پر 'کلمات الحق' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، اس رسالہ میں انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تطبیق بین وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کی تردید کی ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلوی نے اپنی کتاب میں مولانا غلام یحییٰ صاحب بہاری کے موقف کی تردید کی، اور اس سے متعلق تمام اشکالات و اعتراضات کے جوابات دیے۔ شاہ صاحب کی کتاب کا نام 'فیض الحق' ہے اور لقب 'دمع الباطل' ہے، لیکن یہ کتاب اپنے لقب سے معروف ہے۔ بہت ہی حساس اور نازک موضوع پر شاہ رفیع الدینؒ نے قلم اٹھایا، اور الجھے ہوئے مسئلہ کی ایک صاف ستھری شکل پیش کی، شاہ صاحب نے جس چیز کو ثابت کرنا چاہا اسے بڑے پختہ شواہد کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

محسن ترہتی نے 'دمع الباطل' کی توصیف یوں فرمائی:

"و کتابہ دمع الباطل فی بعض المسائل الغامضة من علم

الحقائق معروف اننی علیہ اہلہا۔"

(علم الحقائق کے بعض دقیق مسائل سے متعلق انکی کتاب دمع الباطل

بہت مشہور ہے، اہل علم حضرات نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔)

۱۔ الیانع الجنی۔ علی ہامش اسماء رجال الطحاوی ص ۷۵

’دغ الباطل‘ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے، کچھ حصہ عربی میں ہے تو کچھ حصہ فارسی میں ہے۔

شاہ رفیع الدین کی دوسری کتابوں کی طرح اس اہم ترین کتاب کی بھی اشاعت کی ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو فکر ہوئی، اور مولانا عبدالحمید سواتی اس کے نسخوں کی تلاش میں ایک بار پھر متحرک ہوئے، انہوں نے مولانا اعظمی سے اس سلسلہ میں رابطہ قائم کیا۔

مولانا اعظمی نے اس کے نسخوں کے بارے میں پتہ لگایا، انہیں حاصل کیا، ان کی نقل و تصحیح کرائی اور مولانا سواتی کے پاس ارسال فرمادیا۔ مولانا عبدالحمید سواتی ’دغ الباطل‘ کے سلسلہ میں مولانا اعظمی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”ہم شیخ الحدیث و تاج الفقہاء حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی دامت برکاتہم کا بسمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہیں، جنہوں نے اس کتاب کے نقل کرانے اور پھر اس کے مختلف نسخوں سے تقابل کرانے میں اور پھر خود بھی اس کتاب کے ایک اچھے خاصے حصے کی تصحیح فرمانے میں جو کوشش وسیع فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور تادیر ان کو صحت و عافیت سے رکھے۔“

مولانا سواتی نے مندرجہ بالا اقتباس میں تحریر فرمایا ہے: ”اچھے خاصے حصے کی تصحیح فرمانے..... الخ“ اچھے خاصے حصے سے یہاں کیا مراد ہے؟

جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ’دغ الباطل‘ کے ڈیڑھ سو صفحات کی تصحیح مراد ہے؛ جیسا کہ مولانا سواتی مقدمہ میں ہی ایک دوسری جگہ اس کی

تصریح فرماتے ہیں:

”مولانا اعظمی نے خود بھی دمع الباطل کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات دیکھے اور صحیح بھی فرمائی۔“

یہ کتاب مولانا عبد الحمید سواتی صاحب کی تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ نفیس پرنٹرز لاہور سے مارچ ۱۹۷۶ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔

عظمت صحابہ

جناب خلیل احمد صاحب چشتی صابری امجدی نے ”اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور معاویہ کی صحابیت“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اس کتاب میں انہوں نے حضرت معاویہ کی صحابیت کا انکار کیا تھا، اور ان پر معاندانہ طعن و تشنیع کی تھی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے ”اصحاب رسول اللہ اور معاویہ کی صحابیت“ نامی اس کتاب کا رد ”عظمت صحابہ“ لکھ کر کیا۔ مولانا اعظمی نے صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص حضرت معاویہ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، یا جو ان پر الزام تراشیاں کی جاتی ہیں، ان کو دفع کیا ہے۔

یہ کتاب غیر مطبوعہ تھی، پہلی دفعہ مجلہ ”الماثر“ نے چھ قسطوں میں اس کو شائع کیا ہے، اس کے بعد اس رسالہ کو مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مکنو نے شائع کیا ہے۔

رشحات قلم

مولانا اعظمی کے قلم سے نکلی ہوئی بہت سی تحریریں تو شائع ہو گئیں، جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، لیکن الحمد للہ اب بھی قلمی مسودات میں مولانا کی بہت سی تحریریں کتب، رسائل اور مضامین کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے متعدد مضامین 'المآثر' میں شائع بھی ہو چکے ہیں، اور مزید یہ سلسلہ جاری بھی ہے۔

مولانا اعظمی کے مسودات میں موجود تحریروں، رسالوں میں شائع مضامین و مقالات اور خود مولانا کی تیار کردہ فہرست سے مختلف مضامین اور کتب و رسائل کی ایک فہرست مرتب کی گئی ہے، جو حیات ابوالمآثر کے حوالہ سے قارئین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ فقہ، تاریخ اور مناظرہ کی فصلوں کے آخر میں بھی مولانا کے فقہی مقالات، تاریخ سے متعلق مضامین اور مناظرانہ تحریروں کی علیحدہ علیحدہ فہرستیں پیش کی گئی ہیں۔

۱- ابو عبید کی غریب الحدیث (معارف اکتوبر ۱۹۶۷ء)

۲- ارسال الصحیفہ کا رد

۳- استدراک بر فضل اللہ الصمد

۴- اسلام اور صنف نازک (المومن کلکتہ صفر، ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ)

۵- امام اعظم اور خطیب بغدادی

۶- امام شافعی کے دو سفر نامے

۷- انتشارات انجمن ادبی سندھی

۸- انتقاد صحیح پر تجلی کا تبصرہ پڑھ کر

۹- اوزان و مثاقیل

۱۰۔ بحث نسخ

۱۱۔ بحر مل اور بحر سرلج

۱۲۔ بسلسلہ ”قافلہ اہل دل“ (الفرقان دسمبر ۱۹۷۳ء)

۱۳۔ پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

۱۴۔ تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاءا جم

۱۵۔ تبصرہ برج الفصح الاغلاط الکتابیۃ (الفرقان شعبان ۱۳۷۱ھ)

۱۶۔ تبصرہ برز جاجۃ المصانح (الفرقان محرم ۱۳۷۱ھ)

۱۷۔ تحقیقات مفیدہ (الفرقان سالنامہ ۱۳۵۵ھ)

۱۸۔ تخریج زیلعی (معارف جولائی ۱۹۳۰ء، الفرقان رجب

۱۳۵۹ھ، المآثر محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۱۳ھ)

۱۹۔ تردید اہل قرآن

۲۰۔ تردید سرسید

۲۱۔ جمع قرآن

۲۲۔ چہ دلا درست دزدے کہ بکف چراغ دارد

۲۳۔ حجیت حدیث (القاسم ۱۱ اپریل و ۱۰ مئی ۱۹۲۲ء)

۲۴۔ حضرت معاویہ کی شان میں سوء ادبی اور اسکا جواب (النجم جمادی الاولیٰ

والآخرة ۱۳۳۹ھ، المآثر ج: ۱، ۲، ۳، بعنوان حضرت امیر معاویہؓ کا مرتبہ و مقام)

۲۵۔ حضرت معاویہ کے متعلق ایک سوال

۲۶۔ خدا نور ہے

۲۷۔ الدراریۃ فی تخریج احادیث الہدیۃ کانادر نسخہ (معارف اگست ۱۹۵۰ء)

۲۸۔ دو شہرک اجازت نامے (معارف ۱۹۳۷ء)

۲۹- رجال بخاری، کاندان شکن جواب (الداعی رجب وشعبان ۱۳۶۰ھ)

۳۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی زندگی

۳۱- زراعت و جاگیر داری

۳۲- سید الشہداء کی تحقیق (المآثر ربیع الآخر تا جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ)

۳۳- سیرۃ النبی شبلی پر ایک نظر

۳۴- السیف الباتر

۳۵- سیف و قلم (دارالعلوم اپریل ۱۹۵۷ء)

۳۶- عباسی کار و قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے

۳۷- عظمت صحابہ، خواجہ حسن نظامی کے باطل خیالات کی تردید (العدل ۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء)

۳۸- علم رجال کی اہمیت

۳۹- ”عہد زریں“ پر تبصرہ

۴۰- غریب الحدیث

(معارف فروری ۱۹۶۸ء)

۴۱- فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (معارف اپریل ۱۹۷۹ء)

۴۲- قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب رجال السند والہند پر ایک نظر

۴۳- قرون اولیٰ میں حفظ حدیث کا اہتمام (البلغ جون ۱۹۵۴ء، دارالعلوم مارچ ۱۹۵۹ء)

۴۴- قیامت کے دن پہلا سوال

۴۵- محدثین پر سلطنت کی ہوا خواہی کا الزام (دارالعلوم محرم و صفر ۱۳۶۱ھ)

۴۶- مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت (ارشاد یکم مئی ۱۹۲۷ء)

۴۷- مضمون خلفاء شاہ غلام علی پر کچھ اضافہ

۴۸- مقامات تصوف پر تبصرہ و تنقید

۴۹- مناقب اعظمیہ

۵۰۔ مولوی سامرودی کے سوالات کا مسکت جواب

۵۱۔ واغتصموا بحبل اللہ (القاسم ۲۵ اگست، ۱۰ ستمبر ۱۹۲۲ء)

۵۲۔ وما أرسلناک الا رحمة للعالمین یا شان رحمة للعالمین (ارشاد حکیم مکی ۱۹۲۷ء،
الماثر محرم تاریخ الاول ۱۳۲۰ھ)

۵۳۔ ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات (برہان فروری ۱۹۵۳ء)

۵۴۔ ہندوستان میں علم حدیث اور قاضی اطہر

۵۵۔ معجزات و کرامات (الفیض، مترس ربیع الاول تا جمادی الثانیہ اور رجب ۱۳۴۳ھ)

۵۶۔ بناء عائشة صدیقة رضی اللہ عنہا

۵۷۔ ترجمہ کتاب الترغیب والترہیب

۵۸۔ سیرۃ طحاوی

۵۹۔ قاضی نامہ بحواب جولایہ نامہ

۶۰۔ لغات حدیث

۶۱۔ مفتاح النخو

۶۲۔ ترجمہ موطا امام مالک

باب پنجم

مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں

باب پنجم

مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں

مولانا اعظمی نے ہمہ گیر علمی و تحقیقی، سیاسی و سماجی خدمات انجام دیں، ایک طرف علمی، تصنیفی اور مطالعاتی اشغال تھے، تو دوسری جانب وقت کی سیاست و قیادت میں عملی شرکت، ایک طرف اکابر امت، علماء و فضلاء کے ساتھ علمی مشاورت تھی، تو دوسری جانب زمانہ شناس اور نبض آشنائے سیاست کے ساتھ مل کر مقتضائے حال کے مطابق لائحہ عمل کی ترتیب و تہذیب کی فکر تھی؛ ظاہر ہے جس کا میدان عمل اتنا وسیع ہو، جس کے کام کی جہتیں متنوع ہوں، اسکے متعلقین و احباب، مداح و شید ابھی بے شمار ہوں گے۔

مولانا میں آخر وہ کون سی چیز تھی جس نے ہر طبقہ علم و مکتبہ فکر کو ان کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے کام کے دائرے میں وسعت پیدا کی؟ اگر اس سوال کے جواب کے بارے میں سوچا جائے تو بلاشبہ ہمیں صرف اور صرف ایک ہی جواب ملے گا: ”جوہر علم“ جس نے دور دراز ملکوں کے اصحاب فضل و کمال کو ہندوستان کے ایک گوشہ مہونا تھ بھنجن کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

مولانا اعظمی کا شہرہ دور طالعلمی سے ہی ہونے لگا تھا، خواہ اس شہرت کا سبب ان کی قوت حافظہ ہو یا علمی لیاقت و استعداد، اساتذہ نے اسی زمانہ میں شاگرد کے تابندہ مستقبل کی پیشین گوئیاں کر دی تھیں۔ جب مولانا مسند درس پر بیٹھے تو ان

کے درس کی بھی شہرت ہونے لگی، اور جب قلم سنبھالا تو قلم گہر بار سے ایسی تصنیفات و تحقیقات وجود میں آئیں کہ پورے ملک میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ بڑے بڑے علماء مولانا اعظمی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے، اور اس طرح علم و تحقیق میں ان کی ایک امتیازی شناخت بن گئی۔

اور جب عالم اسلام کے محققین پر مولانا کے بعض تنقیدی مضامین و مقالات شائع ہوئے تو پھر کیا تھا! گویا ان کی شہرت و مقبولیت کو بال و پر نکل آئے، عالم اسلام کے ممتاز محدثین، محققین اور ناقدین مولانا اعظمی کو اجلال و اکرام کی نگاہ سے دیکھنے لگے، پیچیدہ مباحث میں ان کی رائے کے منتظر و متلاشی رہنے لگے۔ مصر و شام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم و فضل مولانا کے ایسے شیدا ہوئے کہ ان کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے۔ ایک مکی عالم کا بیان ہے کہ ہم مولانا اعظمی کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے باپ دادا کو جانتے ہیں۔

عرب کے ارباب نظر اور اصحاب فضل، جن کی سرشت میں سخاوت ہے، نے مولانا کے تبحر علمی کا بلند آہنگ میں اعتراف کیا ہے۔ سخاوت کا مفہوم یہی نہیں کہ کسی کی بھرپور ضیافت کر دی جائے یا جو مانگے دے دیا جائے، بلکہ سخاوت و فیاضی یہ بھی ہے کہ سامنے والے کے علم و فضل اور کمال کا بے لاگ اعتراف کیا جائے۔

عرب کے دلوں میں مولانا کے لئے عزت و احترام کا یہ جذبہ تھا کہ جب مدینہ یونیورسٹی کے صدر کا عہدہ خالی ہوا تو جامعہ کی کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ تجویز پاس کی کہ صدارت کے لئے ۲۰ ہزار ریال مشاہرہ پر مع لوازم رہائش مولانا اعظمی کو بلایا

جائے، لیکن مولانا نے شکریہ کے ساتھ اس تجویز کو واپس فرما دیا۔
 علمی کارناموں کی بنیاد پر ادب و احترام کا یہی جذبہ کارفرما تھا کہ موقر عالمی
 اداروں اور اکیڈمیوں نے مولانا کو اپنا رکن اور ممبر بنانا باعث فخر سمجھا۔ اسی سلسلہ کی
 ایک کڑی بغداد کا مشہور علمی ادارہ المجمع العلمي العراقي ہے، جس نے ۱۹۸۹ء میں مولانا
 کو اپنا رکن منتخب کیا، المجمع العلمي العراقي (IRAQI ACADEMY) کے چیئرمین
 ڈاکٹر صالح احمد العلی نے مولانا کے نام کے انتخاب کے بعد انہیں یہ مکتوب ارسال کیا:

”یسرني أن أبلغكم بأن مجلس المجمع العلمي العراقي في
 جلسته العاشرة المنعقدة في الثاني والعشرين من شهر
 رجب سنة ۱۴۰۹ھ الموافق للثامن والعشرين من شهر
 شباط سنة ۱۹۸۹م قرر انتخابكم عضواً مؤزراً فيه تقديراً
 لمكانتكم العلمية الرفيعة و مجهوداتكم في ميادين اللغة
 والثقافة مما يعني المجمع بدراسة.

وإنني إذ أهنئكم بهذا الانتخاب الذي يوثق العلاقة
 العلمية والثقافية، أرجو تزويد المجمع بموجز عن
 سيرتكم العلمية وعناوين أبحاثكم المنشورة ليحفظ مع
 الاعتراز به، في سجلاته.....“ ۱

(میں مسرت کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ المجمع العلمي العراقي کی
 کمیٹی نے ۲۴ رجب ۱۴۰۹ھ ۲۸ فروری ۱۹۸۹ء کو منعقد ہونے والے
 اپنے دسویں اجلاس میں آپ کے بلند علمی مقام اور ادب و ثقافت کے

میدان میں آپ کی کاوشوں کی تدریجی ترقی کرتے ہوئے اکیڈمی کا معاون ممبر منتخب کیا ہے۔

آنجناب کو اس انتخاب کی مبارکباد دیتے ہوئے، جو علمی و ثقافتی رابطے کو مضبوط کرے گا، امید کرتا ہوں کہ اکیڈمی کو اپنی علمی زندگی اور شائع شدہ تحقیقات کے ناموں سے مختصر معلومات فراہم فرمائیں گے، تاکہ اسے فخر کے ساتھ اکیڈمی کے ریکارڈ میں محفوظ رکھا جائے۔

شیخ ابو نعیمہ تو مولانا کے شیفتہ و گرویدہ تھے، جب ۱۹۷۹ء میں ندوۃ العلماء کے وزیننگ پروفیسر کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے، تو ندوہ کی انتظامیہ نے مولانا اعظمی کو بھی تشریف لانے اور شیخ کے ساتھ قیام فرمانے کی گزارش کی، جس کو مولانا نے قبول فرمالیا، اور شیخ کے ساتھ طویل قیام فرمایا۔ مولانا نور عالم خلیل امینی کا بیان ہے کہ:

”دونوں شہ بازوں کے قرآن السعدین اور اجتماعی قیام کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ علم و کمال کی مینہ برس رہی ہو۔“

شیخ کے مولانا سے قوی ارتباط کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ مولانا اعظمی سے ملاقات کرنے ان کے شہر مکہ تشریف لے گئے۔

بہر حال جنہوں نے مولانا کو دیکھا، اور وہ جو انہیں نہ دیکھ سکے، خواہ وہ اسلامی ممالک کے ہوں یا ایشیا کے، سبھی مولانا اعظمی کے علم، وسعت مطالعہ، قوت حافظہ، ذہانت اور بے باک نقد کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ اس باب میں مولانا کے بارے میں ان کے اکابر و اصاغر، اور معاصر اہل علم کی کچھ منتخب آراء پیش کی جا رہی ہیں؛ تاکہ قاری کو مولانا کی مقبولیت، شہرت اور علم میں ان کے مقام بلند کا اندازہ ہو سکے۔

دوسروں کی آراء سے کسی شخصیت کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ زبان خلق نقارۃ خدا ہوتی ہے۔ ان آراء سے بہر حال کسی شخص کی مرجعیت کا اندازہ تو لگایا ہی جاسکتا ہے۔ اور اس طرح سے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمن اعظمی اپنے وقت کے ایسے مرجع تھے جن کی وسعت مطالعہ، اجتہاد فکر، تحقیقی نکتہ رسی اور اپنے اندازِ نظر سے خدمتِ دین کا اعتراف عرب و عجم سبھی کو تھا۔

شیخ احمد محمد شاکر | شارح مسند احمد بن حنبل مولانا اعظمی کی علمی جلالت و وجاہت سے کس قدر متاثر ہیں، اس کا اندازہ شکر یہ کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے استدراکات کے ملنے پر مولانا اعظمی کو لکھا، اس خط کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

”حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي..... جاءني كتابكم الأول النفيس..... أما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية، ولا أقول هذا مجاملة..... وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدوني من إشاراتكم وإرشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة وأنتم كما رأيت من عملكم من أعظم العلماء بها في هذا العصر فالحمد لله على توفيقكم..... ثم أكرر الرجاء أن لا تحرموني من آرائكم النيرة وتحقيقاتكم النفيسة، حفظكم الله وبارك فيكم.

كتبه المخلص

احمد محمد شاکر

(آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا، آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلند رتبہ ہیں، میں یہ بات محض آپ کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص دل کے ساتھ آپ کا شکر گزار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبہ سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، اور جہاں تک میں نے آپ کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے عظیم تر علماء میں سے ایک ہیں، فالحمد للہ!)

شیخ عبدالفتاح ابو غندہ | شیخ ابو غندہ کو مولانا اعظمی سے بے حد محبت و عقیدت تھی، وہ مولانا کے گرویدہ اور مداح تھے، شیخ کو مولانا سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ پروفیسر اجتیباندوی (جنہیں شیخ ابو غندہ کی رفاقت میں کئی برس تدریسی کام کرنے کا شرف حاصل ہے) کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ:

”علماء ہند کے تذکرہ کے وقت حضرت محدث اعظمی کا ذکر ضرور آتا، ان کا نام آتے ہی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، شیخ ابو غندہ مدظلہ حضرت محدث اعظمی کے بے حد مداح، فریفتہ اور گرویدہ و قدرداں ہیں۔“

مولانا اعظمی کی تحقیق سے جب مسند حمیدی شائع ہوئی، تو شیخ نے مجلہ الجمع العلمی العربی دمشق میں اس پر شاندار ریویو لکھا، جسکو مسند حمیدی کے تذکرہ میں نقل کیا جا چکا ہے، اسی طرح جب شیخ ابو غندہ کی تحقیق سے الرفع والکامل شائع ہوئی، اور جب مولانا نے اس پر چند استدراکات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے، تو شیخ نے انہیں بعد کے ایڈیشن میں شکریہ و ستائش کے الفاظ کے ساتھ شائع کیا۔ شیخ مولانا اعظمی کے فضل و کمال کے کس قدر معترف تھے، اس سلسلہ میں شیخ کی ہی رقم کردہ ایک تحریر ملاحظہ ہو:

”العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن
الاعظمي صاحب التعليقات البديعة، والتحقيقات النادرة،
العالم بالرجال والعلل وتعليقاته وتحقيقاته السنية على
”سنن سعيد بن منصور“ و ”الزهد“ لابن المبارك و ”مسند
الحميدي“ و (استدراكاته) على الشيخ احمد شاكر في
تعليقه على ”مسند أحمد“ ثم (تعليقاته الحافلة) على
”مصنف عبد الرزاق“ الذي يطبع الآن بعون الله، كلها تنطق
بسمو فضله و بسطة يديه في العلم الشريف.“

(علامہ محدث ماہر فقیہ شیخ حبیب الرحمن الاعظمی، نادر اور انوکھی تعلیقات
وتحقیقات کے مالک، فن رجال و علل کے عالم ہیں، سنن سعید بن منصور،
ابن مبارک کی کتاب الزہد، مسند حمیدی پر ان کی تعلیقات و تحقیقات، مسند
احمد کی تعلیق و تحقیق میں شیخ احمد شاكر پر ان کے استدراکات، پھر زیر طبع
مصنف عبد الرزاق پر جامع حواشی، علم و فضل میں ان کی بلندی اور اس
متبرک علم میں ان کی دسترس کی شاہد ہیں۔)

شیخ زاہد الکوثری [زاہد الکوثری محقق، محدث اور بلند پایہ عالم تھے۔ ان کی زندگی علم
کے فروغ، دفاع حقیقت اور حق گوئی کے لئے وقف تھی، اسی حق گوئی کی پاداش میں
انہیں جلاوطنی کی سزا سے بھی دوچار ہونا پڑا، شیخ کی ولادت استنبول ترکی میں ہوئی تھی،
جلاوطنی کے بعد مصر کو اپنا مستقر بنایا۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے جب ’درايہ‘ کے
ایک قلمی نسخہ سے قاسم بن قطلوبغا کے استدراکات کو نوٹ کر کے زاہد الکوثری کے پاس
ارسال فرمایا، جس کی تفصیل ’مدیۃ المعی‘ کے تذکرہ میں ملاحظہ ہو، تو زاہد الکوثری نے

مقدمہ میں اس کا شکریہ یوں ادا کیا۔

”هذا و انى أشكر مولانا العلامة التحرير والجهيد الخبير
أبا المآثر حبيب الرحمن الأعظمي السالف الذكر على
تفضله بكتابة التعليقات بخط يده المباركة و مبادرته
بإرسالها إلى هذا العاجز مع ما له من الأشغال الكثيرة؛ فإنه
هو السبب الأوحى لنشر الاثنین معاً.“^۱

(میں مولانا علامہ نحریر جہد خیر ابو المآثر حبيب الرحمن الأعظمی جن کا ذکر
ابھی گزر چکا ہے، کی کرم فرمائی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہجوم اشغال
کے باوجود ان تعلیقات کو دست مبارک سے لکھا، اور فوراً اس عاجز کو
ارسال فرمادیا، وہ ان دونوں کی اشاعت کا واحد سبب ہیں۔)

اور زاہد الکوشی نے فرط مسرت میں ان الفاظ میں دعائیں دیں:

”فأدعو الله سبحانه أن يطيل بقاء الأستاذ الجليل المشار
إليه في خير و عافية و يمتع المسلمين بعلومه النافعة، و
يكافئه مكافأة المحسنين إزاء هذا الفضل الجسيم.“^۲

(میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ استاذ جلیل کو خیر و عافیت سے تادیر باقی
رکھے، اور ان کے نافع علوم سے مسلمانوں کو نفع پہونچائے، اور اس عظیم
احسان کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔)

ڈاکٹر عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر | ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کے علم کی بلندی اور
فضل و کمال سے جہان علم و فن بخوبی واقف ہے، مصر کے علماء میں انکو امتیازی شان

۱۔ مدیۃ اللمعی ص ۸

۲۔ ایضاً ص ۶

حاصل تھی، ان کے یہاں شریعت و طریقت کا حسین امتزاج دکھتا ہے، شیخ الازہر کے عظیم منصب پر بھی فائز رہے۔ مولانا اعظمی کے علم کے معترف اور مداح تھے۔

حج کا موسم تھا، شیخ الازہر عبدالخلیم محمود اور عالم اسلامی سے بہت سے علماء حج و زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ مصر، سعودیہ ہندوپاک کے علماء کے ایک مجمع میں جس میں علامہ محمود حسنین مخلوف، علامہ اعظمی، علامہ سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی بھی موجود تھے، شیخ الازہر نے علماء کے اس مجمع میں حدیث شریف اور فن رجال میں مولانا اعظمی کے مقام بلند کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

”إنني أشهد أنه إذا كان في العالم كله من يستحق أن يلقب
بالمحدث الأعظم، فهذا هو۔“ ۱

(میں شہادت دیتا ہوں کہ پوری دنیا میں محدث اعظم کے لقب کا اگر کوئی
مستحق ہے تو یہ شخص ہے۔)

ڈابھیل کے ایک جلسہ میں جس میں شیخ الازہر بھی موجود تھے، شیخ محمد حسین
ذہبی وزیر اوقاف مصر نے تقریر کرتے ہوئے مولانا اعظمی کے بارے میں فرمایا:

”اعتقد أنه ليس له مثل في علم الحديث في كافة الهند۔“

(میرا خیال ہے کہ علم حدیث میں پورے ہندوستان میں انکی کوئی نظیر نہیں۔)

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالخلیم نے اس پر ٹوکتے ہوئے اضافہ فرمایا:

”بل في الدنيا كلها فيما نعلم۔“ ۲

(بلکہ ہمارے علم کے مطابق پوری دنیا میں انکی کوئی مثال نہیں۔)

۱۔ البعث الاسلامی اپریل مئی ۱۹۹۳ء ص ۸۷، حیات ص ۵۷۶، المآثر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء ص ۳۳

۲۔ البعث الاسلامی ۱۹۹۳ء ص ۹۰

شیخ محمود محمد شاہ | آپ شیخ احمد شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں، محقق، مؤرخ اور صاحب نظر عالم ہیں، آپ کو بھی مولانا اعظمی سے تعلق و مناسبت تھی، اسکی شہادت 'صدق جدید' لکھنؤ کے مراسلہ بعنوان "علماء مصر و علماء ہند - ایک سرسری تقابل" میں ملتی ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی سے ایک ہندوستانی ندوی طالب علم نے مراسلہ میں لکھا:

"یہاں کے مشہور فاضل محمود شاہ صاحب مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ بعض اعتبار سے انکے بھائی مشہور محدث احمد شاہ صاحب مرحوم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔" ۱

شیخ ناصر الدین الالبانی | شیخ البانی مشہور محدث ہیں، تنقید و تردید میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود مولانا اعظمی کے علم و تحقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، صحیح الترغیب والترہیب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

ومما زادني رغبة في الإقبال عليه أن محققه الفاضل الشيخ
حبیب الرحمن الأعظمی " ۲

(اس کتاب) کی طرف میری توجہ اس لئے بھی بڑھ گئی کہ اس کے محقق
فاضل شیخ حبیب الرحمن الاعظمی ہیں)

شیخ علوی بن عباس مالکی | شیخ مالکی نہایت متقی اور بلند پایہ عالم تھے، حرم شریف میں درس دیا کرتے تھے، ۱۹۶۵ء میں شیخ سے انکے گھر پر مولانا اعظمی کی پہلی ملاقات ہوئی، شیخ نے مولانا کا اکرام کیا اور اپنی بعض کتابیں ہدیہ کیں ۱۹۷۱ء میں شیخ مالکی اور مولانا اعظمی کے مابین دوسری ملاقات ہوئی، مولانا اعظمی کا بیان ہے کہ شیخ نے ان کا اس مرتبہ زبردست اکرام کیا، ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور مصنف

۱۔ صدق جدید یکم جولائی ۱۹۶۰ء ج: ۱۰ ش: ۳۱ ص ۷

۲۔ صحیح الترغیب والترہیب ص ۹۵

عبدالرزاق کی طباعت کو مکمل کرانے کی ترغیب دی۔
مولانا اقبال اعظمی لندن سے ایک خط مکتوبہ ۲ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں تحریر

فرماتے ہیں:

”شیخ علوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں، وہ، شیخ حسن مشاط اور شیخ ابراہیم کردی، کہنا چاہئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء و محدثین کی یہ آخری تین یادگار تھیں، ان تینوں کو حضرت مولانا (حبیب الرحمن صاحب الاعظمی) مدظلہ کی معیت میں ہی دیکھنے کی اس ناچیز کو بھی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ شیخ علوی جو ’سید‘ بھی تھے مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں:

”میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی ہیں۔“ ۱

شیخ عبداللہ زمزمی مکیؒ | راہ سلوک کے سالک، عالم باعمل اور صاحب الرائے بزرگ تھے۔ اصلاً لاہور کے تھے، آپ کے والد ماجد مکہ آئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ مولانا زمزمی کو مولانا اعظمی سے فریفتگی کی حد تک تعلق تھا، دونوں بزرگوں کی باہم کوئی ملاقات نہ تھی، محبت و عقیدت کا یہ رشتہ خط و کتابت سے شروع ہوا، مولانا اعظمی کی مولانا زمزمی سے پہلی ملاقات ۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ مولانا زمزمی کو مولانا اعظمی سے کس درجہ قلبی لگاؤ اور ان کے دل میں کس قدر مولانا کا احترام تھا، اس کا اندازہ مولانا زمزمی کے خطوط سے ہوتا ہے۔

مولانا زمزمی سنیچر ۲ رمضان ۱۳۶۹ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”صاحب الفضيلة سيدي الجليل مولانا حبيب الرحمن
الأعظمي أيداه الله تعالى آمين

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وصل كتابكم
الكريم وفي شدة السرور وضعت على رأسي وعيني، لله
الحمد والشكر والمنة والثناء الجميل، ووفقك وأعانك،
ان يوماً نجتمع بك فيه لهو يوم الحياة الخالد وجبينها وغرة
أيامنا، ان يوماً نراك فيه لهو يوم السعادة والهناء!
(فضيلت مآب، بزرگوار! مولانا حبيب الرحمن الأعظمي اللہ آپ کی تائید
ونصرت فرمائے

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ موصول ہوا، جوش مسرت میں سر
آنکھوں پر اس مکتوب کو رکھا، اللہ کی حمد و ثناء اور اس کا شکر و احسان ہے، اللہ
آپ کو توفیق دے اور مدد فرمائے، جس روز ہم ایک دوسرے سے ملیں گے،
وہ دن سب سے یادگار اور شاندار دن ہوگا! جس دن ہم آپ کو دیکھیں
گے وہ سعید و مبارک دن ہوگا۔)

مولانا زمزمی نے جب مولانا اعظمی کی کتاب ’اعیان الحجاج‘ دیکھی، تو اس
کے مطالعہ کے بعد مولانا اعظمی کے نام خط میں ’اعیان الحجاج‘ پر شیخ زمزمی نے اپنے یہ
تاثرات لکھے:

”یا صاحب الفضيلة قال في كشف الظنون عن كتاب
الفوائد لابن رجب: إنها من عجائب الدهر، وإن كتابكم
أيضاً من عجائب الدهر في بابه وأسلوبه ومحتوياته،

وابتدائکم فیہ بأشرف المخلوقات جعلہ من أعجب
العجائب الہاماً من اللہ سبحانہ وتعالیٰ

ہذا اول کتاب من نوعہ، فجزاکم اللہ عن الأمة
الاسلامیة خیر الجزاء، وهو من الفنون التي یمیل إليها قلبی
ودائماً أبحث فیہا فکأنہ صنف لی، لقد اهتز قلبی له وفرح
فرادی بہ، وانشرح صدري منه، فجزاکم اللہ عنی خیر
الجزاء وأثابکم علی عملکم وبارک لنا فیکم ونفعنا
بعلومکم، وکثیراً ما کنت أراجع کتب الطبقات لهذه الغایة
فأغناني اللہ بکتابکم هذا، بارک اللہ فی تصانیفکم،
وبارک اللہ فی حیاتکم وبارک اللہ فی أعمالکم۔“۱

(فضیلت مآب! کشف الظنون میں ابن رجب کی کتاب الفوائد کے
بارے میں لکھا ہے کہ وہ عجائبات زمانہ میں ہے، آپ کی یہ کتاب بھی
موضوع، اسلوب اور مضامین کے اعتبار سے عجائبات زمانہ میں سے ہے،
الہامی طور پر اشرف المخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کتاب کی ابتداء
نے اس کو عجائبات میں سے بھی ایک اعجوبہ بنا دیا ہے۔

یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اللہ آپ کو امت مسلمہ کی جانب سے
بہترین جزاء دے، اور یہ ان فنون سے متعلق ہے جنکی طرف میرا قلبی
میلان ہے، ہمیشہ (کچھ نہ کچھ) اسمیں ڈھونڈتا ہی رہتا ہوں، ایسا لگتا ہے
جیسے آپ نے اسے میرے ہی لئے تصنیف کیا ہے، دل اس سے خوش اور
طبیعت منشرح ہو گئی، اللہ آپ کو بہترین جزاء سے نوازے، آپ کے اس

جیسے آپ نے اسے میرے ہی لئے تصنیف کیا ہے، دل اس سے خوش اور طبیعت منشرح ہوگئی، اللہ آپکو بہترین جزاء سے نوازے، آپ کے اس کام کا انعام دے، عمر دراز فرمائے، اور آپکے علوم سے ہمیں نفع پہنچائے۔ اس مقصد کے لئے اکثر مجھے طبقات کی کتابوں کی طرف مراجعت کرنی پڑتی تھی، لیکن اب آپکی اس کتاب نے مجھے ان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اللہ آپ کی تصانیف، عمر اور آپکے کاموں میں برکت نصیب فرمائے۔

ڈاکٹر عبدالمعید نے بابا خلیل صاحب منوی کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ:

”ایک بار میں مولانا زمزمی صاحب کے پاس ملاقات کے لئے گیا، میرے ہاتھ میں مولانا (حبیب الرحمن صاحب الاعظمی) کی کتاب رہبر حجاج تھی، انہوں نے پوچھا کون سی کتاب ہے، میں نے کہا مولانا اعظمی کی رہبر حجاج ہے، کتاب لے کر کھڑے ہو گئے اور سر پر رکھ لیا اور کئی بار فرمایا کہ مولانا تورہبر عالم ہیں، مولانا تورہبر عالم ہیں۔“

شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز حدیث وفقہ میں آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، عالم عرب کیا! پوری دنیا میں آپ کے علم اور زہد و تقویٰ کا شہرہ تھا، مولانا اعظمی کے علم کے معترف و قدرداں تھے، مولانا افضال الحق قاسمی علامہ ابن باز اور مولانا اعظمی کی ملاقات کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

”حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے، مولانا اسعد صاحب بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہو گیا، جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لئے کہا، حضرت مولانا تیار ہو گئے

وہاں پہونچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا، کیونکہ ابن باز نا پینا محدث ہیں، ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے، جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا، مولانا نے فرمایا: ”انا حبیب الرحمن الاعظمی من الہند“ تو شیخ عرب اٹھ کر کھڑے ہو گئے حضرت مولانا سے معاف فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آ کر مجھے شرمندہ کیا، مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انہوں نے سکون پایا۔^۱

شیخ سید یوسف ہاشم الرفاعی کویت کے جید عالم دین اور سابق وزیر مواصلات ہیں۔^۲ مولانا اعظمی کی مقبول ترین کتاب ’الاکبانی شذوذہ وأخطاءہ‘ کے مقدمہ میں صفحہ ۶ پر مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”إنہ إمام کبیر، ومحقق جلیل، ومحدث نبیل شہیر، وهو العلامة الشیخ حبیب الرحمن الأعظمی الہندی خادم السنۃ النبویۃ بحق وعلم وأدب وورع وتقوی اللہ سبحانہ، وهو یقوم بتحقیق کتب السنۃ النبویۃ ونشرها، دون جمعة وطنطنہ، أو دعايات وادعاءات فارغة خرقاء.....“^۳

(وہ امام کبیر، محقق جلیل اور محدث نبیل و شہیر علامہ حبیب الرحمن الاعظمی ہندی ہیں، علم و ادب اور زہد و تقوی کے ساتھ حدیث شریف کی خدمت جیسا کہ اس کا حق ہے، انجام دے رہے ہیں، کتب حدیث کی تحقیق

۱۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ۲۹۲:۴-۲۹۳

سے لگے رہتے ہیں۔)

اصحاب علم و فضل کے نزدیک مولانا اعظمی کا علمی مقام کیا ہے، شیخ سید یوسف رفاعی اس کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں اسی مقدمہ میں کرتے ہیں کہ:

”فإن اسم الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي مقرون عند كل عارفه في المشرق والمغرب بالفضل والتقدير والإجلال والمحبة، والخضوع لعلمه ومعرفته بالسنة النبوية، وكبير خدمته لها وعظيم أدبه مع العلماء والأئمة الأجلاء.“

(شیخ حبیب الرحمن الاعظمی کا نام مشرق و مغرب میں ان کے جاننے والوں کے نزدیک بہت ہی اہمیت و عظمت اور محبت و تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ان کے علم و معرفت اور اس سلسلہ میں ان کی عظیم خدمات اور علماء و جلیل القدر ائمہ کے لئے ان کے غایت ادب کے سبب، ان کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔)

شیخ شعیب الارناؤوط | نامور محقق و محدث ہیں، حدیث کی بہت سی اہم کتابیں آپ کی تحقیق و تعلیق سے مزین ہو کر منظر عام پر آئیں، انہیں میں علی بن بلبان کی ’الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان‘ بھی ہے۔

بخاری کی ”فیہ نظر“ کی اصطلاح کی بحث اور اس سلسلہ میں مولانا اعظمی کی رائے استدراکات کے ذیل میں پیش کی گئی ہے، اصطلاح بخاری ”فیہ نظر“ کے بارے میں مولانا اعظمی کی تحقیق اور رائے کی داد دیتے ہوئے شیخ شعیب الارناؤوط نے ’الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان‘ میں لکھا:

”قلت: وهذه فائدة نفيسة تنبئ عن إمامة هذا الشيخ حفظه

اللہ و نفع بہ علم الجرح و التعديل، و دراية واسعة بقضاياہ“^۱
(میں کہتا ہوں کہ یہ ایک مفید اور عمدہ بحث ہے، اس بحث سے علم جرح
و تعديل میں شیخ کی امامت اور اس کے مسائل کے بارے میں ان کی
وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے۔)

شیخ عابد الفاسی الفہری | فاس (مراکش) کی مشہور لائبریری خزائنہ جامعہ القرویین
کے محافظ و نگراں اور عالم و فاضل شخص ہیں، مصنف عبد الرزاق مولانا اعظمی کی تحقیق
سے شائع ہو کر ان کے پاس پہونچی، تو انہوں نے ۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء کو مکتب اسلامی
بیروت کے پتہ پر ایک خط لکھا، جسکو بیروت والوں نے مولانا اعظمی کے پاس بھیج دیا،
اس خط کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو:

”إن الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي هذا أجدر الناس
بتحقيق كتب السنة والتعليق عليها، فهو أحد أفراد هذا
العصر الذي هيأ نفسه وهياًه الله تعالى لتجديد هذا الدين
تصديقاً لقول النبي عليه السلام إن الله يبعث على رأس كل
مائة من يجدد لهذه الأمة أمر دينها.....“^۲

(شیخ حبیب الرحمن الاعظمی کتب حدیث کی تحقیق و تعلیق کے سب سے زیادہ
حقدار ہیں، اس زمانہ کے وہ ایک ایسے فرد ہیں جنہوں نے خود کو آمادہ کیا،
اور اس دین کی تجدید کے لئے اللہ نے بھی انکو تیار کیا، نبی علیہ الصلوٰۃ
والسلام کے اس قول کا مصداق بنا کر کہ اللہ تعالیٰ ہر سو سال پر ایک ایسا شخص
پیدا کرے گا جو اس امت کے لئے دینی معاملات کی تجدید کرے گا۔)

ڈاکٹر محمود طحان | صاحب نظر عالم ہیں، علوم حدیث میں ان کی معلومات وسیع ہیں، 'اصول التخریج ودراسة الأسانید' ان کی مشہور کتاب ہے، مولانا اعظمی کے علم پر ان کو کس درجہ اعتماد اور بھروسہ ہے ان کی اس تحریر سے اسکا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

”هذا وإن التعليقات التي يضعها بعض العلماء الذين لهم عناية بالحديث وعلومه في هذا العصر أثناء تحقيقهم لبعض الكتب المشتملة على أحاديث غير معروفة المخرج، يمكن الاستفادة منها لمعرفة مخارج تلك الأحاديث.“

ومن هؤلاء العلماء على سبيل المثال، الشيخ أحمد شاكر رحمه الله، وأخوه الشيخ محمود شاكر، والشيخ عبد الفتاح أبو غدة، والشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، والشيخ محمد فؤاد عبد الباقي رحمه الله وغيرهم جزى الله تعالى الكل أفضل الجزاء وأجزل مثوبتهم. ۱

(اس زمانہ کے بعض وہ علماء جن کی حدیث وعلوم حدیث پر نظر اور توجہ ہے، غیر معروف المخرج احادیث پر مشتمل کتابوں کی تحقیق کے دوران جو تعلیقات لکھتے ہیں، احادیث کے مخارج جاننے میں ان تعلیقات سے استفادہ کیا جائے۔

ان علماء میں مثال کے طور پر شیخ احمد شاكر، ان کے بھائی شیخ محمود محمد شاكر، شیخ عبد الفتاح ابو غدة، شیخ حبيب الرحمن الأعظمي، شیخ محمد فؤاد عبد الباقي رحمۃ اللہ علیہم ہیں، ان سبھی حضرات کو اللہ تعالیٰ بہترین جزاء اور اجر جزیل عطا فرمائے۔)

شیخ محمد عوامہ، مدینہ منورہ | شیخ عوامہ مولانا اعظمی کے انتقال پر ان کے صاحبزادے محترم حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے نام تعزیتی خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”آپ تنہا اس مصیبت میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ یہ تمام امت مسلمہ کے لئے ایک۔ بڑی مصیبت ہے، اعلیٰ اللہ مقامہ فی علین، مولانا کی حیات میں تو علمی حلقوں میں کوئی خلا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا، لیکن آپ کے انتقال کے بعد اب ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اس کا پر ہونا موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا۔“

خیر رمضان یوسف | عربی مآخذ و مراجع میں ’الاعلام‘ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ خیر الدین زرکلی نے اس کتاب میں مشاہیر زمانہ کے تذکرے اور حالات کو مختصر ترین مگر جامع انداز میں مرتب فرمایا ہے۔ ’الاعلام‘ کا تتمہ یا تکملہ خیر رمضان یوسف نے لکھا ہے۔ خیر رمضان یوسف نے تتمہ میں مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کا اس طرح تعارف کرایا:

”حبیب الرحمن الاعظمی العالم البحاث المدقق، أحد أبرز علماء الحديث في شبه القارة الهندية وهو مؤسس المعهد العالي للعلوم الدينية في ماؤ. ورئيس هيئة التدريس بجامعة مفتاح العلوم في المدينة نفسها التابعة لولاية أوتار براديس.

وقد درس العلوم العربية والإسلامية على أيدي أساتذة أجلاء، وقضى شطر عمره في التدريس والتأليف، كما كان من الناشطين في حركة الاستقلال، ومثل بلدته ما بين عام

۱۹۵۲-۱۹۵۷ء فی المجلس النيابي المحلي للولاية،
ولجہودہ البارزۃ فی التعلیم والتألیف فی مجال اللغة
العربیۃ منحتہ الحكومة الهندیۃ جائزۃ رئیس الجمهوریۃ
التقدیریۃ۔“۱

(حبیب الرحمن الاعظمی عالم، اسکالر، محقق، مدقق، اور برصغیر ہند کے ممتاز
محدثین میں سے ایک ہیں۔ مؤ میں ایک دینی ادارہ المعبد العالی کے بانی
اور اتر پردیش کے اسی شہر میں قائم جامعہ مفتاح العلوم کے صدر مدرس
تھے۔ جلیل القدر اساتذہ سے عربی اور اسلامی علوم حاصل کئے اور اپنی عمر کا
(ایک اچھا خاصہ) حصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔
اسی طرح تحریک آزادی میں بھی سرگرم تھے۔ اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک
صوبائی اسمبلی میں اپنے شہر کی نمائندگی کی۔ عربی زبان و ادب میں ان کی
نمایاں تعلیمی اور تصنیفی کوششوں اور خدمات کے لئے حکومت ہند نے
انھیں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا۔)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ | زہد و تقویٰ علم و ورع اور سلوک
و تصوف میں آپ کو جو مقام عالی حاصل ہوا، اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی، تصوف و سلوک میں
آپ کو امامت کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت تھانویؒ سے مولانا اعظمی کا دیرینہ تعلق تھا،
مولانا کے والد ماجد مولانا محمد صابر صاحب حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے، مولانا خود
بھی طالب علمی کے زمانہ میں ہی بیعت ہو گئے تھے۔ حضرت تھانویؒ کو مولانا کے علم و فقہ
پر اعتماد تھا، فقہی مسئلہ میں آپکی طرف رجوع کرنے کو کہا کرتے تھے۔

جب پروفیسر عبدالحی کی کتاب پر مولانا اعظمی کی تنقید ’التنقید السدید علی‘

التفسیر المجدیہ کے نام سے شائع ہوئی، تو مولانا اعظمی کے پاس ۲۴ صفر ۱۳۴۹ھ کو مولانا تھانویؒ نے ایک خط لکھا کہ:

”احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا: قال رسول اللہ ﷺ يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين.
(مشکوۃ عن البيهقي)

ما شاء اللہ قوت استدلال، حسن اداء، دفع شبہات، لین کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگریم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست
بارک اللہ فی افادات المصنف و افاضاته۔

۲۴ صفر ۱۳۴۹ھ۔ تھانہ بھون

وقاه اللہ تعالیٰ عن الفتن۔“ ۱

مولانا تھانوی نصرۃ الحدیث پر اپنا یہ تاثر پیش کرتے ہیں:

”میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں اور ہدیہ بسر و چشم قبول کرتا ہوں اور دعاء نافعیت کرتا ہوں، جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا۔“ ۲

مولانا عبد الغفار عراقی مئوی | مولانا عبد الغفار صاحب کا تذکرہ سوانح میں پیش کیا جا چکا ہے، انہوں نے اپنے عزیز شاگرد کو جو سند عطا کی تھی وہ قابل ملاحظہ

۱۔ التقدید السدید ص ۴۸ (النجم ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ)

۲۔ نصرۃ الحدیث (تأثر و تبصرہ)

ہے، مولانا عراقی سند کیا دے رہے ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل نکال کر دے رہے ہوں:

”إن العزيز الحفي المجتني من أزهار البستان، بستان
العلوم والفنون والراغب إليها بالجنان، هو مع حداثة سنه
وغضاضة غصنه قد هز الدوحة المورقة، والشجرة
المثمرة، حتى فاق في العلوم والفنون على الأقران، بانعام
جيبه منها والأدران، حبي وفلذة كبدي، أعني المولوي
حبیب الرحمن بن المولوي محمد صابر المثنوي
الأعظمي.....“

(خرمن علم و فن سے خوشہ چینی کرنے والے اور دل سے اس کی طرف
راغب رہنے والے، عزیز مکرم نے اپنی کم عمری اور صغر سنی کے باوجود علم
کے شاداب و پھلدار درخت کو حرکت دی، یہاں تک کہ علم و فن میں اپنے
ہمسروں پر فائق و برتر ہو گئے، اور اپنے جیب و دامن کو اس سے اچھی
طرح بھر لیا، میرا محبوب اور میرے جگر کا ٹکڑا، مولوی حبیب الرحمن بن
مولوی محمد صابر مثنوی الأعظمی.....)

علامہ انور شاہ کشمیری | جب مولانا اعظمی الحاوی لرجال الطحاوی کی تصنیف سے
فارغ ہوئے، تو اس کا کچھ حصہ علامہ کشمیری کے پاس نظر ثانی کے لئے بھیجا، لیکن اسی
دوران علامہ سخت بیمار پڑ گئے، اور ڈابھیل سے دیوبند تشریف لے آئے، جب مولانا
اعظمی کو علامہ کی علالت کی خبر ملی تو عیادت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، بعد نماز
عصر شاہ صاحب کے پاس حاضری ہوئی، چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، فرمایا کہاں سے

آتا ہوا، مولانا نے فرمایا اعظم گڈھ سے، شاہ صاحبؒ نے فرمایا وہ مولوی حبیب الرحمن اعظم گڈھی کون ہیں، جنہوں نے طحاوی کے رجال پر کام کیا ہے، مولانا نے فرمایا کہ خادم حاضر ہے، یہ سننا تھا کہ شاہ صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے، کن کن کتابوں سے آپ نے مدد لیا ہے، فلاں کتاب کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوئی۔ غرض کہ بہت تعجب کے لہجہ میں اس طرح کے مختلف سوالات کرتے رہے، اس کے بعد فرمایا کہ پورا مسودہ لے کر ڈابھیل تشریف لائیے انشاء اللہ ضرور نظر ثانی کروں گا۔ لیکن افسوس کہ چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی | علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا اعظمی کے استاذ ہیں، استاذ و شاگرد میں باہم علمی تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا، علامہ عثمانی علمی و تحقیقی امور میں مولانا اعظمی کی اصابت رائے کے معترف تھے، مولانا اعظمی کے نام علامہ عثمانی کے خطوط اس کے شاہد ہیں۔ ۲ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ کو دیوبند سے مولانا اعظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آپ کے دو خط اور مضمون پہونچا، میں بے حد عدیم الفرست ہوں، اس لئے مضمون اب تک پورا نہیں دیکھ سکا، جس قدر دیکھا ہے، میرے نزدیک صحیح ہے، مکمل مضمون مطالعہ کے بعد واپس کروں گا۔“

۱۱ رمضان ۱۳۴۵ھ کے ایک مکتوب میں علامہ عثمانی لکھتے ہیں:

”آپ نے جو دو مضمون لکھے ہیں خدا تعالیٰ جزائے خیر دے اور لوگوں کو ان سے منفعہ کرے، کیا ان کو رسالہ کی شکل میں شائع کرنے کا خیال ہے، یا کسی اخبار میں بھیجے گا، الحمد کے لئے کچھ مضامین ضرور محفوظ رکھئے گا۔“

مولانا اعظمی کے نام ۲ محرم ۱۳۸۷ھ کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:
 ’ول آویز باتیں‘ اور ’نصرة الحديث‘ حصہ اول سے محفوظ ہوا، اللہ تعالیٰ
 خدمت دین کی مزید توفیق بخشے۔“ ۱

جب الحاوی کی تصنیف سے مولانا اعظمی فارغ ہو گئے، تو علامہ عثمانی نے
 انہیں مبارکباد کا ایک خط لکھا، وہ خط ملاحظہ ہو:
 ”از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

برطالعہ برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون آنکہ..... ابھی واپس آیا ہوں، اس لئے خط کے
 جواب میں تاخیر ہوئی، مشکل الآثار..... تمام وکمال اور معافی الآثار کے
 معتد بہ حصہ کے رجال قلمبند ہو جانے کی آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں،
 بیحد خوشی ہوئی حق تعالیٰ آپ کو ہمت اور ارادوں میں برکت دے اور
 خدمت سنت کی مزید توفیق بخشے۔ ان شاء اللہ شعبان میں آنے کی پوری
 کوشش کروں گا۔ قطعی بات رجب کے آخر میں لکھ سکوں گا۔

از ذابھیل ضلع سورت

۹ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ “ ۲

تین طلاق کے مسئلہ پر طلبہ کو مولانا اعظمی کی کتاب ’الاعلام المرفوعہ‘ کے مطالعہ کا
 مشورہ دیا کرتے تھے، علامہ کے الفاظ ’الاعلام المرفوعہ‘ کے ذیل میں نقل بھی کئے جا چکے ہیں۔
 مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی | مولانا لدھیانوی عالم دین، عظیم رہنما اور
 شعلہ بیان مقرر تھے۔ آپ علامہ انور شاہ صاحب کے شاگردوں میں تھے، مولانا اعظمی

۱۔ المآثر مکی تا جولائی ۱۹۹۸ء ص ۹۲

۲۔ ایضاً ص ۸۷

کو ۱۶ جنوری ۱۳۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”.....آپ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہیں، میرے دل میں آپ کے تقویٰ، علم و پرہیزگاری کی وجہ سے بہت زیادہ عزت ہے.....“

ایک دوسرے مکتوب میں رقمطراز ہیں:

”.....حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے آپ سے ایک تعلق ہے کیونکہ آپ ان کے علم کے وارث ہیں، اس لئے مجبور ہوں کہ آپ سے اپنا تعلق رکھوں۔“

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی | شیخ الاسلام مولانا مدنی اور مولانا اعظمی کے تعلقات باہم بہت مضبوط و مستحکم تھے، مولانا اعظمی شیخ الاسلام پر فریفتہ اور شیخ الاسلام مولانا اعظمی کے علم کے گردیدہ تھے، ان دونوں حضرات میں کافی حد تک فکری و نظریاتی ہم آہنگی تھی؛ غالباً یہی مناسبت تھی کہ سیاست میں مولانا مدنی نے جو مسلک اختیار کیا تھا، مولانا اعظمی نے بھی اسی کو اپنایا، اور آخر تک اس پر قائم رہے، مولانا مدنی کو مولانا اعظمی کے علم و تفقہ پر ناقابل بیان حد تک اعتماد تھا۔ مولانا مدنی اہم مذہبی و سیاسی امور میں مولانا اعظمی کے مشورہ اور رائے کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے، ۱۰ محرم ۱۳۷۷ء کے ایک مکتوب میں مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں:

”محترم المقام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں،

بوقت تشریف آوری مجلس شوری دارالعلوم دیوبند سب کے سامنے اس مقصد کا اظہار فرمائیں جو طریقہ اس مقصد میں کامیابی کے واسطے مناسب ہوگا وہ سب حضرات کی موجودگی میں طے ہو جائے گا، دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام

مولانا مدنی نے جب مولانا اعظمی کی تصنیف 'رکعات تراویح' دیکھی تو مولانا کو اس انداز میں داد دی:

”مدعیان حدیث کی گندم نمائی اور جو فروشی کی وجہ سے بہت سے اشخاص

اس غلطی میں مبتلا تھے کہ آٹھ رکعات تراویح کا ثبوت شرعی موجود ہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی زید مجدہم کی اس حقیقت نمائی

نے جو موصوف نے اس رسالہ میں فرمائی ہے، باطل کے پردوں کی

دھجیاں اڑا دیں اور کاشمیر فی رابعہ انھار ظاہر کر دیا کہ مدعیان حدیث

کے دعاوی باطلہ ہرگز قابل التفات نہیں ہیں، میں نے رسالہ مذکورہ کا

ابتداء سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے۔ میں حضرت مؤلف مدوح کی تحقیقات

ایقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے ان مدعیوں

کے خرمنبہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر نیست و نابود کر دیا ہے، جزاء

اللہ احسن الجزاء فی الدارين.....“

مولانا یوسف بنوری | علامہ انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں تھے، تقسیم کے بعد پاکستان کے شہر کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء کو مولانا طاسین صاحب نے

۱۔ المآثر مکتبیۃ جولائی ۲۰۰۰ء ص ۸۷

۲۔ حیات ص ۲۸۰-۲۸۱

مولانا اعظمی کے پاس ایک خط میں لکھا:

”غائبانہ آپ کا ذکر خیر جن تعریفی الفاظ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے ہم لوگ سن کر حیران رہ جاتے، وہ (مولانا بنوری) آپ کو اپنے وقت کا عظیم محدث فرمایا کرتے تھے۔“

مولانا ابوالوفاء افغانی | قیمتی اور نادر کتابیں شائع کرنے والے ادارہ طبعۃ احیاء المعارف العثمانیہ کے بانی مولانا ابوالوفاء افغانی مولانا اعظمی کے غایت درجہ قدرداں تھے، کتاب الزہد والرقائق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

”فقد اطلعت علی کتاب الزہد للامام ابن المبارک رحمہ

اللہ، الذی رتب أصوله وصححها وعلق علیہ العلامة اللیب الحبیب مولانا الشیخ حبیب الرحمن الأعظمی لا زال ناصراً للسنۃ ومد فیوضہ فوجدتہ ماہراً للعلوم حاویاً بہا أمیناً لروایاتہ، قل لہ نظیر فی علماء زماننا.....“

(امام ابن مبارک کی کتاب الزہد میں نے دیکھی جس کے اصول کی ترتیب، تصحیح اور تعلیق علامہ لبیب حبیب مولانا شیخ حبیب الرحمن الأعظمی نے کی ہے، جو حدیث کی نصرت میں مسلسل لگے رہتے ہیں، جن کا فیضان عام ہے، میں نے انہیں علوم کا ماہر ان پر پوری طرح حاوی، اور روایات کا امین پایا، ہمارے زمانے کے علماء میں ان کی نظیر کم ملے گی۔)

مولانا عبد الشکور فاروقی | مولانا فاروقی اور مولانا اعظمی، یہ دونوں اہل علم باطل کے لئے شمشیر برہنہ تھے، ان دونوں حضرات نے رد شیعیت، رد غیر مقلدیت اور رد

بریلویت میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ مل کر تحریری و تقریری مناظرے کئے، مجلہ المآثر نے مولانا اعظمی کے نام مولانا عبدالشکور صاحب کے مکاتیب شائع کئے ہیں، ان خطوط سے ان حضرات کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ کے ایک خط میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھتے ہیں: ”معاف کرنے کے متعلق لکھ کر آپ مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہیں، میں ایسا کب ہو سکتا ہوں کہ آپ سے ناراض ہوں اور آپ اس ناراضگی کو کچھ اہمیت دیں۔“

۲۵ رمضان ۱۳۵۳ھ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ”اتحاد الفریقین کا جواب آپ نے بھیجے کو لکھا ہے اگر جلد بھیجے تو بہتر ہے..... آپ نے اپنے آنے کا ارادہ بھی لکھا ہے، اگر ایسا ہو تو زیادہ مناسب ہے چند ضروری امور میں آپ سے مشورہ بھی کرنا ہے۔“

علامہ سید سلیمان ندوی | علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا اعظمی میں گہرے روابط تھے، مولانا اعظمی سید صاحب کا بہت احترام کرتے تھے، اور سید صاحب مولانا کے علم سے حد درجہ متاثر تھے، علم و تحقیق میں اگر کوئی الجھن پیش آ جاتی تو گرہ کشائی کے لئے مولانا اعظمی کو یاد فرماتے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر مجلہ معارف کے مطابق: ”حضرت سید صاحب ان پر (مولانا اعظمی پر) بڑا اعتماد کرتے تھے اور اپنی بعض تحریروں کو اشاعت سے پہلے ان کے پاس بھیجتے اور ان کے مشورے کے مطابق ان میں رد و بدل بھی فرماتے۔“

۱۔ المآثر نومبر تا جنوری ۱۹۹۸ء ص ۸۲

۲۔ ایضاً ص ۸۵

۳۔ معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۱

سید صاحب پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہاں سے مفتی ظفر الدین صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”ہندوستان کے ان دوستوں میں سے جن کے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے، ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اور دوسرے آپ کے استاد مکرم مولانا حبیب الرحمن (اعظمی) ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مستفید فرمائے۔“ ۱

علمی حلقہ میں سید صاحب کے جن حضرات سے گہرے روابط تھے، شاہ معین الدین صاحب ندوی، حیات سلیمان، میں انکا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”علمی دائرے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوبکر شیث جو پوری، مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور مولانا ابوالکلام سے زیادہ تعلقات تھے۔“ ۲

پھر آگے چل کر صفحہ ۶۳۸ پر شاہ معین الدین ندوی مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

”مولانا حبیب الرحمن اعظمی اگرچہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن حدیث و فقہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اسی لئے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔“ ۳

مولانا مناظر احسن گیلانی | مولانا اعظمی اور مولانا گیلانی کے درمیان ملاقات کی نوبت تو کبھی نہ آ سکی، لیکن دونوں صاحب نظر عالم ایک دوسرے کے فضل و کمال کے

۱۔ مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۵۵ مفتی محمد ظفر الدین

۲۔ حیات سلیمان ص ۶۳۷ شاہ معین الدین ندوی

۳۔ ایضاً ص ۶۳۸

معترف تھے۔ (حیات ص ۵۴۹) جب مولانا گیلانی نے مولانا اعظمی کی نصرتِ الحدیث دیکھی تو مولانا کے پاس مندرجہ ذیل خط ارسال فرمایا:

”میں نے آپ کی کتاب نصرتِ الحدیث اول سے آخر تک پڑھی، ماشاء اللہ آپ نے کافی محنت اور مطالعہ فرمایا ہے۔ نئی چیزیں اس سلسلہ میں آپ نے پیش کی ہیں، خدا آپکو جزائے خیر دے..... اس موضوع پر خاکسار نے بھی کچھ لکھا ہے..... اس لئے آپ کی محنت اور تلاش کی داد جیسا کہ چاہئے میں ہی دے سکتا ہوں۔ اگر حکم ہو..... تو آپ کی کتاب پر مفصل ریویو لکھنا اپنی سعادت خیال کروں گا..... آپ جیسے دین کے مخلص خدام کا سرمایہ عز و شرف فی الدنیا والاخرۃ ہے۔“ ۱

مولانا عبد الماجد دریابادی | مولانا اعظمی نے احادیث کی تحقیق و تدوین میں جو جدید طرز و اسلوب اختیار کیا تھا، مولانا عبد الماجد دریابادی اس سے بہت متاثر و متحیر تھے، فرماتے ہیں:

”علمی تحقیق و تدقیق اب تک مستشرقین ہی کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ مولانا اعظمی سلمہ اللہ نے عین اسی رنگ میں ڈوب کر ہندوستان کا نام سارے عالم میں بلند کر دیا۔“ ۲

کتاب الزہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے ماہرین اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک گوشہ نشین نے وہ کام کر دیا کہ جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے

بعد ہی انجام دے پاتے ہیں۔“ ۱

مسند حمیدی جلد دوم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس نایاب مسند کا پتہ لگانا بجائے خود ایک کارنامہ تھا چہ جائیکہ اس کی پوری ترتیب و تہذیب، تصحیح و مقابلہ تفسیر اور متعدد فہرستوں اور اشاریہ دیباچہ وغیرہ کا اضافہ، یہ سعادت و کرامت ایک ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے حصہ میں آئی۔ جس پر انہیں علمی و دینی طبقہ کی طرف سے جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔“ ۲

۲/ اگست ۱۹۶۸ء کے صدق جدید میں مولانا دریا بادی مولانا اعظمی کی شان

میں لکھتے ہیں:

”ہندوستان کے خادمانِ حدیث اور ماہرینِ علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمن (مؤ۔ ضلع اعظم گڑھ) کا ہوگا۔“ ۳

مولانا سعید احمد اکبر آبادی | مولانا اکبر آبادی مولانا اعظمی کے گرویدہ تھے، علمی و تحقیقی امور میں اکثر و بیشتر آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ۲۸/۸/۵۸ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”صدیق اکبر کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا، آپ ازراہ شفقت و بزرگانہ توجہ سے اس پر نظر ثانی فرما کر جو چیزیں قابل اصلاح نظر آئیں ان سے مجھ کو مطلع فرمائیے۔ میں نہایت شکر گزار ہوں گا،..... آپ

۱۔ صدق جدید ۲/ جون ۱۹۶۶ء

۲۔ صدق جدید ۶/ مارچ ۱۹۶۳ء

۳۔ صدق جدید ۲/ اگست ۱۹۶۸ء

یقین مائیے ہندوپاک کے علمائے محققین میں آج کل میں صرف ایک تنہا آپ کی ذات کو مانتا ہوں جن سے علمی امور میں رجوع کرنا میں اپنا علمی فرض سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر صحت و عافیت کے ساتھ قائم رکھے۔“
مولانا اکبر آبادی اپنی کتاب ’صدیق اکبر‘ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”مولانا نے ازراہ شفقت بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا، میں نے نظر ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لئے صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔“ ۱

’المطالب العالیہ‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”الشیخ الاستاذ مولانا حبیب الرحمن الاعظمیٰ ان محققین علماء میں سے ہیں جو اگرچہ اپنے وطن میں ’غریب شہر‘ ہیں لیکن عرب ممالک میں ان کے علم و فضل اور شہرت و عظمت کا طوطی بولتا ہے۔“ ۲

۲۰/۳/۶۸ء کے ایک مکتوب لکھتے ہیں:

”آپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کیا عجیب و غریب کارنامہ انجام دیا ہے، دنیائے علم و تحقیق آپ دونوں حضرات کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے اور احسان مند ہو کم ہے، آپ نے ادھر چند سالوں میں کیا کچھ کر دکھایا!“ ۳
۲۴ دسمبر ۱۹۶۷ء کے ایک خط میں رقمطراز ہیں:

۱. المآثر ج: ۱۳ ش: ۲ ص: ۸۹-۹۰

۲. صدیق اکبر ص: ۲۷ مولانا سعید احمد اکبر آبادی

۳. برہان اپریل ۱۹۷۷ء ص: ۲۷۸

۴. المآثر ج: ۱۳ ش: ۳ ص: ۸۹

”اگرچہ ’چھوٹا منہ بڑی بات‘ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کا علم و فضل، بصیرت و دقت نظر اور وسعت نظر کی داد نہیں دی جاسکتی، اس کا افسوس تھا کہ برصغیر ہند و پاک میں قاہرہ کے ساعاتی، احمد محمد شاہ کراچی جیسے محقق علماء نظر نہیں آتے، لیکن الحمد للہ آپ نے نہ صرف تلافی کر دی ہے بلکہ ان حضرات سے بھی بعض چیزوں میں سبقت لے گئے ہیں۔“ ۱

علامہ اقبال سہیل | اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے، آپ کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے، مشق سخن کے لئے آپ کی ذات ایک مرجع کی حیثیت رکھتی تھی۔ مشاعرہ وغیرہ میں مسند صدارت کو زینت بناتے، ڈاکٹر منور انجم کے لفظوں میں: ”اکثر مشاہیر ادب نے سہیل کی ادبی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے۔“ ۲

۱۹۳۶ء میں اعظم گڑھ میں ایک جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں ہندوستان کی مشہور علمی شخصیتیں مدعو تھیں۔ مولانا اعظمی اس جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ اقبال سہیل نے اس موقع پر فارسی میں ایک استقبالیہ نظم کہی تھی۔ سہیل نے مولانا اعظمی کی شان میں جو شعر کہا تھا وہ یہ ہے۔

وزاں پس آل حبیب ما، ادیب ما، خطیب ما

کہ ذاتش در مؤاحف را حصن حصین آمد ۳

مولانا عامر عثمانی | مولانا اعظمی کی کتاب ’رکعات تراویح‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عامر عثمانی علم میں ان کی وسعت و جامعیت کا بلند آہنگ میں اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مولانا اعظمی کے رشحات قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور

اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت، وہی تبصر اور وہی شان نقد۔^۱

عاصر عثمانی مزید تحریر فرماتے ہیں:

”کاش مولانا اعظمی قریب ہوتے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھتے، آس پاس اونچی دوکان والے تو بہت ہیں، مگر علم و تفقہ کی ایسی دکانیں اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں، جنکا پکوان پھیکا نہ ہو۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اب زمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا، شمس العلماء، حکیم الاسلام، ارسطوئے دوراں اور مٹھی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے، لیکن انور شاہ، شبیر احمد عثمانی، حبیب الرحمن الاعظمی..... جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔“^۲

مولانا عتیق الرحمن عثمانی | ناظم ’مدوۃ المصنفین‘ دہلی، کلکتہ سے مولانا اعظمی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”آپ سے ملاقات کے لئے اب سے نہیں کئی سال سے دل چاہتا ہے، آپ کی علمی خدمات ہم سب کے لئے باعث افتخار اور مایہ عزت ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔“^۳

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی | مولانا علی میاں ندوی مولانا اعظمی کے غایت درجہ مداح اور قدرداں تھے، مولانا ندوی مولانا اعظمی کے علم کی گہرائی و گیرائی سے پوری

۱۔ تجلی اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۵۵

۲۔ ایضاً ص ۵۷

۳۔ حیات ص ۵۵۸

طرح واقف و باخبر تھے؛ یہی وجہ تھی کہ مولانا علی میاں صاحب کا ہمیشہ یہ اصرار رہا کہ مولانا اعظمی ندوہ میں شیخ الحدیث کے جلیل القدر منصب کو سنبھال لیں، شیخ الحدیث شیخ حلیم عطا صاحب کے انتقال کے بعد مولانا اعظمی نے اس ذمہ داری کو سنبھالا بھی، مگر اس ذمہ داری کو اپنے ممبر اسمبلی رہنے کے دوران تک ہی نبھایا، اسمبلی کی مدت رکنیت جب ختم ہو گئی تو وطن واپس چلے آئے۔

مولانا اعظمی کے نام مولانا علی میاں ندوی کے ڈھیروں خطوط بحمد اللہ محفوظ ہیں، جو مجلہ 'المآثر' کے صفحات کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں بلاشبہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ ندوی خود بھی مولانا سے علمی استفادہ و استفادہ کرنا چاہتے تھے، بہت سے خطوط میں اس طرح کے مضامین ملتے ہیں، طوالت کے اندیشہ سے ہم ان خطوط کے نقل کرنے سے قاصر ہیں، البتہ اس موقع پر قارئین کی تسلی کے لئے ۱۶ رجب ۱۳۷۷ھ کے ایک مکتوب کا چھوٹا سا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

”میں الفاظ میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا کہ آپ کے دارالعلوم میں تشریف رکھنے سے مجھے کتنی مسرت اور تقویت تھی، اس وقت کے علماء میں میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی سے اتنی مناسبت اور عقیدت ہے جتنی آپ سے، خصوصیت کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مجھے اس جامعیت اور ذوق و ثقافت کا کوئی دوسرا عالم نظر نہیں آتا، یوں یک فنی علماء اور اپنے اپنے فن کے بتحر اور بھی ہو گئے، مگر میرے ذوق کی تشفی اور جگہ نہیں ہوتی۔“

مولانا اعظمی کے انتقال کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی امت کا عظیم علمی خسارہ

مانتے ہوئے اپنے تعزیتی نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی وفات..... سے علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے، جس کی برصغیر ہند و پاک ہی نہیں بلکہ ممالک عربیہ اور مرکز اسلام پر بھی نظر ہے، اور وہاں کے علماء، اساتذہ، مصنفین و محققین سے بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقفیت ہے، علم حدیث خاص طور پر عالمی و علمی پیمانہ پر جس انحطاط و تنزل کا شکار ہے، اور اس فن شریف کی واقفیت میں جو سطحیت اور رسمیت پیدا ہو گئی ہے، اور خاص طور پر حدیث و روایات صحیحہ اور فقہ حنفی کے درمیان تطبیق اور اس علمی حقیقت کے ثابت کرنے میں کہ مذہب حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ اور خلفائے کبار محض قیاس و ذہانت پر اعتماد نہیں کرتے تھے، ان کا مأخذ استنباط احکام میں آیات و احادیث ہی ہوتی تھیں، اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا کے ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اور بھی قابل افسوس و تشویشناک ہے،..... نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے، بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہو گئی ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔“

مولانا محمد منظور نعمانی | مولانا اعظمی کے شاگرد تھے، جس کا تذکرہ خود مولانا نعمانی نے کئی جگہوں پر کیا ہے، ۱۹۷۱ء جب ۱۳۵۱ھ کو بریلی سے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”گزشتہ ہفتہ میں دہلی گیا تھا، وہاں مولوی عتیق الرحمن صاحب ناظم ندوۃ

۱۔ محدث اعظمی نمبر ۲۰، تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ مارچ ۱۰ اپریل ۱۹۹۲ء ص ۶، کاروان زندگی

المصنفین، اور مولوی سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے وغیرہ سے کچھ آنکھرم کا ذکر آگیا، اس سلسلہ میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر مولانا وقت نکال کر ترمذی پر ایک مبسوط حاشیہ (بطرز شرح مسلم نووی) تیار فرما سکیں جس میں وہ قرض بھی ادا ہو جائے جو تحفۃ الاحوذی کی اشاعت کے بعد خفیوں پر عائد ہو گیا ہے تو ندوۃ المصنفین، تحشیہ کا معاوضہ ادا کر کے اس کو خاص اہتمام سے چھپوا سکتا ہے، اور اس بارہ میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مولانا کی مرضی دریافت کر کے لکھنا، میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اس کے لئے وقت نکل سکے تو علم اور دین کی بڑی خدمت ہوگی، اور وقت کی ایک بڑی ضرورت انشاء اللہ پوری ہو جائے گی، جس کو پورا کرنے والے شاید آئندہ پیدا ہی نہ ہوں؟“

ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرساوی | ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور مولانا اعظمی

۱۔ حیات ص ۵۶۰

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے، انہیں اردو، عربی، فارسی، ترکی، جرمن، فرانسیسی وغیرہ زبانوں پر قدرت حاصل تھی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے ایم۔ اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں، جرمنی میں بون یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، جو Muslim Conduct Of State کے نام سے شائع ہوا، فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بات کی تردید کی کہ امریکی آئین دنیا کا پہلا آئین ہے، اس کے برعکس انہوں نے میثاق مدینہ کو دنیا کا پہلا تحریری آئین قرار دیا۔ انہیں فیصل ایوارڈ پانے کا بھی اعزاز حاصل تھا، ان کی زندگی کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ پوری زندگی میں صرف ایک بار کلاس میں تاخیر سے پہونچے، اس دن ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا، والدہ کی تدفین کے بعد پھر وہ کلاس میں چلے گئے۔ (تخصیص ۱۲۷-۱۲۹)

مجلہ اقبالیات جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء، اقبال اکادمی پاکستان۔

مخطوطات کے ایسے دو غواص گزرے ہیں، جن کا امت اسلامیہ پر عظیم احسان ہے، جنہوں نے اپنی تحقیقات سے اسلامیات میں دراندازی کرنے والے مستشرقین اور مغرب کے محققین کے قدم اکھاڑ دیئے۔ ان دونوں باکمال بزرگوں نے امت سے وہ قرضے اتار دیئے جو برہابرس سے انکی گردنوں پر لدے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے آج کے کیا رہتی دنیا تک کے محققین کی گردنیں ان دو محققین کے سامنے جھکی رہیں گی۔

مولانا اعظمی اور ڈاکٹر حمید اللہ کے آپس میں نیاز مندانہ تعلقات تھے، یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے علم کے معترف اور مداح تھے۔ آپس میں ہمیشہ تحقیقی مباحث میں ایک دوسرے کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے، اگر کسی کو کوئی نادر مخطوط ملتا تو دوسرے کو مطلع کرتا، یا کسی ایک کو کسی مخطوطہ کی تلاش ہوتی تو دوسرے سے رابطہ کرتا۔ خوش قسمتی سے مولانا اعظمی کے نام ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے کچھ خطوط محفوظ رہ گئے ہیں، جن سے ہر دو حضرات کے خوشگوار تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

پیرس سے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ کے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب تحریر

فرماتے ہیں:

”نوازش نامہ ملا، سرفراز ہوا، آپ میرے بزرگ ہیں، اس لئے التجا ہے کہ وہ اسلوب تحریر اختیار نہ فرمائیں جو مجھے شرمندہ اور محبوب کرے مصنف عبدالرزاق اور مسند حمیدی کے متعلق اطلاع سے مسرت ہوئی، الحمد للہ علمی کام کرنے والے ابھی وہاں موجود ہیں، بارک اللہ فی مسامحہم..... آں محترم کو آخری عریضہ لکھنے کے بعد معارف کا وہ پرچہ ملا، جس میں کتاب الذخائر والہف کے متعلق آں محترم کا مضمون ہے، اس سے میں نے بہت استفادہ کیا، مسائل اور مستفہم کی حیثیت سے دو چیزیں عرض ہیں:

۱۔ ص ۱۴۱ کی سطر میں ہے: "قاضی صاحب کی یہ جرح بالکل صحیح ہے کیا
۱۴۴۲ھ میں ارسال شدہ ہدایا کو کوئی شخص ایک سو سال کے بعد دیکھ کر
"شاہدات جمیعہا بتیس" کہہ سکتا ہے؟

ب۔ ص ۱۴۵ کیا فلیتہ کا کامل نسب حضرت زبیر تک کہیں ملتا ہے؟.....
جب مولانا اعظمی مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلہ میں بیروت میں
قیام پذیر تھے، تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پیرس سے ۸ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ کو
مولانا اعظمی کے نام ایک خط لکھا، ڈاکٹر صاحب نے اس مکتوب میں جس طرح مولانا
اعظمی کی علمی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کی ہے، وہ قابل ملاحظہ ہے، فرماتے ہیں:
"..... مولوی ابراہیم میاں کے خط سے معلوم ہوا کہ آں محترم
مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے لئے بیروت تشریف لائے ہیں۔
"شاہ ولی اللہ ثانی" کی یہ خدمت حدیث عند اللہ ماجور، عند الناس مشکور
ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بہت دنوں آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے اور
آپ کو صحت و عافیت سے خدمت علم میں مشغول۔" ۲

۲۴ رمضان ۱۳۹۰ھ کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:
"عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا، ان مشکلات کے باوجود آں محترم
خدمت حدیث شریف کئے جا رہے ہیں، اسی تناسب سے اجر بھی بڑھتا
جا رہا ہے، کاش میں ملازمت کے پھندے میں نہ ہوتا، میں خوشی سے
بیروت آجاتا اور ممکنہ خدمت کی سعادت حاصل کرتا، بہر حال مرضی مولیٰ
از ہمہ اولیٰ۔" ۳

قاضی اطہر مبارکپوری فرماتے ہیں: ”لنضر الله امرأ سمع مقالتي فوعاها ثم بلغها الخ، یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو تروتازہ اور سرسبز و شاداب اور ہر ابھرار کے جو میری بات سن کر دوسرے کو پہونچائے، اس نبوی دعا کا ظہور مولانا مرحوم کی آخری زندگی میں یوں ہوا کہ مادی اور جسمانی عوارض کے باوجود علم حدیث کی خدمت کے لئے بے پناہ قوت و ہمت عطا ہوئی اور اس حال میں پورے نشاط و انبساط کے ساتھ مولانا نے وہ دینی و علمی کارنامے انجام دیئے جو جوانی اور صحت کے زمانہ میں کئے جاتے ہیں، یہ بات بھی مولانا کے زندگی کے امتیازات میں ہے کہ بڑھاپے میں انہوں نے جوانی سے زیادہ کام کیا ہے۔“

قاضی اطہر مبارکپوری ایک جگہ مزید تحریر فرماتے ہیں:

”واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے۔“

عالی جناب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ۱۵ اپریل ۱۹۸۷ء کو کل ہند سمینار کا خطبہ افتتاحیہ دیتے ہوئے کہا کہ فن حدیث میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ دہلوی، نواب صدیق حسن خاں، حضرت عبد اللہ شاہ نقشبندی اور ہمارے زمانے میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی خدمات کسی طرح علمائے خطہ عرب سے کم نہیں ہیں۔

پروفیسر عبد الرحمن مومن، بمبئی یونیورسٹی تحریر فرماتے ہیں: ”حضرت والا کے علم و فضل اور معرفت و بصیرت کے سرچشمہ سے بہت کچھ حاصل کیا، ان کی سادگی،

۱۔ محدث اعظمی نمبر ۳۷-۳۸

۲۔ ایضاً ص ۴۷

۳۔ معارف جون ۱۹۸۷ء ص ۴۴۳

انکسار اور نام و نمود سے بے نیازی نے ان کی شخصیت میں بڑی دل آویزی پیدا کر دی تھی، وہ عجب اور خود بینی سے کوسوں دور تھے۔ دوسرے علماء کے برخلاف وہ محاصرانہ چشمک سے بالاتر تھے، ان کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔^۱

پروفیسر محمد اجتبا ندوی^۲ نے مولانا اعظمی کے بارے میں کچھ یوں اظہار خیال فرمایا: ”حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب نے بڑی خاموشی، گمنامی، تواضع، انکساری اور اخلاص و للہیت کے ساتھ اپنی علمی زندگی اور دین و فکر کی خدمات کا آغاز کیا تھا، اسی وجہ سے اس وقت تک ان کی جانب، سورج کی روشنی اور سرچ لائٹ پر نظر رکھنے والے حضرات توجہ نہ کر سکے جب تک ان کا منفرد اور امتیازی تحقیقی کام منظر عام پر آ کر چشم پوشی اور نظر اندازی کی حدوں کو پار نہ کر لیا۔“^۳

پروفیسر شمس تبریز خان، لکھنؤ یونیورسٹی^۴ مولانا اعظمی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے عربی مجلہ ثقافتہ الہند دہلی میں تحریر فرماتے ہیں:

”كان محدث الهند سماحة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي رحمه الله مثالا نادراً للجامعية والإحاطة بفضائل الأخلاق والآداب وأصناف العلوم والفنون والدين والسياسة والعلم والعمل، والوعظ والإرشاد، قد حاز بقصب السبق في علوم الحديث وفقه الحديث، وضبط المتن وإتقانه، وعلم الإسناد وأسماء الرجال وتحقيق كتب الحديث الخطية والتعليق عليها وتصحيحها.“^۵

۱۔ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۲۴-۲۵

۲۔ ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۱۰۴

۳۔ ثقافتہ الہند مجلد ۵۳: عدد ۲-۳ صفحہ ۱۳۷

(محدث الہند فضیلت مآب شیخ حبیب الرحمن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ اخلاق و آداب، علوم و فنون کے انواع و اقسام، دین و سیاست، علم و عمل، وعظ و ارشاد وغیرہ میں جامعیت و ہمہ گیری کی ایک نادر اور انوکھی مثال تھے۔ انہیں علوم حدیث، فقہ حدیث، متن کی تصحیح و درستگی، اسناد اور اسماء رجال کے علم اور حدیث کے مخطوطوں کی تحقیق و تعلیق اور تصحیح میں سبقت و فوقیت حاصل تھی۔)

شمس الرحمن فاروقی | اردو زبان کے رمز آشناء، ماہر فن اور نقاد ادب ہیں، شیخ احمد شاکر کی شرح مسند پر مولانا اعظمی کے استدراکات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت شیخ احمد محمد شاکر کی مرتب و مدون کردہ مسند احمد کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ محدث کبیر علامہ حبیب الرحمن اعظمی نے اس پر کثرت سے استدراکات و تعلیقات لکھے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ علامہ احمد محمد شاکر نے محدث کبیر حضرت الاعظمی کے بیشتر اقوال کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ من و عن اپنی کتاب کی آخری جلد میں درج کیا اور حضرت محدث کبیر کی دقت نظر، شغف علمی، تجر و تخصص اور حافظے کی دل کھول کردادی اور تشکر ہوئے، بیشک اہل علم کا وہی رویہ ہوتا ہے اور ہونا چاہئے جو شیخ احمد محمد شاکر اور حضرت محدث کبیر کا تھا۔“



کتابخانه

کتابیات

(الف)

۱-	احیاء علوم الدین	امام غزالی	دارالتقوی للتراث، قاہرہ ۲۰۰۰ء طبع اول
۲-	الاعلام	خیر الدین زرکلی	دارالعلم للملایین، بیروت ایڈیشن ۱۹۷۹ء اور ۱۹۹۷ء
۳-	انتقاء الترغیب والترہیب	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	احیاء المعارف، مالیکوٹ ۱۹۶۰ء
۴-	ارشاد الساری	شہاب الدین قسطلانی	دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء طبع اول
۵-	الاکبانی شذوذہ وأخطاؤہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	دارالعربیہ، کویت ۱۹۸۴ء
۶-	الامام الربانی الزاہد عبد اللہ بن المبارک	ڈاکٹر عبد الحلیم محمود	دارالتراث العربی، قاہرہ
۷-	ابجد العلوم	نواب صدیق حسن خاں	مطبع صدقی، بھوپال ۱۲۹۶ھ
۸-	الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان	علی بن بلہان الفارسی تحقیق: شعیب الارنؤوط	مؤسسۃ الرسالہ ۱۹۹۷ء طبع سوم
۹-	اصول التخریج ودراسۃ الأسانید	ڈاکٹر محمود طحان	دارالقرآن الکریم، بیروت ۱۹۸۱ء طبع سوم
۱۰-	اتحاف النبلاء	نواب صدیق حسن خاں	مطبع نظامی، کانپور
۱۱-	ابوالفضل	ابوالفضل علای	نول کشور پریس
۱۲-	اخبار الاخیار	شیخ عبدالحق دہلوی	مطبع مجبہائی، دہلی ۱۳۰۹ھ

۱۳-	الاعلام المرفوعة فی حکم الطلقات المجموعہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	دارالماثر الاسلامیہ، ممبو ۱۹۹۹ء طبع سوم
۱۴-	اسرار الحکمة	شاہ رفیع الدین دہلوی	اشرف پریس لاہور، ۱۳۸۳ھ
۱۵-	الانہار المرفوعة فی رد الآثار الممتنوعة	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	دکتوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ
۱۶-	ارشاد الثقلین	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	الداعی، لکھنؤ ۱۳۵۹ھ
۱۷-	اصح السیر	مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری	ذکر یا بکڈ پو، دیوبند
۱۸-	اسیران مالنا	سید محمد میاں	الجمعیۃ بکڈ پو، دہلی ۱۹۷۶ء باراول
۱۹-	احکام التذکرہ لاولیاء اللہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	ماہنامہ الفرقان شوال، ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ
۲۰-	انساب و کفایت کی شرعی حیثیت	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ ممبو ۱۹۹۹ء طبع اول
۲۱-	اقبال سہیل حیات اور شاعری	ڈاکٹر منور انجم	۱۹۹۵ء
۲۲-	ابطال عزاداری	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	الداعی، لکھنؤ ۱۳۶۱ھ
۲۳-	انقلاب اٹھارہ سو ستاون	مرتبہ: پی سی جوشی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۱۹۹۸ء، طبع سوم
۲۴-	اہل دل کی دل آویز باتیں	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ ممبو ۲۰۰۱ء طبع دوم
۲۵-	اعیان الحجاج	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مکتبہ اعظمی، ممبو ۱۹۹۶ء بار دوم
۲۶-	اسلام میں بیمہ کا حکم (مجلد مع بیمہ اور اس کا شرعی حکم - مولانا حبیب الرحمن الاعظمی)	شیخ عبداللہ تاحی علوان، مترجمہ: مسعود احمد الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ ممبو ۲۰۰۲ء طبع اول

(ب)

۲۷-	البدلیۃ والنہایۃ	ابن کثیر	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
۲۸-	البدرا الطالع	قاضی محمد بن علی شوکانی	مطبعة السعادة بجوار محافظة مصر قاہرہ ۱۳۳۸ھ طبع اول
۲۹-	بستان المحمدین	شاہ عبدالعزیز	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ
۳۰-	یمرہ اور اسکا شرعی حکم	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مرتبہ: مسعود احمد الاعظمی	مؤ ۲۰۰۲ء طبع اول

(پ)

۳۱-	بیکر مہر و وفا	ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مؤ ۲۰۰۲ء طبع اول
-----	----------------	--------------------------	--

(ت)

۳۲-	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی تحقیق: مصطفیٰ عبدالقادر عطا	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۳ء طبع اول
۳۳-	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی	مجلس دائرة المعارف النظامیہ حیدرآباد طبع اول
۳۴-	تاریخ بغداد	خطیب بغدادی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
۳۵-	تدریب الراوی	جلال الدین سیوطی	دار الکتب العربی، بیروت ۱۹۹۹ء
۳۶-	تخت العنبر فی حیاۃ امام العصر الشیخ انور	مولانا یوسف بنوری	معهد الانور دیوبند، طبع چہارم
۳۷-	تاریخ النور السافر	محی الدین عبدالقادر عیدروسی	المکتبۃ العربیہ، بغداد ۱۹۳۳ء

۳۸-	التاریخ الکبیر	امام بخاری	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۵۹ء طبع اول
۳۹-	تہذیب تاریخ دمشق الکبیر	ابن عساکر، تہذیب و ترتیب: شیخ عبدالقادر بدران	دارالمیسرة، بیروت ۱۹۷۹ء طبع دوم
۴۰-	تلخیص خواتم جامع الاصول	محمد طاهر پٹنی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	علمی پریس، مالنگاؤں
۴۱-	تذکرۃ الحفاظ	شمس الدین ذہبی	مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۳۳ھ طبع دوم
۴۲-	تاریخ الادب العربی	احمد حسن زیات	چوبیسواں ایڈیشن
۴۳-	تتمۃ الاعلام	خیر رمضان یوسف	
۴۴-	تکمیل الاذہان	شاہ رفیع الدین	اشرف پریس لاہور ۱۳۸۳ھ
۴۵-	تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء طبع اول
۴۶-	تاریخ دیوبند	سید محبوب رضوی	علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء طبع دوم
۴۷-	تذکرۃ مولانا عبداللطیف نعمانی	مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	مفتاح العلوم، ممبئی ۱۹۷۳ء
۴۸-	تذکرۃ علماء اعظم گڑھ	مولانا حبیب الرحمن قاسمی	جامعہ اسلامیہ، بنارس ۱۹۷۶ء
۴۹-	تاریخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل	مولانا فضل الرحمن اعظمی	دفتر اہتمام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات
۵۰-	تذکرۃ اکابر	مولانا نظام الدین قاسمی	ایڈیشن ۱۹۹۳ء
۵۱-	تاریخ دارالعلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۹ء طبع اول
۵۲-	تذکرۃ مصلح الامت	مولانا محمد قمر الزماں	دائرۃ المعارف، الہ آباد ۱۹۸۳ء بار اول
۵۳-	تاریخ ندوۃ العلماء	مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی	دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۸۳ء بار اول

۵۳-	التفہیم السدید علی التفسیر الجدید	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	النجم ۱۳۳۹ھ
۵۵-	تعارف مخطوطات کتب خانہ	مولانا محمد ظفر الدین	وسیم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس
	دارالعلوم دیوبند		دیوبند ۱۹۷۰ء بار اول
۵۶-	تحقیقی مقالات	ظفر احمد صدیقی	خدا بخش اور نیشنل لائبریری،
			پٹنہ ۲۰۰۳ء طبع اول
۵۷-	تعدیل رجال بخاری	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ
			مئو ۲۰۰۲ء طبع اول
۵۸-	تنبیہ الکاذبین	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	النجم ۱۳۵۲ھ
۵۹-	تحقیق اہل حدیث	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ
			مئو ۱۹۹۹ء طبع دوم
۶۰-	تاریخ دعوت و عزیمت	مولانا ابوالحسن علی ندوی	مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء
(ج)			
۶۱-	البحر والحدید	امام رازی	مجلس دائرة المعارف العثمانیہ
			حیدرآباد ۱۹۵۳ء طبع اول
۶۲-	جامع الاصول	ابن اثیر جزری	ادارات البحوث العلمیہ والافتاء
			والدعوة والارشاد، المملكة العربیة
			السعودیة ۱۹۵۰ء طبع اول
(ح)			
۶۳-	الحاوی فی سیرۃ الامام ابی جعفر	شیخ محمد زاہد الکوثری	مطبعة الانوار، قاہرہ ۱۳۶۸ھ
	الطحاویؒ		
۶۴-	الحاوی لرجال الطحاوی	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مخطوطہ
۶۵-	حجة الله الباقیہ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	دار احیاء العلوم، بیروت
			۱۹۹۲ء طبع دوم

۶۶-	جلية الاولياء	ابو نعیم اصفہانی، تحقیق: مصطفیٰ عبدالقادر عطا	دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
۶۷-	حياة الصحابة	مولانا محمد یوسف کاندھلوی، تحقیق: مولانا محمد الیاس ہارہ بنگوی	ملت پریس دودھ پور علی گڑھ
۶۸-	حیات ابوالمآثر	ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مکونامیہ، بمبئی ۲۰۰۰ء طبع اول
۶۹-	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمنصفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء
۷۰-	حجیت حدیث	مولانا محمد تقی عثمانی	کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند ۱۹۹۳ء اشاعت اول
۷۱-	حقیقت عبادت	مولانا اشرف علی تھانوی	مکتبہ اشرفیہ محمد علی روڈ، بمبئی
۷۲-	حسن ادب اور اسکی اہمیت	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مکونامیہ ۲۰۰۱ء طبع اول
۷۳-	حیات سلیمان	شاہ معین الدین ندوی	مطبع معارف - اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء

(د)

۷۴-	الدرر الکیمیة فی اعیان المائۃ الثامۃ	حافظ ابن حجر عسقلانی	دار احیاء التراث العربی، بیروت
۷۵-	درس ترمذی	تقریر ترمذی مولانا محمد تقی عثمانی، مرتبہ: رشید اشرف سلفی	مکتبہ رشیدیہ سہارنپور ۱۹۹۵ء
۷۶-	دارالاسلام اور دارالحرب	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مکونامیہ ۲۰۰۲ء طبع اول
۷۷-	دفع المجادلہ عن آیۃ المہلہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	عمدة المطابع، لکھنؤ

۷۸-	دستکار اہل شرف	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ
۷۹-	دفع الباطل	شاہ رفیع الدین دہلوی	مکمل ۲۰۰۱ء طبع دوم نفیس پرنٹرز لاہور ۱۹۷۶ء
(ر)			
۸۰-	رسالۃ الاوائل	شیخ محمد سعید بن سنبل مکی، تصحیح و تنقیح: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مکتبہ الاعظمی مکمل اعظم گڑھ
۸۱-	الرسالۃ المستطرفۃ	محمد بن جعفر الکسانی	بیروت ۱۳۳۲ھ طبع اول
۸۲-	الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل	مولانا عبدالحی لکھنوی، تحقیق: شیخ عبدالفتاح ابو نعہ	دار البشائر الاسلامیہ، بیروت ۱۹۸۷ء طبع سوم
۸۳-	رکعات تراویح	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مکمل ۱۹۸۸ء طبع سوم
۸۴-	رکعات تراویح مخدیل	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مدرسہ مفتاح العلوم، مکمل ۱۹۶۰ء طبع ثانی
۸۵-	رہبر حجاج	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مکتبہ اعظمی، مکمل ۱۹۹۹ء طبع پنجم
۸۶-	راحۃ القلب والعینین باحادیث ترک رفع الیدین	مولانا احمد اللہ قاسمی	
(ز)			
۸۷-	زندگی کا علمی سفر	مفتی ظفر الدین مفتاحی	کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند
(س)			
۸۸-	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین ذہبی	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت ۱۹۹۸ء گیارہواں ایڈیشن
۸۹-	سنن ابن ماجہ	ابن ماجہ	یا سرنندیم اینڈ کمپنی، دیوبند
۹۰-	سنن ابی داؤد	ابوداؤد سجستانی	مطبع اصح المطابع، دہلی

۹۱-	سيرة النبي	علامہ شبلی نعمانی و علامہ سید سلیمان ندوی	مکتبہ مدنیہ، اردو بازار لاہور ۱۴۰۸ھ
۹۲-	سوانح قاسمی	مولانا مناظر احسن گیلانی	نیشنل پرنٹنگ پریس، دیوبند
(ش)			
۹۳-	شذرات الذهب	ابن عماد حنبلی	دار احیاء التراث العربی، بیروت جدید ایڈیشن
۹۴-	شارع حقیقی	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مؤ ۲۰۰۱ء طبع دوم
(ص)			
۹۵-	صحیح الترغیب والترہیب	شیخ البانی	مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع، ریاض ۲۰۰۰ء طبع اول
۹۶-	صفۃ الصفوة	ابن جوزی	دار المعرفۃ، بیروت ۱۹۷۹ء طبع دوم
۹۷-	صدیق اکبر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	مدوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۶۱ء طبع دوم
(ض)			
۹۸-	الضوء الملامع	شمس الدین سخاوی	مکتبہ القدسی، قاہرہ ۱۳۵۴ھ
(ط)			
۹۹-	طبقات الحفاظ	جلال الدین سیوطی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۴ء طبع دوم
۱۰۰-	طبقات الشافعیہ الکبری	ابن سبکی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۹ء طبع اول

(ع)

۱۰۱-	عقیدۃ الاسلام مع حاشیہ تحفۃ الاسلام	علامہ انور شاہ کشمیری	مجلس علمی ڈابھیل ہندوستان ۱۴۱۳ھ طبع اول
۱۰۲-	العمر فی خبر من غمر	حافظ ذہبی، تحقیق: فتوٰ ادسید	التراث العربی، کویت ۱۹۶۱ء
۱۰۳-	عمدة القاری	بدرالدین عینی	دار الفکر بیروت ۲۰۰۲ء
۱۰۴-	علم رجال الحدیث	ڈاکٹر تقی الدین ندوی	مکتبۃ الفردوس، لکھنؤ ۱۹۸۵ء
۱۰۵-	عجائز نافعہ	شاہ عبدالعزیز	مطبع مجبائی، دہلی
۱۰۶-	علماء ہند کا شاندار ماضی	مولانا سید محمد میاں	ایم برادرز کتابستان دہلی ۱۹۸۵ء
۱۰۷-	علماء حق اور اس کے مجاہدانہ کارنامے	مولانا سید محمد میاں	الجمعیۃ بکڈ پو قاسم جان اسٹریٹ دہلی
۱۰۸-	علم المعیشت	پروفیسر الیاس برقی	مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۷ء بار سوم
۱۰۹-	عظمت صحابہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۸۳ء
۱۱۰-	عثمان ذوالنورین	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	طبع اول

(ف)

۱۱۱-	فتح الباری	ابن حجر عسقلانی	ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوة والارشاد، المملكة العربیۃ السعودیۃ
۱۱۲-	فتح المغیث	شمس الدین سخاوی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مکتبۃ الاعظمی مموا عظیم گڑھ
۱۱۳-	الفہرست	ابن ندیم، تحقیق: ڈاکٹر یوسف علی طویل	دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۶ء طبع اول

۱۱۴-	فتاویٰ عالمگیری	شیخ نظام الدین	مکتبہ ماجدیہ کونئہ، پاکستان ۱۹۸۲ء طبع دوم
۱۱۵-	فتاویٰ اہل العراق وحدہ شہم	شیخ محمد زاہد الکوشی	تحقیق: شیخ عبدالفتاح ابو نعہ بیروت ۱۹۷۷ء طبع اول
۱۱۶-	الفوائد البہیہ فی تراجم الخفییہ	ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی، تصحیح و تعلیق: سید محمد بدر الدین	مطبعہ السعادیۃ بجوار محافظۃ مصر ۱۳۲۳ھ طبع اول
۱۱۷-	فہرست تالیفات	ابو فراس النعمانی مولانا محمد زکریا کاندھلوی، سید محمد شاہد سہارنپوری	مکتبہ یادگار شیخ محلہ مفتی سہارنپور ۱۹۹۷ء بار اول

(ق)

۱۱۸-	قواعد فی علوم الحدیث	مولانا ظفر احمد تھانوی، تحقیق: شیخ ابو نعہ	مکتب المطبوعات الاسلامیہ حلب ۱۹۸۳ء طبع پنجم
------	----------------------	---	--

(ک)

۱۱۹-	کتاب الثقات	ابن شاہین، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مخطوطہ
۱۲۰-	اکامل	ابن عدی جرجانی	دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
۱۲۱-	کتاب الانساب	سمعانی	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۹ء طبع اول
۱۲۲-	کتاب الزہد والرقائق	عبداللہ بن المبارک، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس احیاء المعارف، مالگاؤں ۱۹۶۶ء
۱۲۳-	کتاب السنن	سعید بن منصور، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۶۷ء

۱۳۴- کشف الاستار عن زوائد الميزان کتب خانہ	نور الدین بن ہشمی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی رضا علی عابدی	مؤسسة الرسالة دمشق ۱۹۷۹ء ایجو کیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء بار اول
۱۳۶- کاروان زندگی	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	مکتبہ اسلام محمد علی لین گوئن روڈ لکھنؤ ۱۹۹۴ء بار اول

(ل)

۱۳۷- لامع الدرر ای لسان المیزان	مولانا محمد زکریا کاندھلوی ابن حجر عسقلانی	الجمعية پریس، دہلی ۱۳۷۹ھ مجلس دائرة المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۳۳ھ طبع اول
۱۳۹- لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی، تحقیق: شیخ عبدالفتاح ابو نعہ	دار البشائر الاسلامیہ، بیروت مکتبہ القدسی، قاہرہ ۱۳۵۶ھ
۱۴۰- اللباب فی تہذیب الانساب	ابن اشیر	

(م)

۱۴۱- مجمع الزوائد و منبع الفوائد	ہشمی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۲۰۰۱ء طبع اول
۱۴۲- مستند حمیدی	ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس علمی ڈائجیل ۱۹۸۸ء طبع دوم
۱۴۳- مستند امام احمد بن حنبل	احمد بن حنبل، شرح: احمد محمد شاہ	دار المعارف، مصر ۱۹۵۵ء طبع چہارم
۱۴۴- مستند امام احمد بن حنبل	احمد بن حنبل، تحقیق: شعیب الارنؤوط، عادل مرشد	مؤسسة الرسالة ۱۹۹۹ء طبع دوم

۱۳۵-	مجمع بحار الانوار	محدث محمد طاہر پٹنی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس دائرة المعارف العثمانیہ حیدرآباد
۱۳۶-	مسند ابوداؤد طیالسی	ابوداؤد طیالسی، تحقیق: ڈاکٹر محمد بن عبدالحسن ترکی	مرکز الہکوث والدراسات العربیة والاسلامیة دارہجر
۱۳۷-	مصنف عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ہمام، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	۱۹۹۹ء طبع اول مجلس علمی ذابھیل ۱۹۷۲ء
۱۳۸-	مصنف ابن ابی شیبہ	ابوبکر بن ابی شیبہ، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	المکتبۃ الامدادیۃ، مکہ مکرمہ ۱۹۸۳ء
۱۳۹-	منیۃ الائمہ	علامہ قاسم بن قطلوبغا، تحقیق: محمد زاہد الکوثری	مطبعة السعادة مصر ۱۹۵۰ء
۱۴۰-	مقدمہ ابن الصلاح	ابن صلاح	مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، بیروت
۱۴۱-	المطالب العالیہ	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	وزارة الاوقاف، کویت ۱۹۷۰ء
۱۴۲-	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	مولانا ابوالحسن علی ندوی	المجمع الاسلامی العلمی، لکھنؤ ۱۹۹۴ء طبع اول
۱۴۳-	المسلمون فی الہند	مولانا ابوالحسن علی ندوی	المجمع الاسلامی العلمی ندوہ لکھنؤ ۱۹۹۸ء طبع چہارم
۱۴۴-	آثار الکرام	مولانا آزاد بلگرامی	مطبع مفید عام، آگرہ ۱۹۱۰ء
۱۴۵-	مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے	مولانا سیر اوروی	شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند ۱۹۹۵ء طبع اول
۱۴۶-	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	تاج کمپنی، دہلی ۱۹۹۱ء

۱۳۷-	مولانا محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمن	مطبوع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۷ء طبع اول
۱۳۸-	مسلک علماء دیوبند	مولانا محمد طیب	دارالکتاب دیوبند ۱۹۸۹ء
۱۳۹-	آثار و معارف	قاضی اطہر مبارکپوری	ندوة المصنفین، دہلی ۱۹۷۱ء
۱۵۰-	مشائخ احمد آباد	مولانا محمد یوسف ابن سلیمان متالا	مکتبہ محمودیہ، میرٹھ ۱۹۹۳ء
۱۵۱-	معلم الامۃ حضرت عبداللہ بن مسعود اور انکی فقہ	ڈاکٹر حنیفہ رضی	ندوة المصنفین، دہلی
۱۵۲-	مقالات ابوالہماثر جلد اول	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ ۲۰۰۱ء طبع اول
۱۵۳-	مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے	مرتبہ: ڈاکٹر مسعود احمد مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی	قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز دہلی ۱۹۹۷ء
۱۵۴-	ماہر القادری کے تبصرے	مولانا ماہر القادری، مرتبہ: طالب ہاشمی	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۰۰۲ء
۱۵۵-	مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار	ظفر احمد صدیقی	بھارت آفسیٹ پریس، لال کنواں دہلی ۲۰۰۱ء بار اول

(ن)

۱۵۶-	نصب الزاہب	جمال الدین زلیعی	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۹۳ھ طبع دوم
۱۵۷-	الکت الطریفہ	شیخ محمد زاہد الکوثری	ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی پاکستان ۱۹۹۵ء
۱۵۸-	نزہۃ الخواطر و ہجۃ السامع والنواظر	مولانا عبدالحی الحسنی	دارۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء طبع اول
۱۵۹-	نقش حیات	مولانا سید حسین احمد مدنی	الجمعیۃ پریس، دہلی

۱۶۰-	نصرۃ الحدیث	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	دارالماثر الاسلامیہ، منو ۱۹۹۲ء طبع سوم
۱۶۱-	نہایت الارب فی غایات النسب	مولانا محمد شفیع	دارالاشاعت، دیوبند ۱۳۵۱ھ
(و)			
۱۶۲-	وفیات الاعیان	ابن خلکان	داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
(ہ)			
۱۶۳-	ہماری آزادی	ابوالکلام آزاد، مترجمہ: محمد مجیب	اورینٹ لونگ مینس پرائیوٹ لمیٹید ۱۹۶۱ء
۱۶۴-	ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۶۵ء
۱۶۵-	ہندوپاک میں اسلامی کلچر	پروفیسر عزیز احمد، مترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۱ء
(ی)			
۱۶۶-	الیانہ الجنی	محسن تریہتی	جید پریس۔ دہلی ۱۳۴۹ھ
۱۶۷-	یاد رفتگاں	ماہر القادری، مرتبہ: طالب الہاشمی	مکتبہ نشانِ راہ۔ نئی دہلی ۱۹۸۵ء بار اول

انگریزی اور ہندی کتب

- 1- A History Of India Volumell. Percival Spear, Penguin books, England, 1986
- 2- The History of the Indian National Congress-Volume1 (1885 1935) P18 Dr. P'attabhi Sita Ramayya

3- Nationalism on the Indian Subcontinent. Jim Masselos. Thomas Nelson (Australia) Ltd. 1972.

4- भारतीय स्वतन्त्रता आन्दोलन का इतिहास, ताराचन्द,

अनुवादक: मन्मथ नाथगुप्त, 1982

رسائل و مجلات

۱- ارشاد	(پندرہ روزہ)	امر تشر
۲- اقبالیات	(سہ ماہی)	پاکستان
۳- برہان	(ماہنامہ)	دہلی
۴- البعث الاسلامی	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۵- البلاغ	(ماہنامہ)	بمبئی
۶- ترجمان دارالعلوم	(ماہنامہ)	نئی دہلی
۷- ترجمان الاسلام	(سہ ماہی)	بنارس
۸- تجلی	(ماہنامہ)	دیوبند
۹- تعمیر حیات	(پندرہ روزہ)	لکھنؤ
۱۰- ثقافت الہند	(ماہنامہ)	دہلی
۱۱- الحج	(ماہنامہ)	مکہ مکرمہ
۱۲- الداعی	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۱۳- الداعی	(ماہنامہ)	دیوبند
۱۴- دارالعلوم	(ماہنامہ)	دیوبند

۱۵- الرشاد	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۱۶- ریاض الجنت	(ماہنامہ)	جو پور
۱۷- صوت الاسلام	(ماہنامہ)	غاز پور
۱۸- صدق جدید	(پندرہ روزہ)	لکھنؤ
۱۹- ضیاء الاسلام	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۲۰- العدل	(ہفت روزہ)	گوجرانوالہ
۲۱- الفرقان	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۲۲- فکر و نظر	(سہ ماہی)	علی گڑھ
۲۳- الفقیہ	(ہفت روزہ)	امرتسر
۲۴- القاسم	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۲۵- قاسم العلوم	(ماہنامہ)	دیوبند
۲۶- المآثر	(سہ ماہی)	مئو
۲۷- محدث	(ماہنامہ)	بنارس
۲۸- المسلمون	(ماہنامہ)	جنیوا
۲۹- مجلۃ الجمع العلمی العربی	(سہ ماہی)	دمشق
۳۰- معارف	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۳۱- نیادور	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۳۲- النجم	(ماہنامہ)	لکھنؤ